PREM CHAND KE NAQEDEEN: EK MUTALEA
(A STUDY OF PREM CHAND'S CRITICS)

A Thesis Submitted to University of Hyderabad in Partial Fulfillment of the Requirement for the Award of

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU

By
NOOR ALAM KHAN
Enrolment No.13HUPH17
Under the supervision of
Dr. Mohd Kashif

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD

(P.O) Central University, Gachibowli
Hyderabad- Pin: 500046
Telangana, India

2018

CERTIFICATE

This is to certify that thesis entitled **"Prem Chand Ke Naqedeen: Ek Mutalea" (A Study of Prem Chand's Critics)** submitted by **Noor Alam Khan** bearing Registration. No. **13HUPH17** in partial fulfillment of the requirement for award of Doctor of Philosophy in the School of Humanities is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma.

Parts of this thesis have been:

A. Published in the following publications:
   - "Prem chand Shanas:Madan Gopal.".Published in International Online Journal for Urdu Monthly "Urdu Scholar ki Duniya" November (2017). ISSN 2320-5369 EISSN2320, Volume V.Issue 1V.
   - "Professors Yousuf Sarmast ki Prem Chand Shanasi." In Shadab India Monthly Journal Hyderabad. December, 2017, ISSN 2349-025X, Volume-5, Issue-12.

B. Presented in the following conferences:
   1. Presented a research a paper titled "Scientific Nazrye Tanqeed" in the 3 Day International Seminar on "Theoretical Criticism in Urdu: Background and Foreground. On "11th -13th February 2014.
   2. Presented a research paper titled "Ismat Chughtai Ke Noveloon mein Niswani kirdar".in a Two Day National Seminar on "Rajinder Singh Bedi and Ismat Chughtai; In perspective of Progressive Writers' Movement on 08th -9th February 2017.

Further, the student has passed the following courses towards fulfillment of coursework requirement for Ph.D / was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M.Phil Program and the M.Phil degree was awarded:

Course Code	Name	Credit	Pass/Fail
1. UR701	Research Methodology	4	Pass
2. UR702	Practical Criticism	4	Pass
3. UR721	Textual Criticism	4	Pass
4. UR780	Dissertation	12	Pass

Supervisor **Head OF Department** **Dean of School**

DECLARATION

I, **Noor Alam Khan**, hereby declare that this thesis entitled **"Prem Chand Ke Naqedeen: Ek Mutalea" (A Study of Prem Chand's Critics)** submitted by me under the supervision of **Dr. Mohd. Kashif** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Noor Alam Khan
Regd. No: 13HUPH17

پریم چند کے ناقدین: ایک مطالعہ

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار

نورعالم خان

E.No: 13HUPH17

نگراں

ڈاکٹر محمد کاشف

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-500046

2018

فہرست ابواب

☆ پیش لفظ: 03

باب اول: فکشن کی تنقید ما قبل پریم چند اور پریم چند کے عہد میں 07

باب دوم: تقسیم ہند سے قبل پریم چند پر لکھی گئی تنقید 90

باب سوم: پریم چند تنقید: تقسیم ہند تا 1980 157

باب چہارم: پریم چند تنقید: 1980 کے بعد 237

☆ اختتامیہ 322

☆ کتابیات 334

پیش لفظ

جس طرح پریم چند اپنے عہد کے صفِ اول کے فکشن نگار تسلیم کیے جاتے ہیں، اسی طرح ناقدین نے بھی ان کے فکشن اور غیر افسانوی ادب کے معنوی جہتوں کو تلاش کرنے میں کثرت سے توجہ دی۔ان میں بعض ناقدین ایسے بھی ہیں جو ان کے فکشن کے مجموعی اصناف پر اپنی ناقدانہ تحریر پیش کی۔او کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنا مطمحِ نظر ناول و افسانہ تک محدود رکھا۔فکشن سے قطع نظر پریم چند کے دیگر ادبی تحریریں بھی ناقدین کے نظروں سے اوجھل نہیں رہیں۔ بلکہ ان کے تمام تخلیقات پر ان کی عہد سے لے کر آج تک مسلسل لکھا جاتا رہا ہے۔ یہاں ضرورت اس بات کی تھی کی ناقدین کے تمام آرا کو یکجا کیا جائے اور پریم چند پر لکھی گئی تمام تنقیدی تحریر کا بنظر غائر مطالعہ کر کے اس کا نچوڑ پیش کیا جائے۔یہی وہ فکری محرکات تھے جس نے مجھے پریم چند کے ناقدین پر تحقیقی کام کے لیے مائل کیا۔حسن اتفاق اسی دوران مجھے پروفیسر صغیر افراہیم اور پروفیسر طارق چھتاری جیسے اساتذہ کی کچھ کتابیں پڑھنے اور ان سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا۔جس کی وجہ سے میرے ذہنی میلان کو مزید تقویت ملی۔لہذا میں نے اپنے ذوق کے مطابق ''پریم چند کے ناقدین ایک مطالعہ'' پی ایچ ڈی کے لیے منتخب کیا۔اس عنوان کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ میری دانست میں ابھی تک اس زاویہ سے پریم چند کے ناقدین کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔اور نہ ہی ان کے ناقدین پر خصوصی حوالے سے کوئی تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے۔ میں نے نہ صرف ان ناقدین کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کے مختلف نظریات اور زاویوں تک پہنچنے کی کوشش کی جن کے ذریعہ انہوں نے پریم چند کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے۔

لازوال تخلیق کار کی تخلیق وقت کی تحدید میں قید نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ہر وقت اور ہر عہد کی آواز ہوتی ہے۔ پریم چند کی بیشتر تخلیقات اسی نوعیت کی ہیں۔اسی لیے ان کے ناقدین میں بھی عہد بہ عہد اضافہ ہوتا رہا۔تقسیم ہند سے پہلے پریم چند پر دیا نرائن نگم اور دیگر قلم کاروں نے چند مضامین تحریر کیے۔قمر رئیس کے عہد

تک پہنچتے پہنچتے پریم چند شناسی میں کئی ایک نام ابھر کر سامنے آ گئے۔ آزادی کے بعد قمر رئیس اور دوسرے جیسے مانک ٹالا، مدن گوپال، جعفر رضا اور مسعود حسین خاں نے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق پر بھی زور دیا۔ اور پریم چند کے تعلق سے کئی تحقیقات کو پیش کیا۔ 1980 کے بعد سے پریم چند پر تنقیدی مضامین آج تک لکھے جا رہے ہیں لیکن ان میں تحقیقی عناصر یا تحقیق کی طرف توجہ کم دی جا رہی ہے۔ بہر کیف راقم الحروف نے اس مقالہ میں پریم چند کے عہد سے لیکر موجودہ عہد کے تمام اہم ناقدین پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ نیز انفرادی طور پر ہر ایک کے نظریات پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے نہ صرف پریم چند کے مخفی پوشیدہ معنوی انسلاکات منکشف ہوئے ہیں بلکہ ناقدین کی علمی لیاقت، تنقیدی صلاحیت اور قوت تفہیم بھی عیاں ہوتی ہے۔

میرا مقالہ چار ابواب میں منقسم ہے۔

پہلا باب ''اردو فکشن کی تنقید ما قبل پریم چند اور پریم چند کے عہد میں'' اس میں، میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کے ما قبل سے لیکر ان کے عہد تک فکشن کی تنقید کیسی لکھی جا رہی تھی۔ اس عہد کا تنقیدی رجحان کیسا تھا۔ ان لکھنے والوں میں اہم نام ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم اور خود پریم چند کا ہے۔ ان میں کچھ لوگوں فکشن تنقید کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے فکشن پر مضامین لکھے ہیں۔ اس باب میں فکشن سے متعلق ان کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے۔

دوسرا باب ''تقسیمِ ہند سے قبل پریم چند پر لکھی گئی تنقید'' میں نے اس باب میں یہ منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم ہند سے قبل پریم چند پر لکھنے والے نقاد کون کون ہیں۔ پریم چند پر لکھے گیے تنقیدی معیار کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان لکھنے والوں میں اوپندر ناتھ اشک، فراق گورکھپوری، سید علی جواد زیدی، مالک رام، عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق، جگر بریلوی، طالب بنارسی، دیا نرائن نگم، مسز پریم چند شیورانی دیوی، سلیم جعفر، ساغر نظامی، جگت موہن لال رواں، ایچ۔ ایل گاندھی اور منشی جگیشور ناتھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تیسرا باب ''پریم چند تنقید: تقسیم ہند تا 1980'' اس باب میں ان ناقدین کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں

نے پریم چند کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعے کے ساتھ تحقیق سے بھی سروکار رکھا ہے۔ ان میں چند نام یہ ہیں۔ ہنس راج رہبر، امرت رائے، قمر رئیس، جعفر رضا، مدن گوپال، مانک ٹالا، محمد حسن، شیورانی دیوی، مسعود حسین خاں اور سید احتشام حسین وغیرہ۔

باب چہارم ''پریم چند تنقید: 1980 کے بعد'' یہ مقالے کا آخری باب ہے۔ اس عہد میں پریم چند شناسوں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ یوسف سرمست، شکیل الرحمٰن، پروفیسر صغیر افراہیم، علی احمد فاطمی، گوپی چند نارنگ، شمیم نکہت، شمس الرحمٰن فاروقی، عظیم الشان صدیقی، اصغر علی انجینئر، پروفیسر عبدالسلام، اور سید محمد عصیم۔ ان سبھی کا مختصراً جائزہ اس باب میں لیا گیا ہے۔

سب سے پہلے میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے بارگاہ میں سجدہ شکر بجالاتا ہوں اور نظرانہ درود وسلام پیش کرتا ہو بارگاہ رسالت ﷺ مآب میں جن کے صدقے طفیل میں میرے میں وہ صلاحیت پیدا ہوسکی کہ میں اپنا مقالہ وقت پر داخل کر سکا۔

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مایہ ناز اساتذہ پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر صغیر افراہیم اور پروفیسر خورشید احمد کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ جن کے درس وتدریس نے تفہیم ادب کی راہیں ہموار کیں۔ اگر چہ میں بعد میں علیگڑہ کا طالب علم نہیں رہا اس کے باوجود بھی مقالے کی تکمیل میں ان کے زریں مشورے سے مستفید ہوتا رہا۔ مواد کی حصولیابی میں ان اساتذہ کی خصوصی عنائتیں میرے ساتھ رہیں۔

میرے مشیر تحقیق ڈاکٹر محمد کاشف صاحب، خصوصی سپاس گزاری کے مستحق ہیں۔ جن کی محبانہ، مشفقانہ اور مربیانہ اصلاحی مشورے ہر مشکل مقامات پر کام آتی رہیں۔ اگر میرے نگراں کارپوری دلجمعی اور خلوص کے ساتھ وقت نہ دیتے تو مقالے کا اپنے محدود وقت میں مکمل ہونا مشکل تھا۔ اس لیے میں ان کا تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں۔ اسی طرح صدر شعبہ پروفیسر حبیب نثار صاحب، ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ، ڈاکٹر اے، آر، منظر صاحب، ڈاکٹر نشاط احمد، اور ڈاکٹر رفیعہ سلیم صاحبہ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

سابق صدر شعبہ پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب اور ایم فل کی نگراں پروفیسر رضوانہ معین صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ بجالانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران علمی اور غیر علمی ہر مشکل

مرحلہ میں ان اساتذہ کی سایہ عاطفت مجھے میسر رہی۔

میں اس اعتراف کے ساتھ میں اپنے رفقائے کار کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس مقالے کی تکمیل میں ان کا بہت تعاون حاصل رہا۔ میں خصوصی طور پر ڈاکٹر محمد مجیب الدین، ڈاکٹر جاں نثار معین، محمد عبداللہ، صالح انصاری، عامل رحمانی اس کے علاوہ دیگران تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سے اس مقالے کے تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔

میں اپنے والدین کا بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے میری تعلیم وتربیت کا خیال رکھا اور مجھے اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ صد افسوس کہ آج میری والدہ میری تعلیم مکمل ہونے سے قبل ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ لیکن ان کی دعائیں آج بھی میرے ساتھ ہیں۔ اللہ ان کی قبر کو بقعہ نور بنادے، آمین۔ میں اپنی تمام علمی کاوشوں کو اپنی مالدہ ماجدہ سے منسوب کرتا ہوں۔

اس کے بعد بڑے بھائی نورلحسن، حافظ وقاری انوارالحسن، ڈاکٹر نجم الحسن، چھوٹے بھائی محمد منظور احمد (Dialysis,Technician) میری پیاری بہن افسانہ خاتون، میری بھابھی ناظمہ خاتون، اور بھابھی شمع خاتون کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ اس لیے میں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ سب ہمیشہ میری ترقی وتعلیم کے لیے کوشاں رہے۔ میرے والد ڈاکٹر محمد حسن P.M.P. اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر نجم الحسن (Pharmacist) کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں ان کی دعائیں اور ہمت افزائی نے میرے مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔

نورعالم خان

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد، تلنگانہ

فروری 2018

باب اول

فکشن کی تنقید: ماقبل پریم چند اور پریم چند کے عہد میں

فکشن کی تنقید: ماقبل پریم چند اور پریم چند کے عہد میں

فکشن کی تاریخ اور تنقید کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ فکشن کا مفہوم اور اس کے حدود کیا ہیں۔ فکشن ایک ایسی اصطلاح ہے جو اپنے اندر اظہار کے کئی سانچوں کو سمیٹے ہوئے ہے، فکشن سے بالعموم وہ نثری ادب پارہ مراد لیا جاتا ہے جس کے اندر کہانی کا عنصر پایا جاتا ہو اس طرح اس کے حدود میں داستان، ناول، طویل افسانہ اور مختصر افسانہ وغیرہ شامل ہیں۔ چنانچہ ارتضٰی کریم فکشن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''فکشن ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے، فکشن کے زمرے میں آئے گی۔ اسی لئے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں حکایات بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔ داستان، ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی، ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔ یہاں تک کہ منظوم داستانیں اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہّ پن کا عنصر ملتا ہے''۔ [1]

فکشن ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا اطلاق اشخاص کے نثری کہانیوں پر بھی ہوتا ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصےّ کہانیوں کا وہ تمام سرمایہ جو نثری صورت میں موجود ہے فکشن کہلاتا ہے۔ داستان اردو ادب کی ایک طویل صنف ہے جس میں قصہّ در قصہّ کی صورت میں واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ مافوق الفطرت عناصر تحیّر خیزی اور تجسّس داستان کی اہم ترین خصوصیات رہی ہیں۔ داستان میں موضوعات کے اعتبار سے بھی حسن وعشق، رزم و بزم اور تصوف کو جگہ دی جاتی رہی ہے۔ دکن نے اس کی صحیح خدوخال عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ ملاّ وجہی کی ''سب رس'' داستانوی ادب کا نقش اول تصور کی جاتی ہے:

''اس کتاب کا ناؤسب رس ہے سب کو پڑھنے آوے ہوس، بول بول کوں چڑھے اُمس ۔۔۔۔ کیا عورت کیا مرد جس میں کچھ عشق کا درد، اس کتاب کوں سینے پرتی ہلاسی نا، اس کتاب بغیر کوئی وقت اپنا بھلاسی نا جیتے چوساراں، جیتے فہم داراں، جیتے گن کاران ہوئے سن آج لگن کوئی جہاں میں، ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کریوں نئیں بولیاں'' ۔۔۔۔ یوں عجب نظم ہور نثر ہے سطر سطر پر برستا ہے نور'' ۲

ملّا وجہی قصہّ کے تمثیلی بیانیہ کو اسلوب کے ساتھ مربوط اور قصہّ میں زبان کی سلاست اور فصاحت کی گفتگو ہمہ جہتی طور پر کرتا ہے۔ جس سے داستانوی انداز کے ساتھ فکشن پر تنقیدی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں قصہّ کے فن یا کردار نگاری پر کوئی تنقید نہیں ملتی بلکہ صرف داستانی زبان پر اظہار خیال ضرور سامنے آجاتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے بھی اردو ادب کو ایک نیا داستانوی انداز دیا اور میر امن کی باغ و بہار نے داستانوں کی تخلیق کے ساتھ ان پر تنقید کا بھی وقیع وافر سرمایہ موجود ہے۔ باغ و بہار کا دیباچہ ملاحظہ ہو:

''جان گلکرسٹ ۔۔۔۔ لطف سے فرمایا کہ اس قصہّ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو، موافق حکم حضور میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے،،۔ ۳

باغ و بہار کے اس متن سے فکشن یا داستان کے سلسلے میں اہم تنقیدی اشارہ ضرور ملتا ہے۔ یوں تو داستانوی اور تنقیدی کتابوں میں ''میر علی تحسین خاں کی نوطرز مرصع'' شاہ عالم ثانی کی عجائب القصص، رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب، خطبات گارساں دتاسی مرتبہ عبدالحق، بوستان خیال مترجم خواجہ بدرالدین خاں دھلوی، صورت الخیال شاد عظیم آبادی وغیرہ فکشن کی تنقید سے منہ نہیں موڑتی اسی طرح داستان پر بہت

سارا مواد فکشن کی تنقید سے متعلق رسائل میں بھی موجود ہے مثلاً نیا دور جون ۱۹۷۸ میں ڈاکٹر سید حسن کا مضمون داستان امیر ہمزہ کا لسانیاتی پہلو، نثار احمد فاروقی کا نوطرز مرصع کا تہذیبی مطالعہ رسالہ آج کل 1965ء، طلسم ہوش ربا اور داستان کی تنقید ارتضٰی کریم وغیرہ۔

اردو کی دوسری مقبول صنف ناول نگاری ہے جس کی ابتدا مغربی ادب کے زیر اثر ہوئی۔ مغرب میں رچڑس، ڈی ایچ لارنس، جیمس جوائس، گورکی، ٹالسٹائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جھنوں نے ناول لکھنے کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت سے بھی دنیا کو روشناس کرایا اور فکشن کی تنقید پر آمادہ کیا۔ اردو میں کریم الدین کو پہلا ناول کا نقاد مانا جاتا ہے۔ کہانی کا ایک روپ ناول ہے جس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ جہاں افسانہ ایک لمحے ایک کیفیت کو بیان کرتا ہے وہی ناول پوری زندگی کی تفسیر حیات ہے۔ اسے داستان سے الگ ان معنوں میں کیا جاسکتا ہے کہ اس میں حقیقت نگاری اور بدکا روپ صحیح طور پر سامنے آتا ہے۔ جب کی داستان میں مافوق الفطرت عناصر اور کردار مثالی ہوتے ہیں۔

اردو میں مختصر افسانہ مغربی شارٹ اسٹوری کے توسط سے آیا۔ مغرب میں افسانے کی روایت کوئی ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہے جس میں ایڈگر ایلن پو، ٹالسٹائی، موپاساں، چیخوف، کیتھرین، منیفیلڈ جوائس اور کافکا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں نے اردو میں افسانہ لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اردو میں مغربی افسانوں کے تراجم کے علاوہ طبع زاد افسانے بھی لکھے جانے لگے اب یہ عموماً تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ اردو میں افسانہ کو متعارف کرانے کے سلسلے میں سجاد حیدر یلدرم کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ اور ان کے سر اردو افسانے کو بحیثیت صنف مستحکم کرانے کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ افسانے کی ابتدا کے ساتھ ہی اس پر تنقید کے نمونے بھی سامنے آنے لگے لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ہمارا مختصر افسانہ چونکہ مغربی فن کے مرہون منت ہے لہذا وہ اسی روایت کا قائم مقام بنا اور اسی دور میں اس فن کے جو اصول مقرر ہوئے وہ اسی زمانے کی تخلیق کردہ افسانوں کی روشنی میں متعین ہوئے۔ فکشن نگار کی حیثیت سے تو پریم چند سے سبھی واقف ہیں لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس فن پر تنقید کی ابتدا بھی پریم چند کے ذریعہ ہی ہوئی ''زمانہ'' کانپور میں اس قسم کے مضامین ملتے ہیں جو فرضی نام سے شائع

ہوا کرتے تھے۔

اب ہم اردو فکشن کی تنقید کا باقاعدہ طور پر مولوی کریم الدین کی شخصیت سے روشناس کراتے ہیں جو ادب کا ہر طالب علم ان کے تذکرہ ''طبقات الشعراء ہند'' سے واقف ہیں۔لیکن ان کی شہرت جدید کا باعث ''خط تقدیر'' ہوئی ۔جب اسے اردو کے مشہور عالم و محقق پروفیسر محمود الہی اردو کا پہلا ناول کہہ کر روشناس کرایا۔خط تقدیر کو ہم ایک تمثیل کے طور پر جانتے ہیں لیکن اگر اس کے دیپاچہ کو بنظر غائر پڑھا جائے تو ہمیں انکے تنقیدی افکار کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے کہ فکشن کی تنقید کے وہ پہلے بنیاد گزار ہیں میری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ کریم الدین کے اس دیباچے سے قبل فکشن کی تنقید پر اس قدر جامع اور پختہ شعور کسی دوسرے ادبا کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔

''خط تقدیر'' کے دیباچہ میں کریم الدین نے کہانی پن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے عہد میں اپنی نوعیت کے بڑے اہم تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔مولوی کریم الدین بے جا روایتی حکایتوں اور قصہّ گوئی کو اچھا خیال نہیں کرتے شاید کسی کہانی کار کے یہاں پہلی بار یہ خواہش بلند ہوتی نظر آتی ہے۔کہ کہانی ایسا سبق آموز ہو کہ جو شخص اس کی قرأت کرے یا سنے تو اسکو خیال ہو کہ کہانی یا قصّہ میرے حسب حال لکھا گیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''جو باتیں اس (قصّہ) میں درج ہو، وے اخلاق و اطوار و تجربات انسان اسی طرح کے ہوں جن (واقعہ) کا اثر طبع انسان پر ہو کے بہت نتیجہ پیدا کریں اور کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے، اس کو خیال ہو کہ یہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے..... اور مضامین حقیقہ لکھنے کی ترغیب ہو۔مگر ایشائی قصّوں کی روش اور طور کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔''[۹]

کریم الدین کی یہ خواہش تھی کہ قصّہ کی بنیاد انسانی مشاہدات و تجربات پر رکھی جائے اور حقیقی زندگی کی پیش کش کے ذریعہ بھی قصہ کو دلچسپ بنائیں جب ہی ان کا اثر طبع انسان پر ہوگا اور فرد کے متاثر ہونے

کے بعد ہی وہ قصہ قابل قبول ہوگا نیز عوام کی چلتی پھرتی زندگی اور سماج کو جو شاہی سماج سے بالکل الگ ہے اس کے دکھ درد کو اس کی آپ بیتی کو قصہ کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ جو عوام میں مقبول بھی ہوگا کہ اس میں سامعین کو ایسا محسوس ہوگا کہ کہانی اس کے حسب عادت کے حسب حال سے موزوں ہے اس سے قبل اتنی وضاحت اور استدلال کے ساتھ اردو قصہ نگاری پر اس نوع کی تنقید کسی نے نہ کی تھی۔ ایسا قصہ تخلیق کرنا جس میں ہر انسان کو اپنی کہانی سنائی دے۔ البتہ اگر دیکھا جائے تو مولوی کریم الدین کے ادبی وتنقیدی لحاظ سے یہ خیالات فکر انگیز تغیر آفرین اور انقلابی مہم دوررس تو نظر آتے ہیں اور اس میں تازگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

''خط تقدیر'' کے دیباچہ میں تو مصنف نے قصّہ و حکایت کے فن پر جو کچھ قلمبند کیا۔ اسے گھسے پٹے قصہ نگاری کی پہلی شدید مخالفت اور نئے طرز تحریر کے کہانی کو رواج بخشا۔ بلکہ پہلی شعوری کوشش سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔

البتہ یہ بات بدیہی طور پر اظہر من الشمش ہے کہ ''خطِ تقدیر'' کا دیباچے کی روشنی میں مصنف نے اردو میں افسانوی ادب کا مکمل نقاد بن کر اردو فکشن کی تنقید کی ابتدا کی اور جنھوں نے داستان اور قصہ گوئی کی پرانی روش سے ہٹ کر ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی اور انھوں نے اردو ادب میں پہلی بار ادب برائے زندگی کا پہلا صحیح قدم اٹھایا۔ بعد ازیں قصہ خوانی کی اہمیت اور افادیت پر ضوافروز چراغ جلایا۔ اس کے تحت انسان کو مسرت اور انبساط کے ساتھ قدم بقدم بصیرت اور بصارت بھی بخشی ''خطِ تقدیر'' کے مصنف سے پہلے اردو کے کسی ادیب یا فن کار یا دانشور نے افسانوی ادب کے تعلق سے اتنے واضح خیالات پیش نہیں کیے تھے۔ بعد میں نذیر احمد، سرشار اور مرزا ہادی رسوا کے دیباچوں اور تقریظوں میں اس طرح کے خیالات خوب نظر آتے ہیں۔ اردو فکشن کی تنقیدی تاریخ میں ''خطِ تقدیر'' کے خالق کی تحریر نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

اردو فکشن کی تنقید کے آغاز کے بارے میں جو بھی خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ اتنے کارآمد ہیں کہ مولوی کریم الدین کو اردو کا پہلا فکشن نگار کہا جانے لگا اور ناقدین بھی فکشن کی تنقید کا سہرا انھیں کے سر باندھتے ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ کریم الدین اردو کے پہلے فکشن کے تنقید نگار ہیں۔ وہ خود ہی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ اقتباس:

''کریم الدین کی ''خطِ تقدیر'' 1862ء نذیر احمد کی ''مراۃ العروس''
1869 سے سات سال قبل شائع ہو چکی تھی اور 1865 تک کہ اس
کے کم سے کم تین ایڈیشن نکلے جس سے اس کے حسن قبول کا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔ ''مراۃ العروس'' کے دیباچے میں نذیر احمد کے ان جملوں کو
پڑھ کر کہ بالکل نئے طرز کی کتاب ہے یا اس طرز میں پہلی تصنیف ہے،
یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''خط تقدیر'' پر ان کی نظر گذری تھی
لیکن اس سے یہ حقیقت متاثر نہیں ہوتی کہ ''مراۃ العروس'' سے کئی
سال قبل ''خطِ تقدیر'' کو قبول عام مل چکا تھا۔'' ۵؎

یہ سچ ہے کہ ''خطِ تقدیر'' 1862ء میں شائع ہوئی جس کی بنا پر تاریخی اعتبار سے ''خطِ تقدیر'' کو فکشن کی تنقید میں اولیت حاصل ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے خطِ تقدیر کی یہ خصوصیت بھی بتائی ہے کہ اس میں مختلف طبقوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے:

''انھوں نے (مولوی کریم الدین) نہ صرف یہ کہ اردو میں پہلی بار ناول
لکھا بلکہ اسے سماج کے مختلف طبقوں کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی۔'' ۶؎

یوں تو اردو کے افسانوی ادب کو سب سے پہلے حافظ ڈپٹی نذیر احمد نے طوطا مینا کی کہانیوں، حیرت انگیز جادوئی وطلسمات اور مافوق الفطرت عناصر بوالعجبیوں سے نجات دلا کر حقیقی دنیا سے روشناس کرایا اور ایسے بے مثال قصّے لکھے جو نہ صرف اپنے عہد کے تیکھے مزاج اور ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ پہلی مرتبہ ان حکایتوں اور قصوں میں سچ مچ دنیا کے مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ نذیر احمد ایک مخصوص معاشرتی فضا کے نمائندہ تھے۔ ان کا عہد اصلاحی اور اخلاقی روایت پرستی کا عہد تھا۔ خود ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بنا پر انھوں نے جو قصّے تحریر کئے وہ اس میں اصلاحی مقصد کی کارفرمائی ضرور دکھائی دیتی ہے۔

سر سید اور نذیر احمد نے ایک ساتھ قوم کی خدمت اور اس کی ترقی کی ایک منظّم تحریک شروع کی تھی۔ اور نذیر احمد کا نظریہ تھا کہ معاشرتی اصلاح تعلیم نسواں کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے انھوں نے قصوں کا سہارا لیا

اوراس وقت جو بھی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں ان کا مقصد درس و اخلاق تھا ان کی فنکاری پر ان کی اصلاح پسندی بدرجہ اتم غالب ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا عہد وہ ہے جو سر سید اور انگریزی نشاۃ الثانیہ کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی قوم کے تنزل کی طرف متوجہ کیا۔ اوران حضرات نے قوم کی تنزلی اور زبوں حالی سے فکرمند ہوکر کھوئے ہوئے وقار کی بحالی اور اس دور کی صورت حال کی بہتری کے لیے مختلف طرح کے اصلاحی تدابیر اختیار کیے۔ بالخصوص ڈپٹی نذیر احمد نے بھی مسلمانون کی خستہ حال معاشرہ کی اصلاح کے لیے اس زمانے کے سب سے دلچسپ مشغلے، قصے کو اپنا ذریعہ بنایا۔ اور ایسے میں نذیر احمد نے اپنے قصّوں کا آغاز کیا جو عوام کے لیے زیادہ تر قابلِ قبول اور پسندیدہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اس سلسلہ دراز میں ان کی پہلی تصنیف مراۃ العروس ہے جو 1869ء میں نمودار ہوئی اور اس کے دیباچے میں نذیر احمد نے البتہ قصّے کے فن سے متعلق باہمی گفتگو نہیں کی ہے بلکہ قصّہ لکھنے کی ضرورت اور اس کی نوعیت پر خیالات کا اظہار ضرور کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق اور نصائح سے بھری ہوئی ہو۔ اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورت اپنے توہمات اور جہالت اور کج روی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب اور کسی دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبعیت نہ گھبرائے، مگر تمام کتب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا تو میں نے اس قصّے کا منصوبہ بنایا۔'' [۷]

نذیر احمد کا نظریہ یہ تھا کہ معاشرتی اصلاح بالخصوص تعلیم نسواں کے بغیر ممکن نہیں۔ جب تک قومی معیشت میں انقلاب کا خواب تعبیر نہیں ہوسکتا عورت کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ یہی جذبہ تھا جسے نذیر احمد کے قلم نے اصلاحی قصّے لکھے گویا مطلوبہ کتاب نہ ملنے پر نذیر احمد نے عورتوں کی اصلاح کے لیے قصّے کا انتخاب کیا۔ اور اس کے لیے دلچسپ پیرائے کی قید کے ساتھ قصّے کی دو خوبیاں طے کی جوان کے مترادف ہیں۔ پہلا یہ کہ

اس سے دل نہ اکتائے، اور دوسرا طبعیت نہ گھبرائے، نذیر احمد کے نذدیک قصّہ واقعات کی وہ کڑی ہے جس کا طرز دلچسپ ہو اور قاری کا تجسّس حالات جاننے کے لیے بیدار رہے۔ کہانی ساخت کے اعتبار سے اتنی طویل نہ ہو اور کوئی قصّہ مرکزی خیال سے غیر متعلق نہ ہو کہ پڑھنے والے کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹنے لگے۔ بعدِ ازیں قصّہ میں واقعات کا بیان ہونا چاہئے یا ایسی گنجائش ہو جس سے بیان کیے ہوئے واقعات کے نتائج اخذ کیے جائیں۔ اور مذہبی علم اور اخلاق کی درستگی کا سبب قرار دیا جائے مندرجہ بالا اقتباس سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے گھریلوں ماحول اور اس کے ارد گرد کے ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے قصّہ کا حاصل کلام یہ بتاتے ہیں:

> ''گھر میں رات دن پڑھنے کا چرچہ تو رہتا ہی تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ میرے مذہبی خیالات بچوں کی حالات کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں ان سے ان کا دل افسردہ، ان کی طبیعتیں منغض اور ان کے ذہن میں کندی ہوتے ہیں تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی اخلاق ونصائح سے بھری ہوئی ہو۔'' ۸ے

مولوی نذیر احمد نے کوئی اسکول نہیں کھولا تھا لیکن انہیں یہ احساس تھا کہ مسلم معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول ذریعہ نہیں ہے جس کی وجہ سے مسلم گھرانے کا معاشرہ شرفا کے گھرانے پر ہوتے ہوئے بھی پست اور توہم پرستی سے بھرپور تھا گھر کے چہار دیواری میں پردے کی بندش میں قید سے بے بہرہ خواتین قوم کے لیے ایک لعنت تھیں الغرض یہ کہ مولوی نذیر احمد نے روکھا پھیکا مضامین سخت زبان کو شگفتہ انداز بیان اور اس دور کی بول چال سے بدل کر قدر و قیمت عطا کی۔ اور دل چسپ بنایا وہ طبیعتوں پر قابض اور ذہنوں کو کندھل کرنے کے بجائے انہیں مسرت کے ساتھ بصیرت عطا کی اور مذہبی خیالات جو پہلے طالب علم کے مناسب حال نہ تھے۔ قصہ کو قصہ کی شکل دینے کے بعد ''حسب حال'' ہو گئے۔ اور نذیر احمد کے نزدیک قصے کا

منصب بھی یہی تھا۔توبتہ النصوح کے دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں:

''مضمون جس کو میں نے فرضی قصّہ اور بات چیت کے طرز پر لکھا ہے۔ مذہبی پیرائے سے تو خالی نہیں اور خالی ہونا ممکن نہ تھا۔لیکن کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی اور نفرت کا باعث ہو۔'' ۹

جس قدیم زمانے میں بعض مشکل علوم وفنون مثلاً تاریخ وطب، صرف ونحو، علم الہیات وغیرہ کو مکتبی ضرورت کے تحت موزوں، سہل اور قابلِ یاداشت بنانے کے لیے ان تمام چیزوں کو نظم کی شکل میں پہنا دیا جاتا تھا، اوراسی راستے کی پیروی کرتے ہوئے نذیر احمد نے بھی اخلاق و مذہب کی تعلیم اور بسا اوقات سیاسی نظریہ کو آسان ودلچسپ اوراثر انگیز بنانے کے لیے قصّہ کے ہئیت کا استعمال کیا ہے۔قصوں اور دیباچوں سے بدیہی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی نذیر احمد کا اولین مقصد معاشرہ کی اصلاح کے خاطر کچھ مذہبی اہم مسائل کی تعلیم و تفہیم کی تعبیر ہوتی تھی اس لیے انھوں نے قصہ کی ہئیت کو بدرجہ اتم استعمال کیا ہے۔ بنات النعش کا اقتباس دیکھئے:

''یہ کتاب اسی مراۃ العروس کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے وہی طرز ہے۔مراۃ العروس سے تعلیم اخلاق وخانہ داری مقصود تھی، اس سے وہ بھی ہے مگر ضمناً اور معلومات علمی خاصتہً ۔تعلیم دینداری کا ایک مضمون اور رہ گیا ہے۔اگر حیات مستعار باقی ہے اور پیٹ کے دھندے یعنی مشاغل خدمت سے اتنی تھوڑی فرصت ملتی رہی.... تو انشاء اللہ بشرط خیریت اگلے سال تک وہ بھی کتاب کے پیرایہ میں پیش ناظرین کیا جائیگا۔'' ۱۰

وہ قصّہ یا کہانی جس کی بشارت جملے کے آخر میں دی گئی ہے وہ توبتہ النصوح ہے اور صحیح معنوں میں توبتہ النصوح کا گہرا مطالعہ ہی منشائے مصنف اور قصہ کے رشتے کی نوعیت کو زیادہ واضح کرسکتا ہے تاہم یہ دیکھ

لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ مراۃ العروس اور بنات النعش میں اکبری اور اصغری کی کہانی کس طرح مصنف کے بلند بانگ اصلاحی لہجے کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فنی طور پر اس کی لاتشکیل یا تردید کی صورتِ حال بھی سامنے لاتا ہے۔نذیر احمد کی تیسری دلچسپ تصنیف توبتہ النصوح کے دیباچے میں قصہ کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا مذکور ہے جو ترتیبِ اولاد کے نام سے منسوب ہے اس کتاب کے تصنیف کرنے کا مقصد اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقف ہو رہی ہے۔اس کی اصلاح ہو، اور ان کے ذہن نشیں کر دیا جائے کہ تربیتِ اولاد صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا۔۔۔ بلکہ ان کے اخلاق کی تہذیب، ان کے مزاج کی اصلاح، ان کے عادات کی درستی، ان کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے۔'' [11]

اس دیباچے میں نذیر احمد نے تہذیب اور اخلاق کے پیچھے مذہب کے رول پر بھی اصرار کیا ہے اور دوسرے مذاہب کی اعلیٰ قدروں اور مطلق اقدار کی ہمہ گیری کو بھی تسلیم کیا ہے اور اسطرح قصہ اور توبتہ النصوح میں نصوح کی مذہبیت اور دوسرے مذاہب سے منسلک رہنے والے کرداروں کی جواز فراہم کر دیا ہے۔مزید برآں اولاد کی تربیت کے لیے والدین کے احتساب کے معاملے کو جس کی وضاحت دیباچہ میں ہی کر دی گئی ہے اس کے عملی مصداق کے طور پر محتسبانہ رویہ ہمیں قصہ کے متن میں بہت زیادہ غیر متوقع اور خارجی طور پر مسلط کیے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔گویا اس کتاب کا دیباچہ پورے قصہ کے متن میں اختیار کئے جانے والے فکری اور موضوعاتی رویے کی تصدیق کرتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد قصے کی زبان و بیان کو توضیحی اور منطقی نثر سے زیادہ قابلِ فہم اور پر تاثر سمجھتے ہیں۔منطقی نثر کا تعلق انسانی دماغ سے ہے۔البتہ توضیحی نثر کا تعلق دماغ کے ساتھ پورے اعضائے رائیسہ کو متاثر کرتا ہے۔ان کے نظریہ کے متعلق دشوار کن اور غیر دلچسپ مضامین قصے

کی ہئیت میں بیٹھانے کے بعد اس سے موثر ہونے پر انحصاری اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نذیر احمد توبتہ النصوح کے سلسلے میں اس کے دیباچے میں یوں بیان کرتے ہیں۔ اقتباس:

> ''اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہ ہو۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرا دے گی کہ تربیتِ اولاد ایک فرض موقف ہے۔ یعنی لڑکے جب تک کم سن ہیں تربیت پذیر ہیں۔ اور بڑے ہوئے پیچھے ان کی اصلاح مشکل یا معتذر بلکہ محال۔'' ۱۲

نذیر احمد کا نظریہ قصہ ہئیت یا فارم کی حد تک نظریہ ناول کے عین مطابق ہے ان کے یہاں قصہ یا کہانی کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً پلاٹ، کردار، واقعات، مکالمہ، شدت تاثر اور نقطہ نظر جو اس کے لوازمات ہیں اسے وہ خوب برتتے بھی ہیں۔ لیکن درس اخلاق کے ضروری صفت کے اصرار کے بنا پر یہ ناول کے بجائے تمثیل کی تعریف پر زیادہ صادق آتا ہے۔ ان کے یہاں قصہ ناول کے بجائے مذہبی تمثیل سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو دانستہ طور پر تمثیل ہی لکھ رہے تھے اور نہ شعوری طور پر ناول ہی لکھ رہے تھے۔ یہ تو صرف اپنی بات کو دلچسپ اور دلنشیں پیرائے میں بیان کر دینا چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے فرضی قصّے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمیں یہاں اس بحث میں نہیں جانا ہے کہ نذیر احمد کے فرضی قصہ ناول کی صنف سے زیادہ قریب ہیں یا نہیں یا تمثیل کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں حالانکہ ان کے بیانات سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ انھوں نے قصہ کو ایک فارم یا ہئیت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ غالباً اس وقت تک ان کی نظروں سے کوئی ایسی کتاب نہیں گذری جس پر ناول کا فن صادق آتا ہو جس کی وہ پیروی کرتے۔ وہ ہئیت مواد اور تکنیک کی ہم آہنگی سے باضابطہ ناول کی تخلیق کرتے، البتہ وہ مشرقی داستان و حکایت کے علاوہ مغرب میں لکھی ہوئی بعض تمثیلوں سے ضرور واقف تھے۔ ان اصناف سے انھوں نے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا جو ان کے قصوں کی تعمیر میں مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ ان کے قصوں میں داستان کی سی طرز بیان کی خوبی ایلگری کرداروں جیسے اسم با مسمیٰ کردار اور حکایت کی طرح سبب کا لازمی نتیجہ نمایاں طور پر دیکھا

جا سکتا ہے۔

یقیناً نذیر احمد کا نظریہ قصہ کہانی یا افسانہ اوراس کا عملی اظہار اس حد تک پختہ نہیں تھا کہ ان میں ناول کی تمام خوبیاں تلاش کیا جائے جو ایک ناول کی تمام خوبیاں ہوتی ہیں۔ ہاں یہ کام انھوں نے ضرور کیا کہ روایتی قصوں اور مافوق الفطرت سے انحراف کیا جو داستان سے ناول کی طرف پہلا کامیاب موڑ ہے۔ ناول کی ہئیت کی لچک اسلوب کا تنوع اور تخیل کی رنگا رنگی اور موضوعات کی آزادی کی بنا پر ناول کے فارم کا ثبوتی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ وہ ناول کے اصطلاح جاننے کے باوجود نذیر احمد نے اپنے کسی تصنیف کو ناول کہہ کر نہیں پکارا ہے۔ بلکہ وہ خود ناول کو لغو سمجھتے تھے۔ اس سے وہ گانے بجانے اور سوانگ بھرنے جیسے سائنسی تکنیکی فن کو وہ قدرے زیرِ غور پر رکھتے تھے۔ ''رویائے صادقہ'' میں ایک جگہ انھوں نے علی گڈھ کے پس منظر میں عورتوں کی آزادی سے متعلق نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں۔ اقتباس:

> ''شور و شغف تو بہت کچھ سنتے ہیں مگر یورپ اور امریکہ میں بھی عورتیں نے آزادی پا کر اس سے زیادہ کون سا کمال حاصل کر لیا ہے کہ میڈم الگ گاتی خوب ہیں میڈم ڈھمک پیانو کے بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، میڈم فلاں تھیٹر میں ایسا سوانگ بھرتی ہیں کہ نقل کو اصل کر دکھاتی ہے یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دستگاہ ہوئیں تو ناول یعنی قصہ کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں اور قصہ کہانیاں بھی گندے ناپاک۔'' ۱۳؎

ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی تحریروں میں اگر چہ ناول کے اثرات ضرور ہیں لیکن انھوں نے کلی طور پر صرف قصہ اور کہانی سے ہی سروکار رکھا۔ اور صرف چھوٹے چھوٹے اخلاقی قصے اور کہانیوں تک ہی اپنے کو محدود رکھا۔ اور عشق کے عناصر کو مخربِ اخلاق سمجھ کر ان کو بالائے طاق رکھا۔ حالانکہ یہ ان کی اپنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے قصوں میں صرف اخلاقی اور اصلاحی کرداروں کو ہی جگہ دیتے ہیں یہ اپنے اصلاحی قصوں اور حکایتوں کے ذریعے اخلاق و کردار کو ہی اصلاح کی کنجی سمجھ کر اس کو فروغ دے رہے تھے۔ اور یہ وقت کی ضرورت بھی تھی کہ ایسے قصے لکھے جائیں جس سے اصلاحی پہلو روشن ہو اور وہ ادب لوگوں

کو اپنی طرف متوجہ کرے۔

نذیر احمد کے تعلق سے کچھ ایسی باتیں بھی راہ پا گئی ہیں جن کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ نذیر احمد نہ صرف ناول کے فن سے واقف تھے بلکہ وہ ناول لکھ بھی رہے تھے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے جو قصے تحریر کئے اور جو کردار شامل کئے ان کرداروں اور پلاٹ کے ذریعے ان کے قصوں میں ناول کے اجزائے ترکیبی نظر آتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے کہ جہاں ناول کے اجزائے ترکیبی نظر آئیں وہ ناول ہی ہو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قصے کہانیوں میں تو کردار کا ہونا ناگزیر ہے اور یہ نذیر احمد کا کمال ہے کہ جو قصے انھوں نے تحریر کیے اس پر ناول کا گمان ہوتا ہے اور وہ ناول کے زمرے میں بھی آتے ہیں ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ناول لکھے لیکن ان میں بہت سی کمیاں رہ گئیں ہیں۔

نذیر احمد نے اس وقت جو بھی قصے لکھے ان کے نظریہ قصہ اور علمی اظہار کے تعلق سے ان میں پختگی نظر نہیں آتی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں خیالی کردار یا خیالی قصے جیسے داستان وغیرہ سے انحراف ضرور نظر آتا ہے اس سے ان کے داستان سے ناول کی طرف راغب ہونے کا ایک رجحان ملتا ہے۔ لیکن آگے ڈاکٹر عباد نذیر احمد کے تعلق سے کہتے ہیں کہ نذیر احمد نے ناول کی اصطلاح معلوم ومقبول ہونے کے باوجود بھی ناول سے گریز کیا ہے۔ اور اپنی بنی بنائی روایت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اگر ناول کے تعلق سے بات کی جائے تو نذیر احمد ناول کو قصہ کہانی ہی سمجھتے تھے اور مواد کے اعتبار وہ ناول کو بھی اپنے قصوں کے برعکس گردانتے تھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اس وقت تک ہمارے افسانوی ادب کی مختلف اصناف کا بنیادی فرق واضح نہیں ہوا تھا اور یہ سب افسانے یا قصے کی ذیل میں آتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد قصے کو ایک ہیئت یا ایسا سانچہ سمجھتے تھے جن میں مختلف قسم کے واقعات مرتب کئے جانے کی کہیں نہ کہیں گنجائش ضرور تھی۔ حالانکہ ناول کے فن سے واقفیت کے ساتھ ڈپٹی نذیر احمد ایسی تحریروں کے عادی تھے جس کو پڑھنے کے بعد قاری کا دل نہ اکتائے اور تجسّس برقرار رہے۔

نذیر احمد جو قصے لکھ رہے تھے اس میں مسلمانوں کو پستی اور زبوں حالی کی ذلت سے بالاتر کرنے کے لیے اور اخلاقی عادات کو سنوارنے کیلئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان قصوں کے ذریعہ مسلمانوں کا اپنا کھویا ہوا

وقار واپس لانے کی اشارے اور کنائے سے بات کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے قصوں کو پر لطف بنانے کے لئے بہترین کردار اور پلاٹ کا استعمال کرتے ہیں جن کے ذریعے قصے میں جھول اور لچک پیدا نہ ہونے پائے اور کرداروں کی کڑی زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ زبان کے ساتھ زماں و مکاں کا بھی نذیر احمد مکمل خیال رکھتے ہیں۔ تا کہ قصے کو سمجھنے کے لیے لوگوں کو بہت دور کی کوڑی لانی پڑے۔

نذیر احمد نہ تو محض وقت گزاری کے لئے داستان کے مافوق الفطرت عناصر کے قائل تھے نہ اخلاق کو بگاڑنے والے ناول کے گندے اور ناپاک قصے کہانیوں کو وہ پسند کرتے تھے جس سے معاشرے میں بگاڑ اور خرابی پیدا ہو۔ ان کے نزدیک قصے کے لئے ایسے واقعات کا انتخاب ضروری ہے جس میں معاشرے کی تہذیبی ثقافت، خیالات کی پاکیزگی، مذہب، کردار اور اخلاق کو بہتر بنانے کے عناصر موجود ہوں۔

''توبتہ النصوح'' کے دیباچے میں ایک مستشرق عالم ڈائریکٹر تعلیم میتھو کیپسن کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نذیر احمد ناول نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ایک خاص طرز میں قصے ہی تحریر کر رہے تھے اس کے تعلق سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں اس کتاب کو مصنف کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں اس میں طرز عبارت اور بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے گو بعض اشخاص نصوح کی نصیحت کے منشا اور باب ہشتم کی طویل گفتگو کی نسبت جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اعتراض کریں لیکن خیال کرنا چاہئے کہ یہ طریقہ اس ملک کے مصنفوں کا ہے کسی وجہ سے دلیل قوت و زور کی کمی نہیں۔ کہیں کہیں میری دانست میں ایسا مضمون ہے جو اہل یورپ کی نظر میں ضعیف معلوم ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن یہ ایک ایسی مخصوص عادت ہندوستانیوں کی ہے کہ ان ہی چند مقالات سے جو اس کتاب میں ہیں اصل حقیقت اس بات کی ظاہر ہوتی ہے''۔[۱۴]

مراۃالعروس جونذیراحمد کی پہلی کاوش بھی ہے اس پربھی ایم کیپسن نے تقریظ لکھی تھی جس سے مراۃالعرس کی اہمیت دوبالاہوجاتی ہے اس کتاب میں مصنف کی روایتی مدح اور حوصلہ افزائی کے بجائے ایسی عالمانہ بصیرت افروز بات کہی گئی ہے جس سے نذیراحمد کے مختلف قصوّں کے علاوہ افسانے کی تنقید پر بھی روشنی پڑتی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب تک اس قسم کی کوئی کتاب نہیں ہوئی اور عبارت اور طرز بیان کی نظر سے زبان اردو کا ایک اچھانمونہ ہے۔کتاب مذکورہ اس باب میں مرزانوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے اور فی الوقت الف لیلیٰ اور بدرالدین خاں دہلوی کی بوستان خیال اردو کے ہم پلہ ہے:''

''نذیراحمد کی یہ تصنیف روزمرہ پڑھنے کے لائق اور عام فہم ہےاوراس کا مطلب صاف اور عمل کرنے کے قابل ہے۔اس میں مضامین عاشقانہ اور نازک خیالات جن کواس ملک کے مصنف اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں،نہیں ہیں''

''عورتوں کی زبان اوران کی رغبت اورنفرت اور بچوں کا لاڈ پیار اور امور خانہ داری میں عورتوں کا اختیاراوران کی جہالت اورمکروفریب یہ سب اس کتاب سے خوب عیاں ہوتے ہیں اور بیان سے کوئی علامت مبالغے کی نہیں پائی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ مصنف نے اصل حقیقت بیان کی ہےاور قصے کی نصیحت نفس قصہ سے نکلتی ہے'':۔

''جن اشخاص کا مذکوراس قصہّ میں ہے وہ پڑھنے والے کوایسے نظر آتے ہیں کہ گویاان کی نقل ہورہی ہو''[۱۵]

صاحبِ تقریظ نے پہلے اقتباس میں عبارت اور طرز بیان کے لحاظ سے اردو کا بہترین نمونہ

مراۃ العرس کو الف لیلیٰ اور بدرالدین خان دھلوی کی بوستان خیال کے ساتھ ساتھ خطوط غالب کے بھی مماثل قرار دیا ہے۔مندرجہ بالا کتابوں کا موازنہ کرنے سے کیپسن کا مقصود افسانے کی دو صفات کا اظہار ہے ایک خطوط غالب کی سی سادہ اور با محاورہ زبان کا استعمال اور دوسری داستانی طرز جیسا تجسّس انگیز اور دلچسپ بیان۔

اقتباس ثانی میں نازک خیالات اور مضامین عاشقانہ سے قصےّ کو پاک بتایا ہے۔یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عشق کے ذکر کو ناپسند بھی کرتے تھے۔لیکن یہ بھی نہیں کہ نذیر احمد حسن کی دلفریبوں اور عشق کی گرمیوں سے بے بہرہ تھے۔لیکن وہ قدرے بے نیاز ضرور تھے۔حسن وصورت کو ایک عارضی اور ثانوی حیثیت دیتے تھے۔نصیحت اور تبلیغ عیاں نہیں ہے بلکہ قصے میں پوشیدہ ہے اس کے علاوہ یہ خوبی بھی بیان کی گئی ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر واضح ہے۔زبان وبیان کے لحاظ سے عام فہم اور مواد کے اعتبار سے قابل عمل بھی ہے۔

تیسرے اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہم جس معاشرے اور سماج کی حقیقت بیان کریں اس کی ہو بہو تصویر پیش کردیں۔جس کے ذریعے سماج ومعاشرت کی عکاسی ہو جائے اور سماج کی اصلاح کے لئے کارگر بھی ہو۔چوتھے اقتباس سے ظاہر ہے کہ کہانی کے کردار کو طبقے اور معاشرے کا نمائندہ ہونا چاہئے۔اور اس کے اطراف واکناف پر روشنی پڑنی چاہئے۔جس کے رہن سہن بول چال اور خدوخال اس طرح ابھارے جائیں جس سے چلتا پھرتا، جیتا جاگتا انسان اقوال وافعال ہو بہو اس کی نقل معلوم ہوں۔

مندرجہ بالا تقریظ میں مسٹر ایم کیپسن نے معاشرے کی پیش کش زبان وبیان اور کردار نگاری کے تعلق سے جس نقطے پر بحث کی ہے وہ ناول کی تنقید پر مکمل اور عمدہ نظریۂ خیال ہے جس میں ناول کے بیشتر اجزائے ترکیبی کو فنی نزاکت کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔اور ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں کا بہترین جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

فنکارانہ طور پر پلاٹ کی تنظیم وترتیب کا واضح شعور بھی ان کے یہاں نمایاں ہیں۔''توبتہ النصوح'' کے حوالے سے قصے میں پلاٹ سازی کی عکاسی،مکالمہ نگاری اور زبان وبیان کے تعلق سے بڑی بے باک

گفتگو کی ہے۔جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ افسانہ کی تنقید اور تجزیہ مشرقی نقادوں کی روایتی تعریف سے کہیں زیادہ بہتر اور بلند تھی۔اور پرانی ڈگر سے ہٹ کر نئے نئے اصول وضابطے ہمارے سامنے آرہے تھے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''چند اشخاص کا ذکر ایک مرتبہ کیا گیا ہے مگران پر نظر نہیں رکھی گئی ہے۔ مکالمے میں اور نصائح میں بہت طول ہے اور کہیں کہیں بے محل بھی ہے، مگر ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی ہے کہ کتاب کا مقصد اور زبان دونوں نہایت قابل تعریف ہیں۔واقعے میں بیان کی قوت اور جودت اور عبارت کی سادگی بے ساختگی اور محاورات کی مناسبت اور عمدگی جو اس کتاب میں ہے شاید اردو کی کسی اور کتاب میں نہ ہو۔اور بڑی صفت یہ ہے کہ ہندی، فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش اس بے تکلفی کے ساتھ ہے جو دلّی کی زبان میں پائی جاتی ہے۔۔۔۔اور ایک بات نہایت عمدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خانگی حالات بھی اس میں مشرح بیان کئے گئے ہیں''

''مصنف نے صاف اعتراف کیا ہے کہ مذہب سے علیحدہ امور خواندگی میں اخلاق کی تعلیم کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔۔۔اس قصّے سے یہ نصیحت نکلتی ہے کہ سرگرمی اور صدق دلی سے عقائد مذہب کی پیروی کرنا ہی خانہ داری میں خوشحالی کی مستحکم بنا ہے''

چھوٹی لڑکی کا فہمیدہ کے ساتھ مکالمہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرا ہوا ہے اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو'' [۱۶]

''سرولیم میور'' کے اس تبصرے سے ناول نگاری اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے

کہ یہ تبصرہ چھوٹا ہونے کے بعد بھی اتنا جامع اور مانع ہے جو نذیر احمد کے پورے افسانوی ادب پر لائقِ تحسین آتا ہے۔اور نذیر احمد کے متعلق جو بھی بات کی گئی ہے اس کی بازگشت ان کی تحریروں میں آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں میں ''توبتہ النصوح'' کو اس اعتبار سے بہتر مانا جاتا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی سادگی واقعات کا تسلسل مکالمے کی ادائیگی اور قصے کی تعمیر فنی اور نظری طریقے پر برتی گئی ہے۔جو کہ ''ایم کیپسن اور سر ولیم'' میور کی تنقیدی اصلاح ہے۔

نذیر احمد داستانی دور کے ایک صاحبِ قلم تھے ہمیں ان کے قصوں میں منطقی ترتیب و تنظیم ،سماجی شعور ،واقعاتی تحلیل بیان ،واقعات ،کردار نگاری ،منظر نگاری زبان و بیان کی لطافت اور زندگی سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر جو ناول کے خصوصی عناصر میں سے ہیں وہ سب کے سب ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔نذیر احمد کے ناولوں کے پلاٹ سادہ اور اکہرے ہونے کے باوجود داستان سے مختلف نظر آتے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کی ناول توبتہ النصوح بیشتر خوبیوں سے مزین اور فنی اعتبار سے زیادہ متوازن ہے اور اس میں ربط و تسلسل بھی برقرار ہے۔حالانکہ ''سر ولیم اور کیپسن'' بنیادی طور پر نقاد نہ تھے لیکن پھر بھی انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی اور جو کچھ انہیں انگریزی ناولوں کے متعلق معلوم تھا اور جن تنقیدی خوبیوں کا انہیں علم تھا اُس کی روشنی میں ان حضرات نے نذیر احمد کو جانچا اور پرکھا۔اور بیش قیمتی مشوروں سے نوازا۔اور ان مشوروں کی بنا پر ''توبتہ النصوح'' کا جائزہ لیا۔بہر کیف اردو میں ''توبتہ النصوح'' کو اردو فکشن کی تنقید کا اولین نمونہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔جو نذیر احمد کے تنقیدی نظریئے سے متعارف ہوا۔

اگر نذیر احمد نے انگریزی ناولوں کا مکمل طریقے سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان کا تنقیدی شعور بھی میتھو کیپسن اور سر ولیم میور سے کم نہ ہوتا۔اور یہ ہم کہہ سکتے تھے کہ اس دور کے چار وسیع الذہن اشخاص جیسے شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی ،محمد حسین آزاد،امداد امام اثر وغیرہ یہ حضرات اگر شاعری کے ساتھ ساتھ ناول کی تنقید میں بھی دلچسپی لیتے تو ہمارے افسانوی ادب کے لئے بیش بہا خزانہ ثابت ہوتا۔اور نذیر احمد ان کی تحریروں سے کہیں نہ کہیں ضرور استفادہ کرتے۔اور نذیر احمد بھی فنی اعتبار سے بہترین ناول تخلیق کرتے اور

آنے والے نئی نسلوں کے لئے راستہ ہموار ہو جاتا، اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہ مشعلِ راہ ثابت ہوتی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کی تنقیدی نظر واضح خطوط کا تعین تو کرتی ہی ہے۔ لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ خود نذیر احمد بھی اپنے ان قصوں کو ناول نہیں گردانتے ہیں ورنہ ''رویائے صادقہ'' کے دیباچے میں وہ یوں ناول کی مذمت کبھی نہ کرتے اس سلسلے میں ان کا یہ اقتباس دیکھئے :

> ''یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دست گاہ ہوئیں تو ناول، یعنی قصہ کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں اور قصے بھی گندے ناپاک''۔[۱۷]

اس سے نذیر احمد کی فنکارانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ قصے اور کہانوں کے زمرے میں ہی ہیں۔ لیکن یہ قصے سچے اور اصلاحی ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی بھی ہوتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ یہ قصے اور کہانیاں اپنے دامن کو مذہب، اخلاق اور کردار کے موتیوں سے مزین رکھتے تھے۔ فرضی چیزوں اور لغویات سے ہمیشہ نذیر احمد نے کنارہ کشی کی ہے اور سماج و معاشرے کو بہتر اور خوشگوار دیکھنے کے ہمیشہ خواہاں رہے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد، عبدالحلیم شرر وہ ابتدائی ناول نگار ہیں۔ جنہوں نے ناول کی ضرورت کو محسوس کی اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس طرح ناول کی تنقید کے تعلق سے اردو کے ابتدائی زمانے کے جرائد و رسائل میں بحیثیت تعداد شرر سے زیادہ اور معیار افزوں تحریری مضامین ہمیں نہیں ملتے ویسے تو عبدالحلیم شرر کے رسالہ ''دلگداز'' کا اجراء ۱۸۸۷ء میں ہو گیا تھا۔ مگر وہاں بھی ناول کے متعلق عبدالحلیم شرر نے جو کچھ قلمبند کیا اس کا یادگار سلسلہ ۱۹۰۴ سے شروع ہوتا ہے۔ پھر بالترتیب ۱۹۰۷، ۱۹۱۰ اور ۱۹۱۷ کے دلگداز میں ان کے ایسے مضامین ملتے ہیں جن کا تعلق ناول کی تنقید سے ہے انھوں نے اس کی تعریف متعین کرنے کی سعی کے علاوہ ناول کے متعلق اپنے موقف کو Eliborate بھی کیا ہے۔ ناول کی تخلیق کے ساتھ ساتھ عبدالحلیم شرر نے اس کے خد و خال اس کی ساخت و ہئیت، موضوع اور اس کے مواد سے متعلق اپنے معاصرین Contemparory میں باضابطہ اور سب سے کثیر تعداد میں مضامین لکھے۔

اس کے بعد عبدالحلیم شرر کی پہلی تحریر جو ناول سے متعلق شائع ہوئی وہ ان کے رسالہ دلگداز ہی میں ملتی

ہے۔ چنانچہ ان مضامین کو اس وقت کے لحاظ سے بھی نہ تو ناول کی تنقید کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے نہ اعلیٰ نمونہ اس کے باوجود ان مضامین میں اس عہد کے معیارِ تنقید میں تنقید کی وہ گہرائی تو نہیں ہے لیکن ناول سے متعلق ان کے تنقیدی رویہ اور ماقبل عہد کے تنقیدی معیار کا اندازہ ہمیں کہیں نہ کہیں ضرور ملتا ہے۔ ناول سے متعلق شرر کے خیالات و تصورات ان کے تنقیدی رویہ کو سمجھنے میں بے حد معاون اور ناول کی ایک نہج قائم کرنے میں اہم معلوم ہوتے ہیں۔

شرر نے دو طرح کے ناول لکھے اول تاریخی اور دوسرے معاشرتی۔ تاریخی ناول میں انھوں نے ایک قوم کی عظمت و فتح دکھائی ہے، دوسری قوم کی شکست و برائی پر زور دیا ہے۔ تاریخی واقعات میں قصے کو دلچسپ بنانے کی غرض سے حسن و عشق کا بیان بھی شامل کیا ہے۔ ان کے نزدیک ناول کامیاب اور مقبول بنانے کی ایک اہم تکنیک اس میں عشقیہ مضامین کی شمولیت اور واقعات میں تصرف و تخیل کا عمل ہے۔ شرر نے اپنے جو مضامین ناول کے جواز میں تحریر کئے ہیں۔ ان کی حیثیت آنے والے کسی ناول کے دیباچے یا پچھلے ناول پر توضیح یا تردید کی مفاہمت کی ہے۔ خود شرر اپنے اس وکالتی طرز استدلال، جارحانہ اندازِ بیان کے سبب متضاد نقطۂ نظر کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ناول کے جواز میں ہی سب کچھ تحریر کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر کو اپنے معاصرین و متقدمین میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے باضابطہ طور پر سلیقے سے ناول لکھے۔ نذیر کی سادہ، عام فہم اور روزمرہ کی Discourse کو حسن و بیان اور نذیر احمد کے بے ربط پلاٹ کو تکنیک عطا کر کے اردو زبان کو ناول کے ایک زیادہ مرتب اور متحد فارم سے روشناس کرایا۔ شرر کے ناولوں کے دیباچوں اور رسالہ دلگداز میں آنے والے ناول کے اعلان سے قطع نظر ان کے تین مضامین ہیں۔ ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء''، ''ناول''، ''ہمارا جدید ناول''، عبدالحلیم شرر کے نظریات ناول سے متعلق آئینہ دار ہیں۔ اپنے پہلے مضمون میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ناول کا فن بھلے ہی ہمارے یہاں یورپ سے آیا ہو لیکن یہ دراصل ہماری ہی نسل ہے۔ جو پرانے زمانے میں اہل یورپ نے ہم سے لیا تھا۔ جب ہم نے اہل یورپ سے واپس لیا تو ایامِ ماضی کی بنا پر اس کی ہئیت قصہ سے بدل کر ناول ہوگئی۔ ان کے پہلے مضمون ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء''، کا یہ پیراگراف دیکھئے:

''ناول، اور ناول نویسی کو فی الحال ہم نے اہلِ یورپ سے لیا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہماری قدیم امانت ہے جس کو ہم ان امانت داران مغرب سے واپس لے رہے ہیں۔'' ۱۸

چنانچہ شرر قصہ گوئی سے بتدریج ناول کی منزل تک پہنچنے اور مشرق سے مغرب تک کے سفر کی سرگذشت یوں بیان کرتے ہیں جس سے فن ناول کی تنقید ہو بہو نظر آنے لگتی ہے۔

''مشرق میں سب سے پہلے متمدن ملک مصر ہے۔ اور مصر والوں ہی سے قصہ نویسی کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس مصری قصّے کے سوا یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ ایران وعرب و دیگر ممالک مشرق میں بہت قدیم زمانے سے خیالی اور طبع زاد قصوں کا عام رواج چلا آتا تھا۔ انھیں سے یونانیوں نے قصہ خوانی وقصہ نویسی سیکھی۔ پھر یونانیوں سے اس مذاق کو اہل روم نے حاصل کیا۔۔۔۔۔ رومیوں نے اس قصّہ کو بہت پسند کیا۔ اور ان میں بھی افسانہ نویسی وقصہ خوانی کا رواج ترقی کرنے لگا۔۔۔۔۔ انگریزی ناولوں کا آغاز رومیوں کے ناولوں کے ترجموں سے ہو۔ جن سے انگلستان کے بہت سے قدیم ترین اور اعلیٰ ترین مصنفان ڈرامانے اپنے تصنیف کے لیے مختلف قصوں کے خاکے پیش کیے ہیں۔ مگر یہ عموماً رومیوں کی عام پسند یا مذاق اور مضحک کامڈیوں سے ماخوذ تھے۔'' ۱۹

مندرجہ بالا متن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شرر داستان اور ناول کے بارے میں گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کی ترقی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ جس قصہ نے بالآخر ناول کی شکل اختیار کی اپنے مضمون ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء'' کے پہلے ہی پیراگراف میں لکھتے ہیں:

''ناول کا آغاز خیالی اور طبع زاد قصوں سے ہے۔ جو ابتداً محض داستان

گوئی کی شان قلمبند کر لیے گئے تھے۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ محض
خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات میں رنگ آمیزی کر کے دل
چسپ داستانوں کی شان پیدا کی گئی۔اس کے بعد ناول کی ترقی کا تیسرا
درجہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اسلوب سے دکھائے
جائیں اور اس کے ذریعے سے معاشرت و اصلاح زندگی کا سبق
دیا جائے۔'' ۲۰

البتہ اس پیراگراف سے بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ شرر ناول کے موضوع اور مقصد کی Specify کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اپنے خیالات کے اس ارتقاء کی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ کہ کیسے کیسے ان کے نزدیک ناول کا مقصد و موضوع دھیرے دھیرے تبدیل ہوگیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے fiction کی تنقید پر گفتگو کی ہے۔اور قصہ کے آغاز وارتقاء سے لیکر اس کے ناول کی ہئیت اختیار کرنے تک کا سرسری طور پر جائزہ لیا ہے۔

آگے پھر پہلی بار شرر اپنے مضمون ''ناول'' میں ناول کے تعلق سے لکھتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہندوستان میں ناول نویسی ایک بالکل نئی چیز تھی۔اور ان نئی دلچسپ
چیزوں میں جنھیں مغربی تہذیب نے ہماری زبان سے لاکر انٹروڈیوس
کیا ہے۔انگریزی معاشرت اور لٹریچر سے جتنی نئی چیزیں ہمارے ملک
میں آئیں ان کے قبول کرتے وقت ابتدا میں اپنی عادت کے موافق
ہندوستانیوں نے ناک بھوں ضرور چڑھائی۔مگر ناول ایک ایسی دلچسپ
اور بامزہ چیز تھی کہ ابتدائی دور میں اسے سب نے ہنسی خوشی سے قبول
کرلیا۔اور کیوں کر قبول نہ کرتے وہ چیز ہی ایسی تھی۔'' ۲۱

آئیں اب دوسری جگہ دیکھیں کہ ناول سے شرر کی اصل کیا مراد ہے۔اور اس کی ماہیت ومقصود کو کس طور پر Specify کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس اقتباس پر ذرا غور فرمائیں:

''ناول چونکہ ایک دلچسپ مذاق اور سلجھے ہوئے الفاظ میں لکھے جاتے ہیں ان کا لٹریچر وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں لائٹ لٹریچر کہتے ہیں اس لیے انھیں ادنیٰ و اعلیٰ۔ تھوڑی قابلیت رکھنے والا بھی اور زیادہ لیاقت رکھنے والا بھی۔ یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور مزہ لیتے ہیں۔ اور یہی سبب ان کی اشاعت کے بڑھنے اور ان کی طرف لوگوں کے عام طور پر متوجہ ہونے کا ہوتا ہے۔ قابل اور صاحب علم لوگ بھی جس آسانی سے تفریح و بیکاری کے اوقات میں بغیر اس کے کہ ان کے دماغوں پر کسی قسم کا بار پڑے ناولوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نہ کسی تاریخ کا کر سکتے ہیں نہ کسی اخلاقی کتاب کا اور ان کی کثرت اشاعت اور عام دلکشی ہی اس بات کا اصلی سبب ہے کہ ان کے ذریعہ سے ضمنی طور پر ہر قسم کی تعلیم دینے کو دیگر طریقوں پر ترجیح دی گئی ہے۔'' [۲۲]

بہرکیف شرر کے نزدیک ناول کی تعریف یہ ہے کہ اس کا اندازِ بیان دلچسپ ہو اور جو بیان کیا جائے وہ Complicated ایہام سے کوسوں دور ہو۔ نیز تاریخ یا اخلاقیات کی طرح بے مزہ اور بوجھل پن کے بجائے شگفتگی حاصل ہو، آسان فہم اتنا ہو کہ کم لیاقت والا شخص بھی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو بغیر کسی قسم کا بار ڈالے ہوئے۔ اس طرح ناول ان کے نزدیک تفریح کا ایک ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور ادبی معیار و اعلیٰ حیثیت یا گہری بصیرت کا حامل نہیں۔ اس کا مقصد صرف تفننِ طبع ہے دراصل شرر کو اس بات کا علم تھا کہ ناول میں انسانی زندگی سے متعلق بہت زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ناول کی تعریف سے متعلق غالباً لائٹ لٹریچر یا پاپولر لٹریچر تفریحی ادب کی اصطلاح کی خمیازہ بھگت رہے ہیں اس لیے انھوں نے ناول کو خالی اوقات میں پڑھنے کی ایسی چیز قرار دیا۔ جس سے کم جاننے والے لوگ بھی علم یکساں طور پر محظوظ ہو سکیں۔ جبکہ وہ ناول کے افادی اور تعلیمی مقصد کے قائل ہیں اور ہر لحاظ سے وہ تعلیمی طریقوں پر ناول کو فوقیت دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

''گو ابھی تک ایسے عمدہ اور اعلیٰ درجے کے ناول اردو میں بہت کم موجود
ہیں۔ جو انگریزی کے اعلیٰ ناولوں کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر اس بے مایگی پر
بھی موجودہ ناول ہمیں اسلوب زندگی کے جتنے نمونے دکھا چکے ہیں
گزشتہ صدہا اور ہزار ہا سال کا لٹریچر نہیں دکھا سکا تھا۔ اور آج کل کے
معیارِ تعلیم کے اعتبار سے یہی سب سے بڑی تعلیم ہے۔'' ۲۳

ناول سے متعلق گفتگو کرنے والے شخص کے بارے میں یہ وہم و گمان نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ ناول کو لائٹ لٹریچر ہی سمجھا ہوگا۔ اس کی ارتقاء پذیری کے بارے میں نابلد رہا ہوگا جس کی وجہ سے وہ صنف اعلیٰ ترین اصناف ادب کا ہم پلّہ بنی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ قوی امکان ہے کہ اپنے مافی الضمیر کی ترسیل قاری کی تفہیم کے لیے ہو سکتی ہے کہ انھیں کوئی موثر اور آسان طریقہ جو اس عہد میں رائج تھا اس کی متبادل اصطلاح نہ مل سکی ہو۔ جس کا انھیں سہارا لینا پڑا ہو جو ناول کے رتبہ و مقصود کو پوری طرح ادا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ شرر کے ذہن میں ناول کے متعلق ایک ہلکا سا تصور تھا جسے انھوں نے اپنی ہی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج ناول کا فن کتنی دور دراز مسافت طے کر چکا ہے اور ناول کی تکنیک اور ہیئت کے کتنے رنگ و روپ بدل چکے ہیں، ادب کے جاننے والے اس کا اچھی طرح علم رکھتے ہیں لیکن شرر کے ذہن میں ناول کا جو تصور ہے وہ بچپن کے دنوں کا تصور ہے آج کا ناول پورے طور پر شباب پر پہنچ چکا ہے اور گذرے ہوئے دنوں کے بارے میں شرر کی یہ تحریریں دیکھئے:

''ہر چیز میں ترقی جب ہی ہوتی ہے جب کثرت ہوتی ہے۔ جس طرح
انگلستان میں ہزار ہا ناول نویسوں میں چند اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز
اور نازک خیال ہیں اسی طرح ہمارے یہاں بھی جب ہزاروں لکھنے
والے ہوں گے تو چار ایسے اعلیٰ درجے کے جادو نگار ہونگے جن پر
ہندوستانی لٹریچر کو ناز ہوگا۔'' ۲۴

یہ ترجمانی تو صرف ناول سے متعلق ہے لیکن ادب میں جس چیز سے لوہا منوایا ان کی ایک تاریخی

ناول بھی ہے اس کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''تاریخ کا مذاق ملک میں صرف ناولوں نے پھیلایا ہے یا ناولوں نے اکثر مختلف اقوام وممالک کی تاریخ کو ایسے دلچسپ عنوان سے شائع کیا کہ معمولی قابلیت کے لوگ حتی کہ عورتیں تک تاریخ کو ایک نہایت دلچسپ فن خیال کرنے لگیں۔ مگر افسوس کی اردو میں جن حضرات نے تاریخیں لکھی ہیں ایسی بے مزہ اور بے لطف زبان میں اور کچھ ایسے بھونڈے عنوان سے لکھی ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں تاریخی ناول پڑھ کے تاریخ کا جوشوق پیدا ہوتا ہے وہ تاریخوں کو پڑھ کے جاتا رہتا ہے۔''۲۵

ان کا یہ نظریہ ہے کہ اس قسم کے ناول ماڈرن انگریزی میں بھی ملتے ہیں مگر اردو ناول میں یہ حقیر سمجھی جاتی ہے۔ انگریزی میں ایسے ہی ناولوں کی اکثریت ہے ان کے نزدیک یہ چیزیں ناول کے معیار اور عظمت کی کسوٹی نہیں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

''برے اور بے مزہ ناولوں کا فیصلہ کرنے والے ہم آپ نہیں ہیں۔ بلکہ فیصلہ کرنے والی پبلک ہے۔ جو خراب اور نہ پسندیدہ ہونگے وہ خود ہی مٹ جائیں گے۔''۲۶

شرر نے اپنے ناولوں کا انتخاب اس کی مقصدیت، کامیابی عوام میں مقبولیت اور کسی حد تک تاریخی ناول کے زمرے میں بھی آجاتی ہے۔ لیکن عوام میں مقبولیت ان کا سب سے بڑا پیمانہ تھا۔ یعنی جس قسم کا ادب یا ناول لوگوں کو پسند ہو وہی معیاری اور مناسب سمجھی جاتی ہے۔ چاہے وہ ادبی معیار کے اقدار و تقاضوں کو پورا کرے یا نہ کرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس بات سے اتفاق ممکن نہیں۔ لیکن ابھی ان کے متن پر تبصرہ قبل از وقت ہوگا۔ ان کے کچھ مضامین کا حوالہ دیکھ لیں ممکن ہے کہ ان کے خیالات میں ارتقاء اور تغیر نظر آئے رسالہ دلگداز جنوری 1907ء میں اپنے دوسرے مضامین ''ہمارا جدید ناول'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائے۔

''نئے تعلیم یافتہ گروہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور ابنائے وطن کی مروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہیے۔ جیسا کہ انگریزی میں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ ان کی تجربہ کاری ہے۔ بے شک انگلستان اور ممالک یورپ میں اکثر ناول ایسے ہی ہوتے ہیں اور وہاں وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کی پبلک میں جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ یہ عنوان بالکل دلچسپ نہیں ہوسکتا ہے'' ۲۷

ایسا ناول کیوں اور کیسے دلچسپ نہیں ہوسکتا اس کی وجہ ماقبل مضامین کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

''افسانوں میں انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اور ناکامی وٹریجڈی بھی پسند آتی ہے۔ تو اسی عہد کی جبکہ اپنے حالات میں کامرانی و مقصدوری کی صورتیں نظر آیا کرتی تھیں۔ جس طرح ہر انسان اپنے جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا اور مزہ لے لے کے کہتا اور سنتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج و کمال اور اوج و اقبال کے واقعات کو زیادہ پسندیدہ خیال کیا کرتی ہیں۔'' ۲۸

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ شرر کے نزدیک ناول میں قوم کی عظمت و رفعت یا اس کے Golden Period کا ہی بیان ہونا چاہیے اور ناول کے فن کار کو اپنی عظمت رفتہ کے ہی گیت گانے چاہیے۔ یہ تصور شرر کی ماضی پرست ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ناول کا جو معیار ہے فنی اصول اور ادبی تقاضوں کی تکمیل کے بجائے قاری کی پسند اور اس کی قبولیت کو قرار دیا جائے انگریزی ناول نگاری ہی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

''یورپ والوں کو دنیا کی ساری عمر میں اپنا ہی موجودہ دور کامیابی و کامرانی اور ترقی و عروج کا دور نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی گذشتہ زندگی کے عوض موجودہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے اور قومی عمر کے اسی

حصہ پر فخر و ناز رکھتے ہیں۔ایسی حالت میں اگر ان کے ناول موجودہ سوسائٹی کے واقعات سے لبریز ہوتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔''۲۹

اردو میں انگریزی طرز پر ناول نہ لکھے جانے کی دوسری وجہ یہ بتاتے ہیں'' سچ تو یہ ہے کہ ہم میں وہ سوسائٹیہی نہیں جس پر یورپ کے ناولوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے'' شرر اپنے عہد کی سوسائٹی اور سماج کو ناول کا موضوع بنا کر اردو میں انگریزی طرز جیسا ناول نہ لکھے جانے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سچ یہ ہے کہ ہمیں وہ سوسائٹی ہی نہیں جس پر یورپ کے ناولوں کی بنیاد قائم ہوتی ہو۔ چنانچہ جب شرر کے عہد کی سوسائٹی کو تحریری بحث میں لا کر چند ناول تحریر کیے گئے تو انھیں یعنی عبدالحلیم شرر کو اس رجحان میں اہانت اور بداخلاقی کی تعلیم کا پہلو غالب نظر آیا چنانچہ ناول کا دفاع کرتے کرتے بدقسمتی سے وہ خود شر پسند معترضین کی صف میں جا ملتے ہیں۔یہ پیراگراف دیکھئے:

''موجودہ سوسائٹی کے شوق کی برکت سے اردو میں ایسے ناول لکھے گئے ہیں۔جنھیں کبھی کوئی شریف زادی کسی اور کے گھر میں ڈولی سے اتروادی گئی ہے۔کبھی کسی نے کسی مہ جبیں بہو بیٹی کو کھڑکی سے جھانکتے یا گاڑی کی جھلملیوں سے آنکھیں ملاتے دیکھ لیا ہے۔اور عاشق ہو گیا ہے۔پھر اس کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی ہے آخر اسے خراب کیا ہے۔ایسے ناولوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ وہ سوسائٹی کی تصویریں ہیں یا ان کے ذریعہ سے سوسائٹی اور زیادہ بدنام و رسوا کی گئی ہے۔اُن میں اخلاق کا سبق دیا گیا ہے یا بداخلاقی سکھائی گئی ہے۔''۳۰

اس اقتباس میں شرر کے یہاں ناول میں سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرنے کے بجائے نذیر احمد، حالی کی طرح اخلاقی قدروں اور معاشرت کی عزت و آبرو کی دہائی دے رہے ہیں اور اردو میں انگریزی ناول کی خوشبو تلاش کرنے والوں کو لافہم نا تجربہ کار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ان کے ماقبل کے قول کے مطابق

اردو ناول کو انگریزی سے ربط ہونی چاہیئے اور ہے بھی۔ البتہ کوئی بھی قصہ اخلاقی تقاضوں کو پورا کرے یا نہ کرے لیکن اخلاق کو ڈسمس نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں ان کے ہی الفاظ میں یہ اقتباس کا ٹکڑا دیکھئے:

''ہمارے ہندوستانی مصلح فرماتے ہیں کہ اردو ناولوں کو انگریزی ناولوں سے کوئی نسبت نہیں۔ اردو والے ایسے ناول پبلک میں شائع کرتے ہیں جو اخلاق کے بگاڑنے والے اور شہوت پرستی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔'' ۳۱

اگر شرر کے اس متن پر سرسری نظر دوڑاتے ہیں تو شرر کی خام خیالی اور ان کے بیان میں تضاد و تباین کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے اس قسم کے ناول کے متعلق جواز تلاش کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ہمارا جدید ناول'' میں لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کے لیے اہلِ یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے بلکہ ''رومانس'' چاہئے۔ جن میں انہیں کے کسی اگلے ہم وطن یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہوں۔ اور جن کے ذریعہ سے انھیں اپنا اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو۔'' ''ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش میں لکھ کے شائع کیے تھے۔ مگر پبلک کو ان میں ہرگز اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ ''ملک العزیز ورجنا''، ''فتح اندلس''، ''ایام عرب'' اور ''فردوسِ بریں'' وغیرہ میں آیا۔ اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈ لیا کرتے ہیں۔'' ۳۲

مندرجہ بالا عبارت میں شرر حسن و عشق کے واقعہ کو اپنی طرف سے شامل کر لیتے ہیں۔ تخیلات کی آمیزش سے اپنی مقصدیت کو انجام دیتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے ناول صفحۂ قرطاس کے بجائے عالم وجود میں گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں اپنے ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس ناول میں جو واقعات بیان کئے جائیں گے مجموعی طور پر سچے اور مطلق واقعہ ہونگے۔ ہاں ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتوں اور صحبت کی باتوں میں تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے کیونکہ بغیر اس کے نہ ناول، ناول ہوسکتا ہے اور نہ قصہ میں مزہ آسکتا ہے۔'' ۳۳

شرر ناول کے موضوع اور مواد سے زیادہ ہئیت اور اسلوب کا دامن وسیع بتاتے ہیں۔ان کے یہاں ناول کی ہئیت اور اسلوب میں تاریخ، تہذیب وتمدن اور زیادہ تر مسائل کو خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ پرونے کی اہم صلاحیت موجود ہے۔ جس سے وہ دلچسپ، ذہن میں نقش اور قابلِ فہم ہوجاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈپٹی نذیر احمد کی مثالیں موجود ہیں کہ اول الذکر نے مذہبی اور اخلاقی مسائل کو ناول کا جامہ پہنا کر انتہائی دلچسپ اور قابلِ فہم بنانے کی کوشش کی۔ اور خود شرر نے اس کام کے لیے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن تاریخی حقائق کے بیان میں کئی جگہ ان سے بھول بھی ہوگئی ہے۔ اپنے مضمون ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتدا'' کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''ملکہ الزبتھ کے عہد میں اسپین کے ناول ترجمہ ہوئے جن کا ماخذ عربی مذاق تھا۔ ان کا پہلا مترجم ''جان لے لیا'' تھا جس کی عبارت میں کسی قسم کی رنگینی یا عبارت آرائی نہ تھی۔'' ۳۴

تاریخی ناول سے متعلق بھی انھوں نے اپنا جو تصور بیان کیا ہے وہ کافی گنجلک معلوم ہوتا ہے۔ شرر کا دور اردو ناول کا ابتدائی اور تعمیری دور تھا۔ ایسے حالات میں جب کہ اردو ادب میں ناول کا جامع تصور نہ ہو کامیابی کے ساتھ ناول لکھنا عوام کے درمیان اسے مقبول عام بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ شرر کے سامنے نذیر احمد کے اصلاحی اور معاشرتی ناول کے نمونے تھے کچھ انہیں کے اثرات قبول کرتے ہوئے شرر نے اپنی ناول نگاری کی ابتدا کی اس سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ناول نویسی ہے یا تاریخ نویسی ہے۔ اپنے مضمون کے آخری گوشہ میں یہ نکتہ چھوڑ جاتے ہیں اقتباس:

''انھیں طبع زاد خیالی قصوں سے تاریخی ناولوں کا آغاز ہوا۔ کسی عشق یا

جنگ کے واقعے کو گھٹا بڑھا کے ایسی رنگینی یا عبارت میں لکھا جاتا کہ

قصہ سے زیادہ لطف تاریخ میں پیدا ہو جاتا۔''۳۵؎

تاریخی ناول کے حوالے سے اپنے نظریات کا اظہار دوبارہ دلائل کے ساتھ ایک اور جگہ یوں کرتے ہیں۔ جس سے تاریخی ناول کا مفہوم بھی ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور ناول کی تنقید کا واضح خط بھی ہمارے ذہن میں کھینچ جاتا ہے وہ اس طرح رقم طراز ہیں۔

''جس طرح طبیب ایک نسخہ تجویز کرتے وقت مختلف اجزاء اس خوبی سے ترکیب دیتا ہے کہ ان سے ایک نیا موثر اور نفع بخش مزاج پیدا ہو بعینہ یہی کام آج کل ایک مورخ کا ہونا چاہئے۔ کہ واقعات کو وہ محض حلب روایات کی حیثیت سے جمع کر کے صرف اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں نہ کردے۔ بلکہ ان کی نئی ترکیب سے نیا رنگ اور نیا مزاج پیدا کردے۔ اور اس کے تازہ منافع وفوائد سے لوگوں کو فائدہ پہونچائے۔ اور یہی سبب ہے کہ ناولوں کے ذریعہ سے ہم تاریخوں کا جو مذاق ملک میں پیدا کرتے ہیں وہ ان بزرگوں کی تاریخیں پڑھ کے بالکل تشریف لے جاتا ہے۔''۳۶؎

مندرجہ بالا عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ناول اور خصوصاً تاریخی ناول کا تصور بالکل مختلف تھا۔ شرر بنیادی طور پر تاریخی ذہن لے کر آئے تھے اور اسی کے ذریعہ شرر اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ تاریخی واقعات کی خوش گوار ترسیل کے لیے انھوں نے ناول جیسی صنف کا انتخاب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ غیر دلچسپ واقعات کو ناول کے پیرائے میں ڈھال کر دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے طبیب تلخ دوا کو شیریں نسخہ بنا کر مریض کے حلق میں آسانی سے ڈال دیتا ہے۔

تاریخی ناول کے کچھ اصول اور فنی لوازماتی تقاضے ہیں لیکن شرر ادبی مقاصد یا فنی تقاضے کی طرف توجہ دینے کے بجائے پڑھنے والوں کی خواہش اور اس کی طلب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور فن ناول کے معیار کا تعین

کسوٹی کے آلہ پر، کرنے کے بجائے قارئین کی رائے اور ان کے مذاق پر چھوڑ دیتے ہیں ''ہمارا جدید ناول'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''ناول یوسف و نجمہ جو ایک مدّت سے ناتمام و ناقص پڑا ہوا تھا۔ پورا ہو گیا اور اس کا فیصلہ پبلک کے ہاتھ ہے کہ انجام کیسا ہوا؟ اور اس کی کیا حالت رہی؟ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ناظرین نے اس انجام کو پسند کیا ہوگا۔ اور جو کچھ اس میں ہوا وہ ان کے مذاق اور ان کی خواہشوں کے موافق ہوگا۔''[۳۷]

شرر کا ایک اور مضمون ''ناول'' ایک خاص طبقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے کے اس الزام کے مباحث میں لکھا گیا ہے کہ ناول میں حسن و عشق کے افسانے ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے مطالعے سے اگر براہ راست نہیں تو ضمنی طور پر دلوں میں بد اخلاقی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ شرر ناول کے موضوع اور اس کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے ناول کو مخرب اخلاق کہنے والوں کو ان احمق یونانیوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو سقراط کی تعلیمات کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ ناول کو مخرب الاخلاق سمجھنے والوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر بد اخلاقی کا یہی معیار ہے تو ان بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے بد اخلاقی کی تعلیم قرآن مجید سے ہوگی جس میں حضرت یوسف اور عزیز مصر کی بی بی کا قصہ عجب دلکش الفاظ میں مذکور ہے پھر اس کے بعد بڑی مخرب اخلاق حدیث و فقہ کی کتابوں کو ہونا چاہئے جن کی کتاب الطہارۃ اور دیگر بحثوں میں ان شرمناک باتوں کو جائز کر لیا گیا ہے۔۔۔ ان سادہ لوح بزرگوں کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ ناولوں میں تعلیم اخلاق کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا تھا کہ واقعاتِ عالم کو دکھا کے ان کے بُرے یا بھلے انجام کی

متعلق علماء کے فتوؤں کی طرح حکم نہ لگایا جائے بلکہ ان کے ہر قسم کے
انجام کی تصویریں دکھادی جائیں۔''۳۸

اس متن میں شرر نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ فن پارہ کا مقصد عین علما کے فتوے کی طرح مہر ثبت کرنا نہیں بلکہ حقیقت میں سماج اور معاشرے کی اصل تصویر دکھانا ہے اور یہ حقیقت پسندی پر دال ہے۔ پھر ناول کا فن بھی یہی ہے۔ کسی بھی فنکار کا ایک مقصد ہوتا ہے جو فن کو ترجیح دیتا ہے اس کی وضاحت کے لیے وہ اپنے مضمون ''ناول'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔۔۔۔ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار
بنانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔''۳۹

شرر کے مضامین ناول کے فن و موضوع سے متعلق نشاندہی تو کرتے ہی ہیں مزید یہ کہ اس میں تنقیدی بصیرت کا عکس بھی ملتا ہے لیکن تخیل کی کارفرمائی شرر کے یہاں مناسب اور ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یعنی وہ تخیئل کی ناگزیریت سے انکار نہیں کرتے اول یہ کہ نذیر احمد کے مقابلے میں شرر کا تصورِ ناول زیادہ واضح اور پختہ ہے۔ شرر کے مطالعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں کہ وہ اپنے پیش رووں کے مقابلے میں ناول کی تعریف اور موضوع پر فن کو ترجیح دیتے ہیں اور ناول کا کام حالات اور واقعات کا بیان اور اسکی تصویر کشی بحیثیت موضوع بتاتے ہیں لیکن صرف خیالی دنیا کی تخلیق یا حقیقی دنیا کی آمیزش سے محض ترجمانی کے بجائے ایک دوسرے کی رنگ آمیزی کو ناول کی خوبیاں قرار دیتے ہیں۔ اور وہ تفریحی ناول کی کامیابی و ناکامی میں قاری کی پسند و ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح شرر کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ شرر کے مضامین ناول کے فن اور موضوع و مقصد کی نشاندہی نہیں کرتے اور نہ ان میں کسی تنقیدی بصیرت کا نشان ملتا ہے۔

شرر کے عہد میں اردو ناول اور ناول کی تنقید جس مرحلے سے دوچار تھی اور اس زمانے کا جو تنقیدی رویہ تھا۔ اس دور کے لحاظ سے شرر کے مضامین بہت بلند اہمیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ جس طرح سے انھوں نے ناول سے متعلق نظریات پیش کئے ہیں۔ اور ناول کے فن، موضوع، مواد اور مقصد پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج کل جو معیارِ تنقید ہے اس کا اس دور کے اصولِ فن سے تقابل

کرنا زیادتی ہوگی۔لیکن آخر میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ شرر نے ناول کے بعض اہم عناصر جیسے کرداراور مکالمے وغیرہ پر تنقیدی بحث نہیں کی ہے۔

مولوی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر کے بعد مرزا ہادی رسوا اردو فکشن میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے پانچ طبع زاد ناول لکھے۔لیکن جس ناول کے ذریعہ ان کی شہرت وشناخت ہوئی وہ'امراؤ جان ادا' ہے۔ یہ ناول رسوا کی ایک شاہکار تخلیق ہے۔ باقی ناول اتنے کامیاب نہیں ہیں جتنا امراؤ جان ادا ہے۔ رسوا ناول نگاری کو پست عمل سمجھتے تھے۔ انھوں نے جو بھی ناول لکھے ہیں وہ صرف تفریح طبع، معمولی، معاشی فائدے اور بالخصوص آمین آباد کے کتب فروش مہادیو پرشاد کی فرمائش پر لکھے۔ رسوا ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر، مترجم، بہترین مدبر، ڈرامہ نگار، فلسفی اور کامیاب استاد کئی زبانوں کے عالم، مذہبی متکلم، علم ریاضی اور نجوم کے ماہر اور ماہر کیمیا گر بھی تھے لیکن ان کی شہرت کا سہرا امراؤ جان ادا ہی کو جاتا ہے۔ان تمام خوبیوں کے علاوہ انکی حیثیت ناول کے نقاد کی بھی ہے۔جس کی طرف ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے۔ رسوا سے پہلے فکشن سے متعلق جو بھی تنقیدی شعور ملتا ہے ان میں داستان کا اثر پایا جاتا ہے اور بعض ناقدین ناول کے فن سے واقفیت ہی نہیں رکھتے تھے۔

مرزا رسوا کے دیباچوں اور ان کے تنقیدی مراسلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں اور اپنے معاصرین کے مقابلے میں جدید فن سے واقف تھے۔جس عہد میں رسوا ناول لکھ رہے تھے اس عہد میں ایک تبدیلی آرہی تھی لوگ ناول کو تعلیمی، فلسفی، اخلاقی اور اصلاحی کام، تہذیبی، نفسیاتی مطالعہ کا ذریعہ بنا رہے تھے۔انیسویں صدی کے اختتام میں اردو میں انگریزی ناولوں کے ترجموں کا ایک رواج بن گیا اس زمانے میں رینالڈس کے ناولوں کو غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل تھی اردو میں انہیں کے ترجمے کئے جارہے تھے۔لیکن ایک باذوق اور باشعور قاری نے اس کو ناپسند کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ ناول کو کیسا ہونا چاہیے؟ اور کیسا نہیں ہونا چاہیے؟

رسوا کے زمانے میں جو ناول لکھے جارہے تھے وہ انگریزی ناولوں کے تقلید میں لکھے جارہے تھے اور انھیں سے ماخوذ ہوتے تھے۔ رسوا ناول میں نئے نئے تجربات کے خواہاں تھے اور ناول کے موضوع میں اور

تکنیک میں ایک نیا تجربہ دیکھانا چاہتے تھے۔لیکن ان کے معاصرین انگریزی ناولوں کی تقلید کر رہے تھے۔ ان پر سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے رسوا لکھتے ہیں۔

''اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈس کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں، اسی کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں اس کو اپنے ناول میں صرف کرتے ہیں۔قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔''[۴۰]

اس دور میں لکھے جا رہے ناولوں میں کوئی نیا پن، کوئی نیا خیال، کوئی تجربہ نہیں ملتا ہے۔ وہ ایک ہی طرز تحریر میں لکھے جا رہے تھے اور ان میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ مرزا رسوا کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر ناولوں میں اسی طرح کی یکسانیت باقی رہی تو ان میں جدت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ اپنے عہد کے ناولوں میں پائی جانے والی یکسانیت کا بیان اس طرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''اکثر ناول اس زمانے میں لکھے گئے ان سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں۔ جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے چیتھڑا کمپنی کہتے تھے۔اس میں چند پردے تھے۔خوامخواہ تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے۔ خواہ ان کا محل ہو یا نہ ہو۔'' [۴۱]

مرزا رسوا کو اس بات کی بھی شکایت تھی کہ ہمارے ناول نگار صرف ایک ہی فریم یا ایک ہی خاکے میں ناول لکھنے کے عادی ہیں۔ ان میں یہ قدرت نہیں کہ وہ کوئی نیا مضمون اخذ کرسکیں اور نہ اس بات کی حیثیت تھی کہ کئی منظر کو دیکھ کر اس کو صفحہ قرطاس پر لاسکیں۔ مرزا رسوا کو اس بات کا بھی گلہ تھا کہ ہمارے ناول نگار مشقت کرنا نہیں چاہتے ایک جگہ رسوا ایک مثال کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ (قصہ) کی ایک عام صورت پڑھی تھی۔ اس کا ذکر اس موقع پر لطف سے خالی نہیں۔۔۔ایک باغ میں ایک خوبصورت نوجوان مس

سے ایک صاحب بہادر کا سامنا ہوتا ہے۔صاحب بہادر ایک جان سے ہزار جان عاشق ہوجاتے ہیں۔مس صاحبہ سے اظہار تعشق کرتے ہیں اور شادی کا پیام دیتے ہیں۔مس صاحبہ نیم راضی ہیں۔ صاحب بہادر مفلس ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والد ماجد قطعی انکار کرتے ہیں۔''

دلوں میں محبت رہتی ہے۔مس صاحبہ کی شادی ایک اور صاحب سے ٹھہرتی ہے۔ یہ دوسرے صاحب بڑے دولت مند ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والدین کو یہ شادی منظور ہے، مگر بڈھے اور بدصورت ہیں، اس لیے مس صاحبہ کو منظور نہیں۔ پہلے صاحب سے پھر ایک باغ میں خفیہ ملاقات ہوتی ہے۔ پینگ بڑھتے ہیں، مس صاحبہ کے والدین مشتبہ ہوجاتے ہیں۔ پہلے صاحب بہادر مس صاحبہ کو بھگا لے جانے کا بندوبست کرتے ہیں، دونوں کی ایک رائے ہوجاتی ہے۔صاحب بہادر ایک سیڑھی لے کر آدھی رات کو مس صاحبہ کے بنگلے کی کھڑکے پاس سیڑھی لگادیتے ہیں۔مس صاحبہ اتر کر صاحب بہادر کے ساتھ ہوجاتی ہیں۔کسی دور دراز ملک میں جاکر شادی ہوجاتی ہے۔صاحب بہادر کے باپ مرجاتے ہیں۔ بہت سی دولت ہاتھ آتی ہے۔مس صاحبہ کے والدین سے ملاپ ہوجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لیے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنادیا جائے۔اسی پر ہزاروں ناول نام بدل کر لکھ لیے جائیں۔''۴۲

مرزا رسوا اس بات کے قائل تھے کہ ناول کے ذریعہ انسانی زندگی کے مختلف مسائل کو پیش کر کے ان کا حل تلاش کیا جائے۔تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی جائے اور حقیقی زندگی کو پیش کیا جائے اسی کے ساتھ ساتھ وہ ناول میں اخلاقی اور اصلاحی باتوں کی طرف متوجہ ہوکر اس پہلو کو ہی پیش کرنا زیادہ مناسب اور بہتر

سمجھتے ہیں۔ ہمارے ناول نگار یہ سب نہیں کرتے تھے۔ رسوا اپنے الفاظ میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردہ کے اصول کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ عوام عشق اور عاشقی کو ہر قصہ کی جان سمجھتے ہیں۔ لذت فراق اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے۔ پھر اگر کسی پردہ نشیں سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اس کی عصمت پر دھبہ لگے۔ پیام، سلام، وعدے، وعید، فراق، انتظار یہ سب کچھ بھی نہیں ہو سکتا، اور جب تک یہ نہ ہو قصہ کا مزہ کیا۔ لہذا لازم ہوا کہ ہر ایک قصہ میں ناجائز محبتوں کا تذکرہ ہو اور یہ موجب خرابی اخلاق کا ہے۔''[۴۳]

ابتدائی دور میں لکھے گئے ناولوں میں داستانوی رنگ نظر آتا ہے ان میں مافوق الفطرت عناصر پائے جاتے ہیں۔ اور ناول میں قارئین کی دلچسپی کے لیے عشق و عاشقی کے مضامین باندھے جاتے اور ان میں محبتوں کا ذکر کر کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا جاتا۔ ہمارے ناول نگار اسی کو آئینہ کے طور پر استعمال کرتے آرہے تھے اور بعض ناول نگار ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے ناولوں میں عشقیہ بیانات کا کثرت سے استعمال کیا اور وہ ناول فحش نگاری کی علامت بن گئے۔ ان میں ہر طرف عریانیت نظر آتی۔ یقیناً ناول یا افسانے میں اس کا بیان ہونا چاہیے لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ عریانیت کا گہوارہ بن جائے۔ مرزا رسوا کی اس سلسلے میں مزید گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسوا کا تصورِ اخلاق کیا ہے وہ رقم طراز ہیں:

> ''ناول پر کیا موقوف اور قصے بھی اسی طرح کے ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں زنا بالجبر کے ارتکاب کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق نے مثنوی طلسم الفت میں بین الاختین کو جائز رکھا ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی بہت مقبول ہے۔ اس

میں بھی پہلے ناجائز طور سے وصال ہوا پھر فراق کے بعد شادی ہوئی۔
خلاصہ یہ ہے کہ گناہ گاروں کا ذکر قصوں کی جان سمجھی گئی ہے۔اس سے
اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔''۴۴؎

مرزا رسوا قصوں میں عشق و عاشقی کے واقعات کی فراوانی اور اس کے لازمی بیان کی وجہ بتاتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''اس سب کا سبب کلی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظہ کا ہمارے ملک میں
بہت ہی کم شوق ہے۔ جمال اور عظمت کے تصورات سے اذہان قاصر
ہیں، نئے مضمون کیوں کر نکالیں۔''۴۵؎

مرزا رسوا نے ناول کے تمام اجزا کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔مثلاً ان کا قصہ کے متعلق اپنا ایک خاص نظریہ ہے اس سلسلے میں وہ ڈپٹی نذیر احمد سے متاثر نظر آتے ہیں۔قصہ کی تشکیل، کرداروں کی تخلیق، موضوع کے تعین، پلاٹ کی تعمیر اور زبان کے استعمال کے معاملے میں وہ دوسرے ناول نگاروں سے مختلف رائے پیش کرتے ہیں۔اپنے ناول 'ذاتِ شریف' کے دیباچے میں یون رقمطراز ہیں:

''بعض معاصرین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ کسی امر خاص کے ثابت کرنے
کے لیے پلاٹ (قصہ کا منصوبہ) بناتے ہیں اور اسکی مناسبت سے خانہ
پوری کر دیتے ہیں۔ہم ان پر اعتراض نہیں کرتے مگر اتنا کہہ دینا کوئی
قصور نہیں کہ ہمارا طرزِ تحریر اس کے برعکس ہے۔'' ۴۶؎

مرزا رسوا نے دو اعتبار سے اپنے طرزِ تحریر کو معاصرین کی طرز تحریر کے برعکس قرار دیا ہے۔مرزا رسوا اپنی طرزِ تحریر میں ایک اخلاقی نکتہ دکھاتے ہیں رسوا اور ان کے معاصرین میں جو بنیادی فرق ہے وہ واقعات یا کردار کے انتخاب کا ہے اور ناول میں زبان کے برتاؤ کا ہے۔'ذاتِ شریف'' کے دیباچے میں اس کا سبب یوں بیان کیا ہے۔

''ہم صرف اصل واقعے کو ہو بہو دکھانا چاہتے ہیں۔'' ۴۷؎

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کسی قصہ کو دلچسپ بنانے کے لیے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایک ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کے مذاق کی قلعی کھل جاتی ہے۔ فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے بہتر عمدہ مثالیں ہم کو مل ہی نہیں سکتیں۔'' ۴۸؎

مرزا رسوا ناول میں قصہ کی ہو بہو تقلید کے بجائے اس میں زیادہ فطری اور صالح کردار اور بہتر ماحول کے قائل تھے۔ وہ اس لیے اپنے معاصر ناول نگاروں پر طنز کرتے تھے کیونکہ ان کے ناولوں میں فطری اور صالح کردار یا ماحول کے بجائے ایک مقلدانہ روش ملتی ہے۔ رسوا کہیں ڈپٹی نذیر احمد سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں اپنی الگ راہ نکالتے ہیں۔ رسوا حقیقی واقعات اور ماحول کو تصوراتی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ نذیر احمد خالص تصوراتی کرداروں، واقعات اور ماحول میں حقیقت کا رنگ بھر کر اسے سچ ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں بقول پروفیسر ابوالکلام قاسمی:

''اگر نذیر احمد نے اپنے بیانیہ میں کرداروں کی نمو پذیری کو فطری ارتقا اور غیر شعوری تبدیلیوں کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی ہوتی تو اکبری اور اصغری کے کردار ایسا التباس ہرگز نہ پیدا کر پاتے کہ لوگ انہیں نذیر احمد کے اصلاح پسند قلم کی تخلیق محض سمجھنے کے بجائے بعض روایتوں کے مطابق ان کے بتائے ہوئے پتے پر ان خواتین کے گھر کا پتہ پوچھتے پھریں۔'' ۴۹؎

مرزا رسوا نے ناول میں زبان کے تعلق سے بھی کہا ہے کہ ناول میں کیسی زبان استعمال کرنی چاہئے اور کیسی زبان کے استعمال سے بچنا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ روزمرہ کی صاف ستھری اور عام فہم زبان استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں ''افشائے راز'' کے صفحۂ اول میں زبان سے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نیاز مند کو نہ اس زمانے کا طرزِ تحریر پسند ہے۔ اور نہ اس کے لکھنے کی لیاقت۔ آپ بھی لکھئے تو اس طرح لکھئے کہ ہم آپ باتیں کرتے ہیں نہ کہ اس عبارت میں جو کسی انگریزی کتاب کا لفظی ترجمہ معلوم ہو۔'' ۵۰؎

چند صفحوں بعد اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عام فہم اردو ہو جو لکھنؤ کے شرفا کی زبان ہو'' ۵۱؎

امراؤ جان ادا میں رسوا اپنے دوست منشی احمد حسین کے ادبی مذاق کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ہمارے منشی صاحب مہربان ابتدائے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ الف لیلیٰ، امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستانِ خیال کی کل جلدیں نظر سے گزری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے دیکھا نہ ہو۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد اہلِ زبان کی اصلی بول چال کی خوبی۔ کھلی اکثر ناولوں کے بے تکے قصے، مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی ناول کی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔'' ۵۲؎

مرزا رسوا نے صرف بیانیہ میں ہی زبان کو سلیقے اور احتیاط سے برتنے پر زور نہیں دیا ہے بلکہ ناول کے دوسرے عناصر مثلاً منظر کشی، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری کو بھی پیش کرنے میں زبان ایک اہم مقام رکھتی ہے اس کی ایک اہم حیثیت ہے اس سلسلے میں وہ زبان کی قوت اور لفظوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا، اور نہ خوش آئند سُر کانوں تک پہنچا سکتا ہے، لیکن وہ الفاظ کے ذریعے سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخیل پر کھینچ سکتا ہے، نہ صرف ایک رخ سے بلکہ کئی رخوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم

بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی کا مزہ پیدا ہوسکتا ہے۔''۵۳؎

رسوا کے ناولوں میں کرداروں کی پیش کش بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ناولوں کے کرداروں کے سلسلیمیں بڑی عمدہ اور نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ رسوا نے اپنے ناولوں میں چھوٹے سے چھوٹے کردار کو بڑی توجہ اور سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ تخیل کی مدد سے کوئی کردار خلق کرتے ہیں اور اسی کے ارد گرد ناول کا تانا بانا بنتے ہیں۔ رسوا کے کردار آزاد نظر آتے ہیں۔ رسوا اپنے کرداروں سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ان کی پسند یا ناپسند کو اپنی پسند یا ناپسند نہیں بتاتے ہیں اور نہ ہی ان کی سوچ وفکر سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی ذاتی تعریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسوا اپنے آس پاس یا اپنے اسی معاشرے میں سے کسی کردار کو خلق کر کے اس کی شخصیت کے بعض انوکھے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہم ناول نویسی کے لیے ایسے اشخاص کی سوانح عمری کی تفتیش کریں۔ جن کے مفصل حالات ہم نہیں معلوم کر سکتے۔ خود ہمارے عزیزوں میں ایسے لوگ ہیں جن کے حالات در حقیقت بہت ہی عجیب وغریب ہیں۔ مگر ان کے سننے کی ہمیں پروا نہیں۔ کیونکہ ہمیں سکندر اعظم، محمود غزنوی، ہنری ہشتم، ملکہ این، نپولین، لونا پارٹ کے تاریخوں کے ضخیم مجلدات سے فراغت ہی نہیں ملتی''۵۴؎

مرزا رسوا کے ناول ''شریف زادہ'' کے کردار مرزا عابد حسین اور سید جعفر حسین انجینئر ایسے کردار ہیں جو انھیں کے آس پاس زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مرزا عابد حسین خود رسوا کا کردار معلوم ہوتا ہے۔ اور سید جعفر حسین ان کا دوست تمکین کاظمی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں امراؤ جان ادا کے مطالعہ سے مرزا سے روشناس ہوا تھا۔ اس لیے مرزا سے اکثر اس کے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ادا واقعی ایک عورت تھی اور یہ قصہ سچا ہے۔ البتہ بعض باتیں مرزا نے زیبِ داستان کے لیے بڑھا بھی دی ہیں۔''۵۵؎

مرزا رسوا نے اپنے ناولوں میں جو بھی کردار وضع کئے ہیں وہ ان کے آس پاس کے کردار ہیں۔ اسی لیے ان کردار کے باطن کو بھی سمجھنے میں مرزا کو کافی مدد حاصل ہوئی۔ رسوا نے اپنے ناولوں میں کرداروں کی نفسیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کے خدوخال، ان کے بات چیت کرنے کا طریقہ ان کی سوچ ان کی فکر اور ان کے جذبات کو بھی پیش کیا ہے۔

مکالمہ نگاری میں مرزا رسوا بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ امراؤ جان ادا اس کی بہترین مثال ہے۔ 'افشائے راز' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ اس ناول میں اعلیٰ درجہ سے لے کر ادنیٰ درجہ تک بولنے والوں کے مکالموں کی نقل کی گئی ہے۔ لیکن ہم نے حتیٰ الوسع زبان کی سلاست کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔'' ۵۶

کرداروں کے ذریعہ وہی باتیں کہلوائی جائیں جو موقع کی مناسبت رکھتی ہوں جو کردار جیسا پیش کیا گیا ہے اس کی بات چیت کا انداز بھی ویسا ہی ہونا چاہئے مثلاً اگر کوئی امیر ہے تو اس کا انداز امیر جیسا ہو۔ اور غریب ہے تو غریبوں جیسی باتیں کرے۔ کرداروں کے مکالموں کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ بولنے والی شخصیت سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ بقول پروفیسر نیر مسعود۔

> ''مکالمہ نگاری کی سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ نقل مطابق اصل ہونے کے باوجود مطابق اصل معلوم ہو اور اس کی پابندی کا آج تک ہمارے یہاں صحیح تصور نہیں ملتا۔ یہ شرط رسوا ہی کا سا اعلیٰ فن کار عائد کر سکتا تھا۔'' ۵۷

رسوا ناول کو صرف موجودہ زمانے کی تاریخ، موجودہ زمانے کی تہذیب و معاشرت کو سمجھنے کا ذریعہ ہی نہیں بتاتے بلکہ اس کے ساتھ ناول کے دیگر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا رسوا نے ناول کے عناصر سے بحث کرنے کے باوجود ناول کی عام تعریف سے گریز کیا ہے۔ چنانچہ یہ ضرور بتایا ہے کہ وہ ناول سے کیا سمجھتے ہیں۔ آئیں ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھوٹے سے اقتباس سے ان کا نظریہ ناول سے متعلق کس حد تک واضح

ہوتا ہے۔ ''ذاتِ شریف'' کا دیباچہ ملاحظہ ہو:

> ''ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کردیتا ہے۔ جو اس نے اپنے زمانے میں دیکھے ہیں یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ زمانہ کی تصویریں جو اس کے دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں''۵۸؎

مرزا رسوا اس بات کو ماننے پر اصرار کرتے ہیں کہ ناولوں میں موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہئے۔ یہ بات اہم ہے۔ لیکن اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو بلا شبہ فکشن کو اپنے عہد کی تاریخ کی نظر سے دیکھنا اس لیے اہم ہے کہ بعد کے زیادہ تر حقیقت پسندوں نے اپنے ناولوں کو تاریخ قرار دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے ناول کی اس تجدید سے اس کا تخیلی پہلو پس پشت چلا جاتا ہے اور زندگی اپنی اسی بے کیف واقفیت کے ساتھ جلوا گر ہوتی ہے۔ جو ناول کو اس کے فن سے محروم کر دیتی ہے۔ مرزا رسوا ناول میں تخیل کے حوالے سے کہتے ہیں کہ وہ حقیقی واقعات کو تخیل کی آمیزش سے ناول کی ہیئت میں ڈھالتے ہیں جو ان سے پہلے لکھنے والوں اور ان کے معاصرین کے مقابلے میں ناول کا زیادہ واضح اور جدید تصور ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مرزا رسوا نے ناول کو موجودہ زمانے کی تاریخ بتا کر واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے نذیر احمد کی طرح ناول کو تعلیم و تدریس کا ذریعہ نہیں بنایا اور شررؔ کی طرح قومی احساسِ کمتری دور کرنے کا وسیلہ نہ سمجھا ان کا نام عظیم ناول نگاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور وہیں ناول سے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر رکھنے کی وجہ سے وہ ذہنی لحاظ سے عصر حاضر کے نقادوں کے پیشِ رو بھی معلوم ہوتے ہیں۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ رسوا نے ناول کے تعلق سے جو تنقیدی رائے پیش کی ہے وہ زیادہ واضح اور جدید تصور ہے۔ رسوا مقلدانہ روش سے ہٹ کر ایک الگ راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ان کے معاصرین کے یہاں نہیں ہے۔

اردو ناول نگاری کے ابتدائی دور میں جن ادبا نے ناول کے تعلق سے اپنے خیالات و نظریات پیش کیے ان میں عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا کے بعد منشی پریم چند کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ناول کے بارے

میں ان کا نظریہ بہت ہی تسلی بخش رہا ہے۔منشی پریم چند نے اردو ناول کی تنقید کے تعلق سے کل چار مضامین قلم بند کیے۔ جو''اردو زبان اور ناول''،''شررو سرشار''،''ناول کا فن''اور''ناول کا موضوع''جیسے عناوین کے تحت 1910ء سے 1931 کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔منشی پریم چند کے عہد میں صنف ناول اردو دنیا کے لیے بالکل ہی ایک نیا تجربہ تھا۔جس نے بڑی تیزی سے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔اس سلسلے میں پریم چند اپنے پہلے مضمون''اردو زبان اور ناول''میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اردو دنیا کے لیے ناول ایک اچھوتی چیز ہے۔زبان میں ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانوں سے زیادہ دلآویز اور معمولی مثنویوں سے زیادہ پر لطف تھی۔اس لیے پبلک نے حسب حیثیت ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔اور برائے چند، ناولوں کی خوب گرم بازاری رہی۔''۵۹

پریم چند کا عہد ایک ایسا عہد تھا جس میں بڑے زور و شور سے ناول لکھے جا رہے تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ بڑی کثرت سے انگریزی ناول اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔مگر ان ناولوں کا معیار بہت ہی سطحی تھا۔یہ ناول جنسی، جذباتی اور سنسنی خیز قصوں پر محیط ہوتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ناولوں میں سنجیدہ مذاق رکھنے والے قاریوں کی دلچسپی دن بہ دن کم ہونے لگی تھی۔ان ناولوں نے جہاں ادبی ناولوں کو بہت نقصان پہنچایا وہیں ادیبوں اور ناقدوں کو بھی اس سے بہت ٹھیس پہنچی۔چنانچہ ناول نگاری کے اس قلیل عرصے میں بھی جب منشی پریم چند ناول کے تعلق سے لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ زمانے کی باتیں ہوں وہ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ اردو زبان میں ناول نویسی اور ناول خوانی کی دھوم تھی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی عاشق حسین اور حکیم محمد علی یہ اسمائے گرامی انھیں دنوں کی یادگار ہیں.... ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اور ان کی قدر کرنے والے کم نہ تھے۔یہ

لوگ صنف ادب میں پیش رو کا کام کر گئے۔ ۶۰؎

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ناول اپنی ارتقائی راہ پر گامزن تھا اور اس کے قدر دانوں میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا تو پھر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بدولت یہ اچانک بے قدری کا شکار ہونے لگا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ناول کی بے قدری اس کا پست معیار ہونا ہے۔ لیکن پریم چند نے اس کی مزید تین اور وجوہات بیان کی ہیں۔ اول تو یہ کہ قارئین کا رجحان اردو کے طبع زاد ناولوں کے مقابلے میں انگریزی ترجموں کی جانب زیادہ ہونے لگا تھا۔ دوم یہ کہ ناول کے مطالعہ کو لوگ غلط اور وقت کی بربادی تصور کرتے تھے اور سوم یہ کہ اردو کے بعض اہم ناول نگاروں کی تخلیقات میں تعصب نے جگہ بنالی تھی۔ آخر الذکر سے متعلق پریم چند یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس بے قدری کی ایک اور وجہ ہے۔ اردو ناول نویس اب تک بجز سرشار کے تقریباً سب مسلمان تھے۔ اور انھوں نے اپنی کتابوں میں اس ہندو جذبہ کی مطلق پرواہ نہیں کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن کے تعشق سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ''ہندوستان ریویو'' میں ایک مسلمان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اکثر بنگالی ناولوں میں ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا گیا ہے جسے پڑھ کر مسلمانوں کے خون میں جوش آجاتا ہے۔ اردو کے کئی مشہور ناولوں میں اس لغویت کی بالکل پرواہ نہیں کی گئی۔'' ۶۱؎

ناول کی نامقبولیت کی ابتدائی دو وجوہات سے متعلق عبدالحلیم شرر اپنے نظریات پیش کر چکے ہیں۔ مگر پریم چند نے جو آخری وجہ بیان کی ہے یہ خود ان کا نظریہ ہے جس کی دریافت انھوں نے خود کی ہے۔ پریم چند کے اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ابواللیث صدیقی نے تو بڑے معرکہ کی بات کہی ہے۔ انھوں نے خود پریم چند کے ہی ناولوں میں اس طرح کے عناصر کی دریافت کر کے پریم چند کو متعصب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عبدالحلیم شرر سے لیکر پریم چند تک جن لوگوں نے بھی ناول کی نامقبولیت کے

اسباب بیان کئے ہیں وہ تمام کی تمام تحقیقی نقطہ نظر سے صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ یہ تمام حضرات صحیح تجزیہ سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ناول کی ہزار مخالفت اور انگریزی ترجموں کی مقبولیت کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس''، رسوا کے ''امراؤ جان ادا'' کی اہمیت اب بھی لوگوں کے دلوں میں قائم ہے۔ خود عبدالحلیم شرر کے کئی ناولوں میں محض ''فردوس بریں'' کو ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ان سب کے علاوہ پریم چند کے کئی ناولوں میں ''میدانِ عمل''، ''گئودان'' کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ ان کی دیگر ناولوں کو نہ مل سکی۔

غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ انگریزی سے ترجمہ شدہ اردو ناولوں کی طرح اردو کے تخلیقی ناول بھی عام طور پر ایسے ہی ناولوں کی طرز پر لکھے جا رہے تھے جن میں رومان اور سطحی مزاج غالب نظر آتا ہے۔ ایسے ناولوں سے دماغ پر فوری اثر تو ضرور قائم ہوتا ہے مگر ان ناولوں میں ہنرمندی اور فنکارانہ بصیرت کی کمی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر ناول نگار اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار نہ لا کر ایک بنے بنائے فارم میں ناولوں کو ڈھالنا شروع کر دیا حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو ان ناول نگاروں کی خواہش اپنے آپ کو ایک بڑا مصنف ظاہر کرنے کی بھی تھی۔ ناول نگاری کے اسی ماحول پر تجزیہ کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں۔

> ''اس تیز روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس نے ناول لکھنا شروع کیا۔۔ کئی کئی صفحہ تک بے سر پیر کی بکواس کے بعد بازاری حسن وعشق کا (بیقراری) قصہ چھیڑ دیا۔ عاشق کی بیقراری اور معشوق کی بے نیازی دیکھائی۔ کچھ دنوں تک جدائی کی تکلیفیں رہیں۔ میاں عاشق پر جنون سوار ہو گیا۔ تب دوستوں کی ہمدردیوں نے پوشیدہ ملاقاتیں کرائیں اور عاشق ومعشوق کا وصال ہو گیا، قصہ تمام ہوا، شرر اور سرشار کے سوا قریب قریب سبھوں نے یہی طرز اختیار کیا، اسی خاکے پر ہر ایک مصنف اپنی لیاقت اور مذاق کے موافق رنگ بھر لیا کرتا تھا آخر ناولوں کی ایسی افراط

ہوگئی کہ پڑھنے والے تنگ آ گئے ۔'' ؎۶۲

پریم چند کے اس اقتباس کے مطالعہ سے مرزا رسوا کے تحریروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انھوں نے سطحی ناولوں کی فراوانی اور ادبی ناولوں کی کمی کی شکایت کرتے ہوئے ناول نگاروں کی مقلدانہ روش اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر ایسا ہی طنز کیا تھا کہ وہ صرف بنے بنائے ڈھانچے پر ہی ناولوں کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ اس عہد کے عام مذاق اور اصول ناول نگاری کا اندازہ لگانے کے لیے پریم چند کے اس اقتباس کو پیش کرنا بہت ضروری ہے، جس میں وہ اپنا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''راقم کو بھی ان دنوں لکھنے کی دھن سوار تھی۔۔۔۔ ناول کے چند صفحے لیکر ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جو اپنے تئیں شاعری کرتے تھے اور نثر میں بھی دعویٰ کمال رکھتے تھے۔ نو مشق مصنفوں کو داد کلام لینے کا خبط ہوتا ہے۔ راقم کو بھی یہی ہوس ان کی خدمت میں لے گئی۔ مگر پہلا سوال جو انھوں نے مجھ سے کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے ''عبرت'' کا مطالعہ کیا ہے؟ راقم نے معذرتاً کہا کہ وہ کتاب ابھی نظر سے نہیں گذری۔ مولوی صاحب نے فوراً منھ پھیر لیا اور بولے، پہلے اسے خوب غور سے پڑھ جائیے اور تب ناول لکھنے کے لیے قلم اٹھائیے۔ گویا ''عبرت'' ناول نہیں بلکہ ناول گر تھا۔'' ؎۶۳

یہ تو اچھا ہوا کہ پریم چند نے مولوی صاحب کی باتوں پر دھیان نہ دیتے ہوئے خود کو اردو فکشن کے اس غلط راہ سے بچالیا ورنہ صنف ناول جیسی اردو ادب کی اہم صنف کا رونا ہم آج بھی رو رہے ہوتے جو اس عہد کے ادیب اور نقاد کے لیے ایک اہم مسئلہ تھا۔

آج دنیا میں بہت سے علوم و اصناف موجود ہیں۔ مگر پریم چند ان علوم و اصناف کے مقابلے میں ناول کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ پالیٹکس یا فلسفے کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے ممکن نہیں کیوں کہ دنیا کہ ایک بہت بڑی آبادی کسبِ معاش کی فکر میں پریشان نظر آتی ہے۔ ان حضرات کے لیے نئے علوم کا

مطالعہ بہت مشکل کام ہے۔''سو یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے'' چنانچہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح اس بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ناول کے فن کے ذریعہ لوگوں کو دوسرے علوم وفنون کی اہم معلومات سے بڑی حد تک متعارف کرایا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں پریم چند رقم طراز ہیں۔

> ''یہی سبب ہے کہ آج یورپین زبانوں میں سائنس، فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہیں تا کہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہ ہو جائے اور علم کے خشک مسئلے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے اس کے ذہن نشیں ہو جائیں اہل یورپ نے ناول کو ادب کا سب سے ضروری صیغہ تسلیم کر لیا ہے اور ناول نویسی کو سائنس کا رتبہ دے دیا ہے۔افسوس ہے کہ اردو پبلک یورپین علم و ادب کی رفتار سے بے خبر ہے۔''[۶۴]

پریم چند اردو ادب کے بڑے حامی اور مددگار تھے۔ وہ عالمی ادب اور اس کے فنی طریقِ کار سے بخوبی واقف تھے۔انھوں نے ناول کو ہمیشہ زندگی اور معاشرے کی اصلاح کا ایک اہم اور بہترین ذریعہ سمجھا۔ اسی کے ساتھ وہ ناول کی اس نزاکت سے بھی واقف تھے کہ فطرت انسانی کو متاثر کرنے والی یہ لطیف اور دلکش تحریر کب تک فن کے دائرے میں رہتی ہے۔اور کن حالات میں یہ اس دائرے سے خارج ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک عمدہ اور معیاری ناول کی تخلیق کے لیے ناول نگاروں کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ استاذ فن کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کریں۔انسانی نفسیات سے اچھی واقفیت حاصل کریں اور اپنے سچے احساسات و جذبات کی عکاسی کے ساتھ خیالات میں تازہ کاری پیدا کریں۔

ناول کیا ہے اس کے منصب اور مقصد کا تعین اور اس کی تعریف و تقسیم سے متعلق پریم چند کے آخری تین مضامین کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اگر چہ انھوں نے ''ناول کا فن'' میں لکھا ہے کہ ''ناول کی تعریف انتہائی مشکل ہے، آج تک اس کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہو سکی جس پر سب لوگ متفق ہوں'' لیکن وہ خود اپنے دوسرے مضمون ''شرر و سرشار'' میں ناول کی مفصل تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

''ناول انگریزی لفظ ہے اور اگر اسکا ترجمہ ہوسکتا ہے تو وہ فسانہ ہے۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں، مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہے۔ ناول اس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا، جس کا وہ تذکرہ کرر ہاہو، صاف صاف چربہ اتارے۔ اوراس کے رسم ورواج، مراسم و آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے۔ اور مافوق العادات واقعات کو دخل نہ دے، یا اگر دے تو اس کی تاویل بھی اس خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگیں، اسی کا نام ہے ناول یا فسانہ۔'' ۶۵

یہ مضمون دراصل حکیم برہم گورکھپوری کے اس مقالے کا جواب ہے جس میں حکیم صاحب نے سرشار کے مدمقابل شرر کو ایک بہترین اور کامیاب ناول نگار تسلیم کیا ہے۔ اور فسانہ آزاد کو انتہائی درجہ کا ناقص ناول ثابت کرنے کی بھرپوری کوشش کی ہے۔ اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ناول کی تعریف کرتے وقت پریم چند کے سامنے حکیم برہم کی وہ تحریر ضرور تھی جس میں حکیم برہم نے شرر و سرشار کا موازنہ کیا ہے۔ پہلے تو ناول کی یہی تعریف کی جاتی تھی کہ وہ مافوق العادت واقعات سے عاری ہو اور اپنے زمانے اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہو، لیکن ناول کی یہی تعریف 1920ء میں پریم چند کرتے ہیں تو ہمیں ان کی اس فکر پر حیرت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند مزید رقم طراز ہیں:

''یہ طرز جدید فسانہ عجائب، یا گل بکاؤلی، یا قصہ ممتاز، طلسم ہوشربا، یا بوستان خیال سب پرانے ڈھنگ کے قصے ہیں۔ جن میں جدید فسانہ کی خوبیوں کا شائبہ تک نہیں۔ ہاں میر امن دہلوی کی مقبول عام کتاب باغ و بہار یا داستان الف لیلہ ایک حد غیر محسوس تک مرقومہ بالا خوبیاں رکھتی ہیں۔ یعنی اپنے زمانہ کی تہذیب پر ایک دھندلی روشنی ڈالتی ہیں۔'' ۶۶

پریم چند نے الف لیلیٰ اور باغ و بہار کو اپنے زمانے کی تہذیب کی دھندلی عکاسی کے باوجود اسے ناول کے زمرے میں شامل کرلیا مگر اس کے برعکس شرر کی ناولوں کو محض اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ جنگ کے

ذاتی تجربے سے محروم ہیں۔ ان کا ناول قدیم تاریخ کو بیان کرتا ہے جس کا مشاہدہ انھوں نے نہیں کیا۔ اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

''الفرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے ان کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے۔ اور تاریخی معلومات چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ ذاتی وعینی مشاہدے سے لگا نہیں کھا سکتی یہ امر مسلمہ ہے کہ خیال کبھی مشاہدے کا ہم وزن نہیں ہوسکتا۔'' ۶۷

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پریم چند ذاتی تجربے یا مشاہدے کو ناول کی تخلیق کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور تخیل کو غیر اہم۔ وہ اپنے مضمون ''ناول کا موضوع'' میں ناول نگار کے لیے قوتِ تخیل کو دسری صلاحیتوں سے اعلیٰ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں (ناول نگار میں) اور چاہے جتنی کمیاں ہوں لیکن تخیل کی قوت ناگزیر ہے۔ اگر اس میں یہ قوت موجود ہے تو وہ ایسے کتنے ہی مناظر واقعات اور کیفیات کی تصویر کشی کرسکتا ہے جن کا اسے ذاتی تجربہ حاصل نہ ہو۔ اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں تو خواہ اس نے کتنی ہی سیر و سیاحت کی ہو، وہ کتنا ہی عالم کیوں نہ ہو، اور اس کے تجربات کا دائرہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، اس کی تخلیق میں دلکشی نہیں آسکتی ایسے کتنے ہی ادیب ہیں جن میں انسانی زندگی کے واقعات کو دلچسپ، دلآویز اور موثر اسلوب میں بیان کرنیکی صلاحیت موجود ہے لیکن وہ تخیل کی کمی کی وجہ سے اپنے کرداروں میں زندگی کے آثار پیدا نہیں

کر سکتے۔''۶۸؎

پریم چند کے دونوں مضامین کے مابین تضاد کو دیکھتے ہوئے ان کو کم علم یا ناواقف نہ قرار دیا جائے بلکہ ان کا پہلا مضمون ''اردو زبان اور ناول'' میں جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک اخلاقی مضمون کا جواب ہے۔ جس میں پریم چند نے سرشار کو شرر سے بڑا ناول نگار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اختلافات کے دوران مصنف بعض اوقات علمیت کی جگہ عصبیت سے کام لینے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں جہاں کسی مسئلے کی توضیح وتشریح ہونی چاہئے وہاں مصنف کا رجحان اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کی جانب ہو جاتا ہے۔ اس میں جذبات وتعصّبات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس طرز کی تحریروں کو دلیل بنانے کے بجائے مصنف کی دوسری تحریروں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔

''پریم چند نے اپنے پہلے مضمون ''شرر و سرشار'' کے گیارہ سال بعد 1931ء میں دو مضامین ''ناول کا فن'' اور ''ناول کا موضوع'' لکھا وہ اپنے مضمون ''ناول کا فن'' میں رقم طراز ہیں:

> ''میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہو۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے.... آدمیوں کے کردار میں بھی بہت کچھ مشابہت کے باوجود کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ کرداروں کے بارے میں یہی مشابہت اور اختلاف، یکسانیت میں تضاد اور تضاد میں یکسانیت دکھانا ناول کا بنیادی فریضہ ہے۔''۶۹؎

کرداروں کی بہتر مصوری کے لیے پریم چند کرداروں کے واضح اور وسیع مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔ کرداروں میں محض انسانی خصوصیات پیدا کر دینا کردار نگاری کا کمال نہیں۔ اس ضمن میں پریم چند کا یہ کہنا کہ ''سچی صناعی تو یہ ہے کہ کریکٹروں میں جان ڈال دی جائے'' وہ کرداروں کے ارتقاء کو ناول کا لازمی جزء قرار دیتے ہوئے ایسے کرداروں کو خارج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس میں ارتقائی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس تعلق سے ان کا یہ اقتباس ذرا غور کریں:

> ''ناول کے کردار بھی ناول نگار کے تخیل میں مکمل صورت میں نہیں

آ جاتے بلکہ ان میں بتدریج ارتقا ہوتا جاتا ہے۔ یہ ارتقاء اتنے غیر محسوس اور پوشیدہ طور پر ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو کسی تبدیلی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اگر کرداروں میں کسی کا ارتقاء رک جائے تو اسے ناول سے نکال دینا چاہئے۔ کیونکہ ناول اشخاص کے ارتقاء کا ہی نام ہے۔ اگر اس میں ارتقاء کمزور ہے تو وہ ناول کمزور ہو جائے گا کوئی کردار انجام میں بھی ویسا ہی رہے جیسا وہ پہلے تھا اور اس کے شعور اور جذبات کا ارتقا نہ ہو تو وہ ناکام کردار ہوگا۔'' ۷۰

متذکرہ بالا اقتباس پریم چند کے مضمون ''ناول کا موضوع'' سے ماخوذ ہے۔ جو پریم چند کی وفات سے پانچ سال قبل 1931ء میں شائع ہوا تھا دلچسپ تو یہ ہے کہ کرداروں سے متعلق اسی طرح کے ہو بہو خیالات عبدالقادر سروری نے 1927ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''دنیائے افسانہ'' میں لکھتے ہیں۔ یہاں ان کا اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

''اسی طرح اشخاص قصہ بھی سارے صفات سے متصف ناول نگار کے ذہن میں نہیں آ جاتے بلکہ ان کی خصوصیات بتدریج ظاہر ہوتی ہیں، ان میں ارتقا ہوتا ہے.... یہ ارتقا اس قدر چپ چاپ اور فطری ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو کسی تبدیلی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اگر اشخاصِ قصہ میں سے کسی کا ارتقاء رک جائے تو جس قدر ممکن ہو اسے قصے سے خارج کر دینا چاہیے۔ ایسا شخصِ قصہ حقیقت میں ناول کے حسین چہرے کے لیے ایک بدنما دھبہ ہے جس کو اعلیٰ سے اعلیٰ محاسن قصہ بھی نہیں دھو سکتے''۔ ۱ے

اس طرح پریم چند اپنے دوسرے مضمون ''شرر و سرشار'' 1920ء میں کردار نگاری کے تعلق سے بعینہ وہی باتیں بیان کرتے ہیں۔ جو چکبست نے اپنے مضمون رتن ناتھ سرشار'' 1904ء میں بیان کی تھی۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو ایک عرصہ کے بعد بھی ناول کے فن سے متعلق خیالات میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی یا ترقی رونما نہ ہوسکی اور نہ ہی ناول نگاروں اور نقادوں نے اس میں کوئی نیا پہلو تلاش کیا۔

ناول میں کرداروں کی آپسی گفتگو کے تعلق سے پریم چند لکھتے ہیں کہ ''ناول میں مکالمے جتنے زیادہ ہوں اور مصنف کے قلم سے جتنا کم نکلے اتنا ہی وہ خوبصورت ہوگا'' جملے کے دوسرے حصے میں لکھتے ہیں کہ مکالموں میں مصنف کے خیالات کا جہاں تک ہوسکے کم دخل ہو۔لیکن پہلے حصے سے اس طرح اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ ناول میں بیانیہ کے بجائے مکالموں کی کثرت بہتر نہیں شمار کی جاتی ہے۔

پریم چند کے نزدیک ناول اس کے خالق کی شخصیت، اس کے فلسفۂ حیات، اس کے کردار اور اس کے نتائج فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر مصنف پر امید ہے تو اس کے تخلیقات میں بھی امید کی کرن اور حوصلوں کی تازگی نمایاں ہوتی ہے اور اگر مصنف قنوطی ہے تو ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے کرداروں کو زندہ بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ پریم چند ناول میں طرز بیان کی دلکشی اور اثر انگیزی کو ضروری ٹھہراتے ہیں اور اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتے کہ مصنف الفاظ کی بازیگری کے ذریعہ قاری کو اس طرح وہم میں ڈالنے کی کوشش کرے کہ ناول میں کوئی حسن وخوبی پوشیدہ ہے یا اس میں ناول کا اعلیٰ مقصد مضمر ہے۔ پریم چند کے نزدیک ناول نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کے دل میں بھی وہی احساسات وجذبات پیدا کردے جو اس کے کرداروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔اور ہر قاری یہ بھول جائے کہ وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔

پریم چند کے نزدیک ناول نگاری کے لیے جس تخلیقی شعور کی ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ سب قدرت کی جانب سے عطا کی ہوئی صلاحیت اور فطری میلان سے ہی ممکن ہے۔ایک ناول نگار کو کسی طرح کی تعلیم یا مشق کی ضرورت نہیں۔اس مناسبت سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''ہمارے دل کے تہہ در تہہ جذبات عام حالات میں متحرک نہیں ہوتے، اس کے لیے ایسے واقعات کی تخلیق کرنی ہوتی ہے جو ہمارا دل ہلا دے، جو ہمارے دل کی گہرائی تک پہنچ جائے'' لیکن ناول کے مستقبل پر بھی ان کی کڑی نگاہیں تھیں ان کا ماننا تھا کہ مستقبل کے ناول میں تخیل کی اڑان کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ناول میں خیالی کردار کے بجائے اس دنیا کا جیتا جاگتا

کردار ہوگا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''لیکن آج ہم اکثر ایسے حالات اور واقعات پیدا کر دیتے ہیں جن کا انجام فطری ہونے پر بھی وہ ہوتا ہے جو ہم چاہتے ہیں ہم قصہ کو جتنا ہی فطری بنا لیتے ہیں اتنا ہی کامیاب ہوتے ہیں لیکن مستقبل میں ہمارا قاری اس سوانگ سے مطمئن نہیں ہوگا۔ یوں کہنا چاہئے کہ مستقبل کا ناول انسانی زندگی کی ہو بہو تصویر ہوگا۔ خواہ اس زندگی کا تعلق اعلیٰ اشخاص سے ہو یا ادنیٰ انسانوں سے۔ دراصل کردار کی عظمت یا برتری و کمتری کا فیصلہ ان مشکلات سے کیا جائے گا جن پر اس نے فتح پائی ہے۔ ہاں اسے اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے گا کہ ناول معلوم ہو۔''۲؎

مذکورہ اقتباس میں پریم چند نے ناول میں حقیقت نگاری کے متعلق جو پیشن گوئی کی تھی وہ بالکل سچ ثابت ہوئی۔ اور آج بھی کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ناول نے حقیقت کی بہترین ترجمانی کی۔
مثالیت پسند اور حقیقت پسند ناول سے متعلق اپنے مضمون ''ناول کا فن'' میں دونوں کے طریقہ کار پر ایک تفصیلی اور تقابلی گفتگو کرتے ہوئے حقیقت پسند مصنفین کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''حقیقت پسند کردار کو قاری کے سامنے اس کے اصلی روپ میں عریاں کر دیتا ہے۔ اسے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ برے چلن کا انجام برا ہوتا ہے یا اچھے چلن کا اچھا۔ اس کے کردار اپنی کمزوریاں اور خوبیاں دکھاتے ہوئے اپنی زندگی کا کھیل ختم کر دیتے ہیں دُنیا میں ہمیشہ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا نتیجہ بد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس بھی ہوا کرتا ہے۔ نیک سیرت آدمی دھکّے کھاتے ہیں۔ مصیبتیں سہتے ہیں، نامور ہوتے ہیں، جاہ و منصب حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت پسند تجربات کی

بیڑیوں میں جکڑا ہوتا ہے اور چونکہ دنیا میں بُرے کرداروں کی ہی اکثریت ہے، یہاں تک کہ صاف ترین کردار میں بھی کچھ نہ کچھ داغ دھبے رہتے ہیں، اسلئے حقیقت پسندی ہماری کمزوریوں، برائیوں اور بے راہ رویوں کی ہو بہو تصویر ہوتی ہے اور اسطرح حقیقت پسندی ہمیں قنوطی بنا دیتی ہے۔ انسانی سیرت پر سے ہمارا اعتقاد اٹھ جاتا ہے ہم کو اپنے گرد و پیش برائی ہی برائی نظر آنے لگتی ہے۔''۳۷

حقیقت پسندوں کا یہ نظریہ عام نظریہ سے بہت حد تک جداگانہ نظر آتا ہے۔ حقیقت پسندوں کا ماننا ہے کہ نیکی کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے اور برائی کا انجام ہمیشہ برا ہو ایسا ضروری نہیں۔ حقیقت پسند بہت سارے تجربات و مشاہدات کی بیڑیوں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کی تخلیقات آنکھوں کے سامنے گزری تمام برائیوں، کمزوریوں اور بے راہ رویوں کا بہترین مرقع ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں پریم چند یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''اس طرح حقیقت پسندی ہمیں قنوطی بنا دیتی ہے، انسانی سیرت سے ہمارا اعتقاد اٹھ جاتا ہے اور ہم کو اپنے گرد و پیش کی برائی ہی نظر آنے لگتی ہے۔'' ان کی نگاہ میں انسان جس طرح دجل اور مکر و فریب کی دنیا میں زندگی گزار رہا ہے اس کی دوسری پیدائش اسے مسرت اور خوشی دینے کے بجائے اور ہی زیادہ غم و مایوسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چنانچہ انسان ایک ایسی دنیا کا متلاشی ہوتا ہے جہاں اسے رنج و غم سے بالکل ہی نجات مل سکے اور ایسی عارضی دنیا اسے صرف مثالیت پسند ادب ہی سے مل سکتی ہے۔ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''اندھیری گرم کوٹھری میں جب ہم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، تو خواہش ہوتی ہے کہ کسی باغ میں نکل کر ترو تازہ ہوا کا لطف اٹھائیں۔ آدرش واد اس کمی کی تلافی کرتا ہے۔ وہ ہمیں ایسے کرداروں سے متعارف کراتا ہے جن کے دل پاک و صاف ہوتے ہیں، جن میں خود غرضی، اور بوالہوسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگر چہ ایسے کردار عملی زندگی

میں کامیاب نہیں ہوتے۔ لیکن .... اکتائے ہوئے انسانوں کو ایسے
شریف النفس کرداروں کے درشن سے ایک خاص مسرت حاصل ہوتی
ہے۔'' ۴؎

حقیقت پسند ادب جہاں کسی انسان یا انسانی زندگی یا پھر انسانی زندگی کے مسائل کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کر کے قاری کو حقیقت پسندی کی تلخ ہولناکی سے دوچار کرتا ہے۔ تو وہیں آدرش واد، ادب انسانی زندگی میں راحت کا سامان مہیا کرتا ہے اور تھکے ہوئے بے چین اور بے قرار جسم و ذہن کو سکون فراہم کرتا ہے۔ لیکن پریم چند آدرش وادادب میں بھی خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''کہیں ہم ایسے کرداروں کی تخلیق نہ کر بیٹھیں جو محض عقائد کی بے جان مورتیں ہوں کہ کسی دیوتا کا تصور اور اس کی آرزو مشکل نہیں لیکن اس دیوتا میں انسانی روح پھونکنا مشکل کام ہے۔'' اس مناسبت سے وہ دونوں دبستانوں کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''وہی ناول اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں جو حقیقت اور آدرش آمیز ہو گئے ہوں۔ اسے آپ آدرش وادی حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔'' دونوں ادب کے تقابلی مطالعہ کے بعد پریم چند کا جھکاؤ حقیقت پسندی کے مدِ مقابل آدرش واد کی طرف زیادہ نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ناول نگار کا کمال اس میں ہے کہ وہ ایسے کرداروں کی تخلیق کرے جو
اپنے حسن عمل اور طرز فکر سے قاری کی دلچسپیوں کو جذب کر لے۔ جس
ناول کے کرداروں میں یہ خوبی نہیں وہ دو کوڑی کا ہے۔'' ۵؎

پریم چند کے نزدیک ناول کو لے کر ادب کا مقصد صرف انسانی قدروں کا تحفظ اور اصلاح معاشرہ ہے۔ انھیں کلاسکی ادب میں بھی آدرش کی چھاپ دیکھائی دیتی ہے۔ وہ ادب کو صرف دل بہلانے کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کا بنیادی مقصد دل بستگی کے علاوہ روحانی اور دلی صفائی اور شائستگی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ایک جگہ تخلیق کار کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ادیب کا کام صرف قاری کا دل بہلانا نہیں ہے۔ یہ تو نقالوں،

مداریوں اور مسخروں کا کام ہے۔ ادیب کا منصب اس سے کہیں بلند ہے۔ وہ ہمارے راستے کا رہنما ہوتا ہے۔ وہ ہماری انسانیت کو بیدار کرتا ہے۔ ہمارے اندر اعلیٰ و ارفع خیالات پیدا کرتا ہے۔ ہماری نظر کو وسعت بخشتا ہے۔ کم ازکم اس کا آدرش یہی ہونا چاہئے اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کردار مثبت ہوں۔ جو حرص وطمع کے آگے سر نہ جھکائیں بلکہ ان پر غلبہ حاصل کریں۔''۶ے

پریم چند اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جو قاری کو حرص وطمع سے دور کرے، ان میں کمینہ پن، پست جذبات اور نفسانی خواہشات سے لڑنے کی قوت پیدا کرے۔ وہ ناول میں خواہشات کی بے راہ روی اور انسانی زندگی کے تاریک پہلوؤں کے تفصیلی بیان کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں۔ ناول جیسے موضوعات پر لکھنے والوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ایسے ادیب انسان کی داخلی کیفیت کو حق و باطل کی کشمکش اور بالآخر سچائی کی فتح کو نفسیاتی انداز سے پیش کرنے والے فنکار کی عظمت کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

ان کے نزدیک ادب کا معیار یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لیے کی جانی چاہئے اور فن کا منصب یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو مثلاً ان کے قول کے مطابق یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہی ادب قابل قدر ہوسکتا ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مظاہر پر رکھی جائے۔ محبت اور رقابت، غصہ اور حرص، عقیدت اور نفرت، تکلیف اور آسائش یہ سب ہماری مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ ان ہی کی جھلکیاں دکھانا ادب کا بنیادی مقصد ہے۔ اور بغیر مقصد کے تو کوئی ادبی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی۔''۷ے

اور یہاں وہ یہ بات بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جب کوئی ادب کی تخلیق کسی سماجی یا مذہبی عقیدہ کے لیے کرتا ہے تو وہ اپنے منصب سے پستی کی طرف چلا جاتا ہے لیکن ان کا آدرش وادی ذہن اس

بات کو پوری طرح قبول نہیں کرتا چنانچہ وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ آج جس طرح سے ٹکنیکل دور میں حالات بدل رہے ہیں اور نئے نئے خیالات ہمارے سامنے آرہے ہیں ایسے عہد میں فن پارہ میں تخلیق کاروں کے لیے اس آدرش پر قدم جمانا انتہائی مشکل ہے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:

آج کل ہندوستان کے ہی نہیں یورپ کے بڑے بڑے ادیب اور عالم بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ کسی نہ کسی 'ازم' کی اشاعت کررہے ہیں۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے ہماری تخلیق زندہ رہے گی یا نہیں۔ اپنے عقائد کا اظہار اوران کا تحفظ ہی ان کا نصب العین ہے۔''۸ے

اس دعوے کے بعد جو ناول نظریہ اظہار کے لیے قلم بند کی جاتی ہے وہ کسی طرح بھی ادبی وقعت کے لحاظ سے گھٹیا درجہ کا نہیں ہوتا ہے۔ اب دعویٰ کے ساتھ ساتھ دلیل بھی پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وکٹر ہیوگو کے، لے میز ریبل ٹالسٹائی کی بہت سی تصانیف اور ڈکنس کی کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جن میں کسی نہ کسی نظریہ اور عقیدہ کی اشاعت کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوصف وہ اعلیٰ درجے کی تخلیقات ہیں اوراب تک ان کی کشش کم نہیں ہوئی۔''۹ے

بہر کیف وہ ناول میں نظریے، عقیدے اور تصورات کے تدریجی ارتقاء کی التزام و انتباہ کے ساتھ حمایت کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ناول کا فن'' میں لکھتے ہیں:

''ناول نگار کو اس بات کی کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اس کے خیالات غیر محسوس طور پر قارئین تک پہنچیں۔ ان کی وجہ سے ناول کی روانی اور دلچسپی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو۔ ورنہ ناول بے کیف ہوجائے گا۔''۸۰ے

مذکورہ بالا بحث فکشن تنقید پریم چند اور اردو ناول کی تنقید کے بارے میں ان کی رائے اور نظریہ ہے جو

ناول اور ناول کی تنقید کی ایک فنی اور اموری بحث تھی۔ اب ہم یہاں پریم چند کے افسانے سے متعلق ان کا کیا کہنا تھا اور کیا نظریہ ہے اسکو حوالے کے ساتھ یکے بعد دیگرے پیش کریں گے ادب میں ان کا مرتبہ ایک مبتدی افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ہے اور اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے بھی وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں، انھوں نے اردو افسانوی ادب کو بعض ایسے مستحکم عناصر دیئے ہیں جو آج ان نو دہائیوں میں ارتقاء کے مختلف منازل طے کرنے کے بعد بھی ہمارے افسانوی ادب میں پوری آب تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارا موجودہ مختصر افسانہ پریم چند کی روایت سے یکسر مختلف نہیں۔ بدلتی ہوئی سماجی قدریں، صنفی ترقی اور انسانی ذوق کی تبدیلی کی وجہ سے افسانے نے مختلف روپ ضرور اختیار کئے ہیں مگر بقول پروفیسر قمر رئیس پریم چند کی روایت آج بھی کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے۔

یوں تو پریم چند نے ناول کے تعلق سے جو مضامین لکھے ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ ان کا احاطہ کیا جا چکا۔ چنانچہ میں ان کے ان مضامیں پر روشنی ڈالنا چاہونگا جو انھوں نے اردو افسانے پر لکھے ہیں یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ اگر پریم چند اردو افسانے کے معمار ہیں تو اردو افسانے کی بوطیقا کے مرتب بھی۔ کیونکہ انھوں نے جس عہد میں اردو افسانے پر تنقیدی گفتگو کی ہے یا اردو افسانے کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے خود یہی بات اہمیت کی حامل ہے افسانے کے فنی امتیازات کے حوالے سے اُن کے اِن خیالات کو ملاحظہ فرمائیں:

> ''اگر اس میں (افسانے میں) کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ کہتا ہوں۔۔۔۔
>
> آج کے افسانے اور ناول میں غیر فطری باتوں کی گنجائش نہیں۔ ان میں ہم اپنی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک فقرہ اور ہر کردار کو حقیقت کے جامہ میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس میں جو کچھ بھی لکھا جائے وہ اس طرح ہو کہ معمولی ذہن کا آدمی بھی اسے

حقیقت تصور کرے۔

آج کل افسانہ کا مفہوم بہت وسیع ہوگیا ہے۔۔۔۔اور تو اور اس کی اصل غایت اتنی غیر واضح ہوگئی ہے کہ اب اس میں کسی خاص مقصد کا وجود خامی تصور کیا جانے لگا ہے۔وہ کہانی سب سے ناقص سمجھی جاتی ہے جس میں مقصد کا سایہ بھی نظر آئے۔

یہاں تو اختصار ہی انتہائے کمال ہے۔مختصر افسانہ دُھر پد کی وہ تان ہے جس میں فن کار محفل شروع ہوتے ہی اپنی تمام صلاحیتیں دکھا دیتا ہے۔۔

موجودہ افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی فطری مصوری کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے۔اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تجربات ہی تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں۔۔۔

اس لیے ہم افسانہ ایسا چاہتے ہیں جو مختصر ترین الفاظ میں کہا جائے۔اس کا ایک جملہ،ایک لفظ بھی غیر ضروری نہ ہو۔ان کا پہلا جملہ ہی دل آویز دلکش ہو،اختتام تک ہمیں منہمک کئے رکھے اور اس میں کچھ حلاوت ہو، کچھ تازگی ہو، کچھ وسعت ہو۔'' ۸۱؎

مندرجہ بالا آخری دو اقتباس ان کے صرف ایک ہی مضمون ''مختصر افسانے کا فن'' سے اخذ کئے گئے ہیں۔مزکورہ بالا پانچویں متن میں دراصل انھوں نے چابکدستی سے کام لیا ہے۔ارباب فکر و نظر کو اپنی طرف مائل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے جو ادب برائے ادب کو ہی صحیح نقطۂ نظر تصور کرتے ہیں۔پریم چند کے ان خیالات کی جھلک روز مرّہ کے افسانے کی تنقید میں بھی مل جاتی ہے۔پریم چند نے افسانے کا فنی سرمایہ حقیقت کی تازگی، تحلیل نفسی اور اختصار کو بتایا ہے۔

پریم چند نے افسانے کی بنیادی صفت ایک تاثر، ایک خیال اور ایک کیفیت کی پیشکش میں بتاتے ہیں کہ اس تاثر یا خیال کو پورے افسانے میں اس طرح جلوہ گر ہونا چاہیئے کہ پورا افسانہ ایک اکائی بن جائے۔ان کا ایک مضمون ''مختصر افسانے کا فن'' کے عنوان سے ہے۔ اپنے مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''مختصر افسانہ کا مقصد مکمل انسان کی مصوری نہیں بلکہ اس کی شخصیت کا ایک رخ دکھانا ہوتا ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے ہمارے افسانے سے جو نتیجہ حاصل ہو وہ مقبول عام ہو اور اس میں کچھ باریک نکتے بھی ہوں۔'' ۸۲؎

اس ایک تاثر اور ایک خیال کو پیش کرنے کے لیے مخصوص واقعات اور کردار کا ہونا ضروری ہے۔وہ متذکرہ بالا مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ناولوں کی طرح مختصر افسانے بھی بعض مخصوص الواقعات، اور بعض مخصوص الکردار ہوتے ہیں۔مخصوص کردار، افسانوں کا درجہ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔'' ۸۳؎

مگران کے خیال میں کردار افسانے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ افسانے کی عموماً بہترین تنقید بھی ہے۔واقعات کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کردار کی ذہنی کیفیت کو واضح کرنے کی غرض سے واقعات معرض اظہار میں لائے جاتے ہیں۔مندرجہ ذیل کا اقتباس دیکھئے:

> ''اب ہم افسانے کی قدر و قیمت واقعات سے نہیں کرتے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ کردار اور ان کی ذہنی رفتار سے واقعات پیدا ہوں۔ واقعات کی علیحدہ کوئی اہمیت نہیں رہی۔ان کی اہمیت صرف کرداروں کے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ۸۴؎

افسانے کی تنقید سے متعلق کردار کے تحت ان کا جو اچھوتا نظریہ ہے وہ یہ کہ کرداروں کے ذہن تک رسائی مصنف کے لیے ضروری ہے۔اس کے بغیر وہ کردار کا صحیح روپ یا خاکہ پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔

وہ اپنے مضمون ''میرے بہترین افسانے'' میں یوں لکھتے ہیں:

''واقعہ ہی موجودہ افسانہ یا ناول کا اہم جزء نہیں ہے تو ناول کے کرداروں کا ظاہری رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی ہم مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہم ان کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔اور جو مصنف انسانی فطرت کے رموز و اسرار کھولنے میں کامیاب ہوتا ہے۔اسی کی تصنیف مقبول ہوتی ہے۔۸۵؎

وہ کہانی کا مقصد اگر چہ دل بہلانا اور تفریح کا ذریعہ مانتے ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ افسانے میں قاری کے جذبات اور احساسات کو متحرک کرنے کا بھی ذریعہ بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانے میں انسانی اوصاف یعنی نیکی ،صداقت قدرتِ انصاف کے عناصر ضرور ہوں تا کہ قاری یا سامعین اس کو قبول کر کے انسانی صفات کا مرکب بن سکے۔بہر کیف وہ اپنے مضمون ''میرے بہترین افسانے'' کے درمیانی صفحہ پر ایک پیراگراف میں یوں رقم طراز ہیں:

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کہانی کا سب سے بڑا مقصد تفریحی قیمت ہے لیکن ادبی تفریح وہ ہے جس سے ہمارے نازک ذہنی احساسات کو تحریک ملتی ہے۔ہم میں صداقت، بےلوث خدمت،انصاف اور نیکی کا جو غیر ملوث عنصر ہے وہ جاگ اٹھے۔درحقیقت آدمی کی خواہش یہی ہے کہ وہ خود میں اپنے آپ کو مکمل صورت میں دیکھے۔ ہمہ گیری انسانی ذہن کی فطری تمنا ہے۔''۸۶؎

انھوں نے خاص طور پر اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مختصر افسانے میں جو فضا اور ماحول پیش کیا جائے۔اس میں عام انسانی جذبات کو اپیل کرنے کی صلاحیت موجود ہو، ورنہ غیر مانوس اور اجنبی ماحول سے بھر پور اثر نہ ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔پھر وہ اپنے دوسرے مضمون ''مختصر افسانے کا فن'' کی طرف رجوع ہو کر افسانے کے فن پر یوں لکھتے ہیں:

''یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے افسانے سے جو نتیجہ حاصل ہو وہ مقبولِ عام ہو۔۔۔۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ ہمیں اسی بات میں حظ حاصل ہوتا ہے جس سے کچھ نسبت ہو۔'' ۸۷

ان کے خیال میں افسانے کا کام لطیف جذبات اور حسین خیالات وغیرہ پروان چڑھانا اور اس میں جوش ولولہ پیدا کرنا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''مختصر افسانہ کا فن'' کے آخری ورق میں لکھتے ہیں:

''افسانہ نگار صرف دل کش منظر دیکھ کر افسانہ لکھنے نہیں بیٹھتا۔ اس کا مقصد صرف عام حسن کی عکاسی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی ایسا محرک (جذبہ، جوش، ولولہ) چاہتا ہے جس میں حسن کی جھلک ہو اور اس کے ذریعہ وہ قاری کے لطیف جذبات اور حسین خیالات کو فروغ دے سکے۔'' ۸۸

پریم چند مختصر افسانے کی کامیابی کا تمام تر انحصار نفسیاتی نکات میں مضمر بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو مختصر افسانہ کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہوگا وہ اعلیٰ ترین سمجھا جائے گا۔ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''اعلیٰ ترین مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جائے۔'' ۸۹

وہ افسانے کے لیے تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی فطری عکاسی کو مقصد بتاتے ہیں۔ ان کی نظر میں مختصر افسانہ میں تخیلات کی کارفرمائی کم اور تجربات زندگی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اپنے مضمون ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں'' ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ مگر افسانے میں نفسیاتی کلائمیکس موجود ہوں، تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو، میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔۔۔۔ ان میں کلائمیکس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی

نفسیاتی۔۔۔۔جب کوئی ایسا موقعہ آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔۔۔۔یہ ایک ذہنی امر ہے۔سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی، اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔تاثیر لاتی ہے۔‘‘ ۹۰

مذکورہ بالا عبارت میں پریم چند کی تحریر وتقریر میں مختصر افسانے کی اصطلاح جس معنی میں استعمال ہوتی ہے اس سے مراد وہ کہانی نہیں، جو محض مختصر ہو بلکہ ایک مختصر قصہ ہوتا ہے جس میں ایک تاثر یا خیال کی کار فرمائی اس طرح کی گئی ہو کہ پورا مختصر افسانہ ایک اکائی بن جائے اور مختصر افسانے میں عام انسانی جذبات کی عکاسی ہونا بے حد ضروری ہے۔ساتھ ہی ساتھ ڈرامائی کیفیت لازمی جز ہے افسانے میں کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہو۔مختصر افسانے میں واقعات سے زیادہ کرداروں کی اہمیت مسلم ہے۔کیوں کہ کرداروں کے ذریعہ قاری کے ذھن تک اعلیٰ انسانی اوصاف کی پہچان کرائی جاسکتی ہے۔افسانہ مشاہدات و تجربات پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں نقطہ عروج کا ہونا ضروری ہے۔اس میں شاعرانہ کیفیت پیدا کی جائے یعنی تاثیر اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے مصنف حقیقت کے ساتھ ساتھ تخیلات کی مدد سے کچھ اضافہ کرسکتا ہے۔افسانے میں قاری کے اندر جوش و ولولہ لطیف جذبات پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہو۔افسانہ نگار لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوتا کہ ڈرامائی کیفیت، تاثیر اور ادبی خوبیاں راہ پاسکیں۔یہی افسانہ کی بہترین تنقیدی نظریہ ہے جو پریم چند کے مضامین میں حوالے کے ساتھ ہمیں دستیاب ہوئے یہی افسانہ کے فن سے متعلق اچھی تنقیدی مثال ہے۔پریم چند کی ادبی زندگی کی شروعات مضمون نویسی ہی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ پریم چند کی ادبی شخصیت کی تفہیم ان تنقیدی مضامین کے بغیر معلق ہوگی۔ بالخصوص انھوں نے فکشن کے تعلق سے جو مضامین لکھے ہیں۔ان کے فکشن کی تنقید کے باب میں خاص

معنویت اور اہمیت کے ساتھ بیش بہا تحفہ بھی ہے۔ جو افسانے کی تنقید میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے۔

مختصر افسانے پر اگر چہ پریم چند کے بعد بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پریم چند کے خیالات میں تازگی اور ان کی تنقید میں جو پختگی اور علمیت کا احساس ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تندرست اور فربہ نظر آتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ رجحان سے قطع نظر ہو کر مختصر افسانے کی تفہیم اور تشریح کے متعلق ان تمام مسائل پر گفتگو کی جانی چاہیے۔ جن مسائل کو پریم چند نے موضوعِ بحث جانا۔ پریم چند نے افسانہ کی جڑوں کی تلاش افسانہ کی تعریف اور اس کی ڈائیورسٹی، ماخذ و تقسیم، پلاٹ، کردار، کرداروں کی قسمیں، گفتگو، زبان و بیان، منصب ومقصد ناول سے اس کے فرق اور افسانے کا آغاز و اختتام کے امتیازات پر اختصار سے لیکن تسلی بخش گفتگو کی ہے اور ناول اور افسانہ کا فن بھی یہی ہے۔

اردو فکشن کی تنقید سے متعلق پریم چند کے عہد میں ایک نام نیاز فتح پوری کا ہے۔ نیاز کے افسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن افسانوں سے متعلق تنقیدی مضامین بہت کم ملتے ہیں۔ لہذا ان کے افسانوں کے دیباچے تنقیدی رائے سے خالی نہیں جیسے ''نگارستان''، ''جمالستان''، ''حسن کی عیاریاں'' اور دوسرے افسانے ''نقاب اٹھ جانے کے بعد'' اور 'مختاراتِ نیاز'' ان کے اہم افسانوی مضموعے ہیں ان کی افسانہ نویسی دراصل تنقیدی رائے سے خالی نہیں۔

1925ء کے لگ بھگ نیاز نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا۔ نیاز کی ادبی حیثیت پہلے ہی سے مسلم تھی۔ وہ اپنی افسانہ نگاری اور انشاء پردازی کی وجہ سے ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ نیاز مشرقی علوم پر عبور رکھتے تھے اور مغربی ادبیات سے بھی واقف تھے ان کی تنقید اور افسانہ نگاری پر پیٹو، آسکر وائلڈ کے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انھوں نے مغرب کے ادیبوں سے اپنا چراغ جلایا تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ کیونکہ انھوں نے ان ادیبوں کے نظریات پر ہی اپنی تنقید کی بنیاد رکھی۔ ان کے مضامین جابجا ان ادیبوں کے حوالے سے ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ مغرب کے رومانی نقادوں کے دبستاں سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ پاتے ہیں۔

نیاز کا تنقیدی سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن ان کی اہمیت مسلم ہے۔ 'نگار' کے عام و خاص شماروں

کے تنقیدی مضامین مختلف شعراء پر تنقیدی نظر اور شعری مجموعوں اور کتابوں پر ان کی رائے سے نیاز کے تنقیدی شعور اور اصولوں کا پتہ چلتا ہے۔یہی مضامین بعد میں انتقادیات اور مالہٗ و ماعلیہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

نیاز فتح پوری نے فکشن کے تنقید کے بارے میں بالخصوص ناول کے حق میں اپنی زبانی کچھ بیان نہیں کیا لیکن جب ان کا نام کہیں ناول سے متعلق آتا بھی ہے تو جمالیاتی ناول نگاروں میں نیاز کا نام پہلے ہمارے ذہن میں آتا ہے۔اردو میں جمالیاتی تحریک مغرب کے توسط سے آئی ہے۔یہاں جمالیاتی، رومان پسندی، اپنے دور کے فرسودہ خیال اور روایتی نظام سے بے اطمینانی کے اظہار کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔نیاز اس دنیا کو چھوڑ کر ایک خیالی دنیا میں پناہ لینا چاہتے تھے اور وہ فطری طور پر جمال پرست تھے۔اور حسن کی پرستش ان کا دین اور ایمان تھا۔نیاز نے اپنے ناولوں میں خالص رومانوی جمال پرستی پیش کی۔سماجی پس منظر سے قطعاً منہ موڑ لیا۔اسی ماحول میں نیاز نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی اسی دور میں فکشن کی تنقید سے متعلق تنقیدی نظریہ بھی سامنے آجاتا ہے۔نیاز کا مزاج ابتدائی دور سے ہی حسن پرست وعشق کے ماحول سے مناسبت رکھتا تھا۔ نیاز اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا میں افسانہ سے متعلق ان کا یہ نظریہ ملاحظہ ہو:

> ''افسانہ میں سیاسی اور سماجی پس منظر، سو اس کا خیال آپ کو 1959ء میں ہونا چاہیئے، جب کہ انسان سیاسی و سماجی حیوان کے سوا کچھ بھی نہیں۔اگر آج سے پچاس سال قبل کی دنیا میں آپ ہوتے تو شاید یہ سوال آپ نہ کرتے جب کہ انسان محض انسان تھا۔بے سوچے سمجھے انسان تھا۔اور ایسا انسان خالص رومانی انسان ہی ہوسکتا ہے.....۔بہر حال اس میں شک نہیں کہ زمانہ اس رنگ کے افسانوں کے لیے ناموزوں نہ تھا۔اس کا ایک سبب یہ تھا کہ لوگ قدیم طرز تحریر سے کچھ اکتا سے گئے تھے۔اور وہ کچھ نئی باتیں نئے لب ولہجہ میں سننا چاہتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سیاسی وسماجی حیثیت سے یہ دور ایک برزخی قسم کا دور

تھا اور ملک میں اس وقت انقلاب کی دولہریں ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ایک سیاسی، دوسری سماجی انقلاب کی لہر اوران دونوں نے اپنا اپنا کام کیا۔ ایک نے ملک آزاد کرایا دوسرے نے ترقی پسند کو جنم دیا۔''۹۱

مندرجہ بالاعبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نیاز نہ تو سیاست کے مردِ میداں تھےاور نہ فکشن کے بڑے نقاداور نہ ادب کے لیے وہ سیاسی،سماجی اصطلاحات میں سوچنے کے عادی تھےانھوں نے اپنے کوصرف ادب کی رنگین دنیا تک محدود رکھا تھا۔اس میں شک نہیں کہ نیاز کی غیر افسانوی تحریروں نے سیاست اور ادب کے میدان میں اپنے عقلی نقطہ نظر کی بدولت بہت زیادہ اہمیت حاصل کی۔ اور یہی تحریریں تاریخ ساز ثابت ہوئیں۔لیکن نیاز نے خود فکشن کی تنقید کے بارے میں اپنا زرخیز قلم اٹھانے میں کوتاہ ثابت ہوئے۔لیکن خود اپنے افسانوں میں عقلی نقطہ نظر سے کام نہیں لیا۔اور عقل کی لگام جذبات کے حوالے کردی۔ نیاز نے افسانوں کے لیے ایک معیار مقرر کیا۔اوراسی معیار سے مطابق انھوں نے افسانے لکھے جس سے ان کا نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔وہ افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں آپ کو بتاؤں کہ افسانے کے ضروری اجزاء کیا ہیں۔ایک کسی واقعہ کسی کردار، سیرت کو نمایاں کرنا۔ اسکو انگریزی میں characterisation کہتے ہیں۔ پلاٹ کو ایسے اجزاء میں تقسیم کرنا کہ پڑھنے والے کوایک سے زائد خلاء خود اپنے ذہن سے پر کرنا پڑے۔ چوتھے ہلکا کا سا مزاج،خواہ وہ الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے۔ اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کرے تھوڑا سا تمثیلی رنگ Touch Dramatic دے دیا گیا۔تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہوجائے گی۔کسی ایک مسئلے پر صفحات کے صفحات رنگین کردینا خلافِ آئین افسانہ نگاری ہے۔ یہ درست ہے کہ بہترین افسانے وہی ہوتے

ہیں۔ جن میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ
اس کو ایک مستقل عذاب کی طرح سر پر نازل کر دیا جائے کہ ایک
خاندان کی تباہی دکھانے پر آئے تو باپ کو ہیضہ میں مبتلا کر کے فنا کر دیا
، بھائی کو سانپ سے ڈسوایا اور بہن کو کنوئیں میں ڈھکیل کر ختم کر دیا۔۹۲

افسانے کے تنقید کے تعلق سے ان کا نظریہ ان کے صرف ایک مضمون ''افسانہ پر نیاز کی رائے'' میں ملتا ہے۔ جو رسالہ نگار نیاز نمبر 1963ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس مضمون کی حیثیت افسانہ کی تنقید اور افسانے کے سلسلے میں قدرِ تفصیل سے بحث کی ہے۔ مضمون میں نیاز نے افسانہ کے فن بالخصوص پلاٹ، کردار، اور وحدتِ تاثر سے اصولی بحث نہیں کی ہے۔ افسانہ کی اہمیت اور قدر و قیمت کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین سے ایک انٹرویو میں افسانہ سے متعلق نیاز فتح پوری کہتے ہیں:

''اب سے پچاس سال پہلے میں جس دور سے گذر رہا تھا وہ دراصل
افسانہ نویسی کا نہیں بلکہ افسانہ خیزی کا دور تھا۔''۹۳

مذکورہ بالا متن کی حیثیت افسانہ کی تنقید سے متعلق ایک عمومی رائے سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس عہد کے علمی حلقوں میں داستان اپنے مافوق الفطرت واقعات اور سائنسی صداقت کے فقدان کے باعث قابلِ اعتنا سمجھی جانے لگی تھی۔ اور انسانی جدو جہد اور فہم و شعور پر مبنی قصوں کی پذیرائی عام ہو چکی تھی۔ اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ افسانہ صرف انشاء پردازی کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کو پیش کرتا ہے۔ نیاز افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس سے قبل افسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے
کا اب وہ علمی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا
جس کے لیے فرصت درکار تھی اور اب معاملہ حقائق کا ہے جن کے لیے
خاک چھاننا ضرور ہے۔''۹۴

یہ احساس انھیں شدید تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور اس احساس کے نتیجے میں ان کی تنقیدی

بصیرت کھل کر قفلِ مہر ثبت کرتی ہے۔اور یہی سے نیاز کی افسانہ نگاری بھی جنم لیتی ہے۔جس سے ایک نیا موڑ پیدا ہوگیا۔اگر چہ ان کے افسانے پریم چند کی طرح زندگی کی ترجمانی نہیں کرتے۔لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کو مدِ نظر رکھ کر اصلاحی اور معاشرتی افسانے بھی لکھے نیاز کی افسانہ نگاری کی شہرت کی بنیاد نگارستان اور جمالستان ہے۔اور اس میں بھی نیاز کے انشائیہ اسلوب کو بہت بڑا دخل ہے۔اگر ان افسانوں میں نیاز کا اسلوب نمایاں نہ ہوتا تو یہ محض معمولی افسانے بن کر رہ جاتے۔نیاز کی افسانہ نگاری کا دور 1910ء سے شروع ہوکر 1920ء پر ختم ہوجاتا ہے۔کیونکہ اس وقت افسانہ بحیثیتِ صنف ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکا تھا جس کا اعتراف خود نیاز نے ایک خط میں کیا ہے اور وہ افسانے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اب ہماری اور آپ کی افسانہ نگاری کا دور ختم ہوا۔پچھلے چند سال کے اندر جو انقلاب اس فن میں ہوا ہے اس کو نبھانے کے لیے جس آزاد روی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے وہ ہمیں آپ کو نصیب نہیں۔اس قبل افسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا''۹۵

نیاز کا یہ اعتراف خود تنقید کی اچھی مثال ہے۔جس وقت نیاز نے افسانے لکھنے شروع کیے وہی افسانے کی تنقید اور اردو کا افسانوی ادب تخیل پرستی کے اثر میں تھا۔نیاز اور اس کے رومان پرست معاصرین نے اس رنگ کو ہم عصر مسائل سے ہم آہنگ کیا،اور انھوں نے تخیل پرستی کو طلسماتی داستانوں سے نکال کر حسن وعشق تصورات واقدار کی دنیا پر منطبق کیا۔ان کے یہاں زندگی کے مسائل کا احساس تو ہے۔مگر اس کا ہم عصر شعور کم ہے۔یہی تنقید کی اچھی مثال بھی ہے۔اور یہاں سے ان کے نظریات کی وضاحت بخوبی ہوجاتی ہے کہ وہ افسانے کو ایک ایسا خیال انگیز قصہ تصور کرتے ہیں جس سے لطف اندوز ہوا جاسکے۔ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''افسانہ ایک ایسا قصہ ہوتا ہے جس میں رومانی جذبات کی عکاسی بھرپور تاثر کے ساتھ لطیف پیرائے میں کی جاسکے''۹۶

انھوں نے افسانے کے لیے اسلوب یا طرزِ اظہار کو خاص اہمیت دی ہے اور وہ بھی شاعرانہ اسلوب جن مین تخیلات کی دنیا سے زیادہ سروکار رہو اور جس کی فضا میں قاری ایسا محو ہو جائے کہ اپنے اردگرد کی دنیا اور ماحول کو فراموش کر بیٹھے لکھتے ہیں:

''طرزا ظہار کی افسانہ نگاری میں بڑی اہمیت ہے۔ ایک ذریعہ افسانے کی فضا خوشگوار اور دل پسند بنائی جاتی ہے۔ اور قاری کو اس کی اصل زندگی سے نکال کر خیال کی دنیا میں لایا جاتا ہے۔''۹۷

انھوں نے پلاٹ کے بارے میں جو تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ افسانہ میں پلاٹ کی موجودگی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں بلکہ ایک تاثر یا خیال اور انداز بیان کو اہمیت دیتے ہیں:

''پلاٹ افسانے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا افسانہ نگار کی توجہ اسلوب بیان پر ہونا چاہیے تا کہ وہ ایک تاثر کو قائم رکھ سکے۔''۹۸

نیاز فتح پوری کی اس عبارت سے مختصر افسانے سے متعلق تنقیدی نظریہ اور تنقیدی امور سامنے آجاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ افسانہ ایک قصہ ہوتا ہے جو مختصر ہو اور جس میں رومانی جذبات اور خیالات کی عکاسی کی جائے۔

۲۔ افسانہ صرف خیال سے لطف اندوز ہونے کی چیز ہے۔

۳۔ پلاٹ افسانے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

۴۔ لطیف اظہار بیان ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ ہی افسانے کو موثر اور پرکشش بنایا جاتا ہے۔

پریم چند کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ مایۂ ناز ادیب، صاحب طرز انشاء پرداز، متعدد فکر و خیال، رجحانات اور مختصر افسانہ کے بنیاد گزار ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار، اس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے بانی، اس کے صدر، ترکی زبان کے معلم و مترجم اور اصلاحی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے اردو زبان میں ادبِ لطیف اور نثری شاعری کی راہیں

ہموار کیں۔ ''سفرِ بغداد کے نام'' اردو کا پہلا رپورتاژ لکھا۔ اپنی نظموں اور افسانوں میں ترقی پسند، سیاسی اور سماجی شعور کو جگہ دی اور نظم ونثر میں نئے نئے تجربات کیے۔ فکشن کے فن پر باضابطہ تنقیدی مضامین لکھنے کی ابتدا کی زبان سلیس استعمال کرنے اور انسانی نفسیات کے موضوع کو انھوں نے متعارف کرایا۔ لیکن فی الحال یہاں ان کی فکشن سے متعلق کیے گیے تنقید پر بحث مقصود ہے۔

سجاد حیدر یلدرم رومانی افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے ہم عصر ترکی ادب کی رومانی جذبات نگاری سے اثر قبول کیا۔ بعد میں اس کی اتباع کی گئی۔ اور یہ تخلیقات ادب لطیف کہلائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں رومانی اسلوب کے بالمقابل راست بیانیہ بھی ملتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے پہلی بار ناول کے فن پر باضابطہ مضمون لکھا۔ اپنے مضمون ''ناول نویسی'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''ناول نویسی کے برابر شاید لٹریچر کی کوئی شاخ ذلیل نہیں خیال کی گئی۔ اگر اُردو کی فسانہ نگاری کے متعلق عام طور پر اچھی رائے نہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لے کہ حقیقتاً اردو کے اکثر ناول کسی تعریف کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ انگلستان میں بھی جہاں عمدہ بلکہ عمدہ ترین قصّوں کی اگر افراط نہیں تو کمی بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی ایک کثیر گروہ ایسے لوگوں کا موجود ہے جو ناول نویسوں کو نہایت کم وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''[99]

مذکورہ مضمون میں ناول کی مقبولیت کے اسباب اس کی فنی خصوصیات اور اس کی مختلف قسموں سے بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں ناول کے فن کے متعلق مصنف کے خیالات ونظریات اور ناول کے اجزاء و عناصر اور اس کے موضوع ومواد کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اس صنف کی ماہیت ومقصود کے تعین کی کوشش کی۔ یہ ان کا امتیازی پہلو ہے کہ افسانوی ادب کی تنقید اپنی ابتدائی منزل کی طرف گامزن تھی اور ایسے وقت میں انھوں نے ناول کے متعلق اپنی رائے پیش کی۔ سجاد حیدر یلدرم ایک جگہ ناول نگار کی ذمہ داری اور ناول کے قاری سے متعلق رقمطراز ہیں:

''مگراس میں (ناول میں) اثر ڈالنے کے لیے ہر ناول نویس کو قدم قدم پر ایک بہت بڑی بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی مافوق العادت واقعہ قصہ میں نہ بیان کیا جائے ...... لیکن موجودہ زمانہ کا قصہ پڑھنے والا ایک عجیب الخلقت شخص ہیوہ جب قصہ پڑھنے بیٹھتا ہے تو اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ کل قصہ محض فرضی ہے، لیکن اس فرضی فسانے کو اس شغف اور شوق سے پڑھتا ہے گویا اس کے خاندان کی تاریخ ہے اور اگر کہیں بدنصیب ناول نویس اس قصہ میں بھُولے سے ایسی بات لکھ گیا جس کا ہونا اصلی زندگی میں پڑھنے والے کے نزدیک محال ہے تو فوراً نہایت غصّہ سے کتاب پھینک دے گا اور یہ کہے گا کہ مصنف نے ہمارا وقت ضائع کیا۔'' [۱۰۰]

داستانی عہد میں عجیب الخلقت قصہ ہوا کرتا تھا جو قاری یا سامع کو حیرت وتجسّس میں ڈالتا تھا۔ لیکن ناول کے آغاز کے بعد قاری عجیب الخلقت قرار پایا کہ وہ بیان کردہ واقعات کو منطقی دلائل اور ہر چیز کو سائنسی صداقت کی میزان پر تول کر مطمئن ہوتا ہے۔ یلدرم نے ناول کی کئی قسمیں بیان کی ہیں جن میں اوّل اور اعلیٰ قسم یہ ہے۔

''قصے کی سب سے اعلیٰ قسم وہ مانی گئی ہے جن میں مصنف انسانی فطرت پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالتا ہے اور پھر انسانی جذبات اور انسانی افعال کا ایسا بے نظیر نقشہ کھینچتا ہے، جو اس کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے اور جسے لوگ حیرت زدہ ہو کر الہام کا خطاب دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ انسانی فطرت کا ایسا مطالعہ کرنے والا صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے۔'' [۱۰۱]

ہمارے ناقدین نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی اور شاعری کو ہی ایک اعلیٰ ترین مانتے تھے لیکن

یلدرم نے اس دور میں بھی افسانہ نگار کو الہامی کیفیت سے دوچار ہونے والا بتایا تھا۔اقتباس کا آخری جملہ عام اور اعلیٰ فن کار کے مابین امتیاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ دوسرے درجے پر وہ مقصدی یا افادی ناول کو رکھتے ہیں۔اپنے مضمون 'ناول نویسی' میں لکھتے ہیں:

''دوسری قسم کے قصے وہ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی خاص اخلاقی سبق یا تعلیم دینی مقصود ہوتی ہے۔اس قسم میں کم و بیش کل ناول آسکتے ہیں۔اس لیے کہ ہر قصے میں مصنف کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور دکھانا چاہتا ہے۔اگر چہ جب وہ قصہ لکھنے بیٹھتا ہے تو کوئی خاص اخلاقی تعلیم اس کے پیش نظر نہ ہو۔تاہم اس میں زیادہ تر وہ ناول شامل کرنے چاہئیں جو بالقصد کسی خاص غرض کے لیے لکھے گئے ہوں۔''[۱۰۲]

یعنی ناول میں کوئی نہ کوئی نقطہ نظر یا فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔تیسرے اور چوتھے درجے پر وہ علیٰ ترتیب تاریخی اور جاسوسی ناولوں کو رکھتے ہیں اور آخر الذکر کی عوامی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تیسری قسم تاریخی قصوں کی ہے۔اس میں مصنف کسی خاص تاریخی واقعے کو لے کر کچھ کمی و بیشی کے ساتھ افسانے کے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔پھر سراغ رسانی اور اسرار کے قصے ہیں،ان کی تعداد ہر جگہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور نوجوان اور عام لوگوں کو یہ بہت پسند آتے ہیں۔''[۱۰۳]

یلدرم کے مذکورہ مضمون کو پڑھ کر پریم چند نے بھی اعادہ کیا تھا۔لیکن وہ اپنے زمانے میں جاسوسی ناولوں کے اضافے کے خوف سے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں۔ان کے 1931ء کے ایک مضمون ''ناول کا موضوع'' سے یہ اقتباس دیکھیے:

''لیکن آج کل بدکاری،قتل، چوری اور ڈاکہ زنی سے بھرے ناولوں کا جیسے سیلاب سا آگیا ہے۔ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی دور نہ تھا جب

ایسے بے مصرف ناولوں کی ایسی بھرمار رہی ہو۔ جاسوسی ناولوں میں آخر
اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ اب پہلے
سے زیادہ گناہ آلود ہو گئے ہیں؟ ۔۔۔۔اس سے یہ تو ظاہر ہی ہے کہ
انسان میں حیوانی صفات اتنی توانائی حاصل کرتی جا رہی ہیں کہ اب اس
کے دل میں نرم و نازک جذبات کے لیے جگہ ہی نہیں رہی۔''[۱۰۴]

اس دور میں قارئین ایسے ناولوں کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے جن میں حیرت، استعجاب، مہمات، معرکہ آرائی وغیرہ ہوں۔ سنجیدہ ادب کے بجائے جاسوسی ناول، رینالڈس کے ترجمے یا پھر تاریخی قصے پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آچکا تھا جس کی سوچ وفکر اور پسند ناپسند اردو کے روایتی قارئین سے مختلف تھا۔ سجاد حیدر یلدرم اس وقت کے انگریزی اور اردو ناولوں کی روشنی میں پلاٹ سے متعلق اپنے مضمون ''ناول نویسی'' میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

''ہمارے ناولوں میں پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہوتی ہے۔ ناول کے لیے
عشق اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے جان۔ عشق کے بعد جنگ کا
نمبر ہے۔ میں نے انگریزی میں ایسا کوئی ناول نہیں دیکھا جس میں عشق
کا عنصر موجود نہ ہو اور نہ اس قسم کے ناول کا کوئی ذکر سنا۔ یہ بات
انگریزی ناول نویسی کے علوم متعارفہ میں سے ہے کہ بغیر عشق کی چاشنی
کے کوئی ناول، ناول کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ انگریزی ہی پر کیا
موقوف ہے، خود اردو کے قصوں میں عشق داخل کیا جاتا ہے، لیکن ایک
بہت بڑا فرق انگریزی اور اردو کے قصوں میں یہ ہے کہ ان میں جب
عشق کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے اور اردو میں از
سرتاپا بے جوڑ۔ پرانے قصوں میں تو کوئی شہزادہ چھت پر سوتا ہوتا تھا اور
عاشق ہونے کے لیے کوئی پری اُڑ کر آتی تھی، یا....''[۱۰۵]

یلدرم کے نزدیک اس وقت کے ناولوں کے پلاٹ میں سب سے بڑی کمی عشقیہ واقعات میں غیر فطری شمولیت ہے۔ناولوں کو زندگی کا ہو بہو عکاس کہا جاتا تھا تو اس وقت کا معاشرہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا تھا کہ ان ناولوں میں اتنی بے جا عشق کی شمولیت کی جائے۔ کیونکہ اس معاشرہ میں عشق کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔اس دور میں دو طرح کے رویئے نظر آتے ہیں۔اوّل وہ جس کے سجاد حیدر یلدرم ہیں۔یعنی عشق کا مہمل یا غیر فطری بیان۔دوسرا افسانے میں بیانِ عشق کا سرے سے اخراج یلدرم آخرالذکر رویے سے متعلق طنزاً لکھتے ہیں:

''میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا سب سے بڑا کمال اسی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اردو کے پہلے قصہ نویس ہیں،جن کی غائر نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ ہندوستانی سوسائٹی یا (زیادہ صحیح طور پر) ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں شادی سے پہلے جائز عشق معدوم ہے۔اس لیے انھوں نے عشق کا حصہ ہی اپنے قصوں میں نہیں رکھا۔اور یہ حق ہے کہ اس کمی سے قصہ میں کچھ خرابی واقع نہیں ہوئی۔''[۱۰۶]

اس دور میں لکھے گئے ناولوں میں عشق کا بیان بڑے بھونڈے طریقے سے کیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے ناولوں کا حسن متاثر ہوا بلکہ بعض اوقات اس کی ہئیت بھی مسخ ہو گئی۔لیکن بعض ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں حسن و عشق کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔مثلاً مرزا محمد ہادی رسوؔا کا امراؤ جان ادا،اور عبدالحلیم شرر کا فردوسِ بریں وغیرہ۔

کردار نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہزادہ،نوابوں اور امیر زادوں کے بجائے غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو ناول کے کرداروں میں جگہ دینی چاہئے۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی۔یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ یا امیر ہونا کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے

جتنا کہ تعلیم یافتہ۔..... مگر ہمارے ناول نویسوں نے خیال کرلیا ہے کہ ہیرو کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو، نواب زادہ ہو یا شہزادہ ہو، یا کم سے کم معقول آمدنی رکھتا ہو..... ابھی تک اردو میں غربت کی زندگی کا نقشہ کھینچا جانا باقی ہے اور یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق ناول لکھے جائیں۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔'' ۱۰۷

یلدرم نے ترقی پسند تحریک سے پہلے اس بات پر توجہ دی کہ غریبوں اور غیر اہم سمجھے جانے والے لوگوں کو ناول کا حصہ بنانا چاہیے۔ یلدرم ناول کی طرف عوامی رجحان، اس کی مقبولیت کے اسباب اور اس کے منصب سے متعلق اپنے نظریہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''پھر کیا باعث ہے کہ افسانہ نگاری روز افزوں ترقی پر ہے؟ اس کی ایک بہت معقول وجہ بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ انسان کسی نہ کسی حد تک یونان کے فلاسفر اسپرس پیٹس یا اپی کیورس کا پیرو ہے، جن کا یہ قول ہے کہ اصلی مقصد زندگی کا خوشی ہے اور شوقیہ شوقیہ کتابوں کے پڑھنے والے بھی عموماً اسی زمرے میں شامل ہیں۔ وہ جب کسی کتاب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انھیں لطف حاصل ہو۔ نفوس قدسیہ شاید لاکھ میں چار بھی نہیں ہوتے جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرتے ہوں اور جو ایسے ہیں وہ بھی خوشی کے بندے ہیں.... اور چونکہ علوم میں لطف حاصل کرنے کے لیے محنت اور کاوش کی ضرورت ہے، اس سے بچنے کے لیے وہ لوگ جو کتابوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، قصوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔'' ۱۰۸

سجاد حیدر یلدرم نے اپی کیورس کے مطابق کہا کہ انسانی زندگی کا مقصد حصول مسرت ہے۔ جس کا ایک عمدہ طریقہ مطالعۂ کتب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت کم لوگ ہیں جو کتب کا مطالعہ محض علم کے لیے کرتے ہیں بلکہ وہ لطف حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ علمی کتابیں پڑھنے کے لیے محنت اور توجہ درکار ہے۔ اس لیے لوگ قصے کی طرف بھاگتے ہیں۔ یلدرم قصہ میں لطف وانبساط کے حصول کے قائل نہیں بلکہ اس میں علمی باتیں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ لوگوں میں مسرت وخوشی حاصل کرنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے جس کی تکمیل کے مختلف ذرائع میں قصہ ہے۔ اسی لیے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس کا استعمال اچھا ہو۔ وہ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ناول کا اپنا ایک خاص مذاق ومعیار اور منصب ہوتا ہے جسے بہرحال لغو اور مہمل نہیں ہونا چاہیئے۔

مختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضمون بے حد اہم ہے اس میں یلدرم نے پہلی بار ناول کی مختلف اقسام اسی کی فنی خصوصیات کرداروں کی تبدیلی کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سجاد حیدر یلدرم اردو فکشن کی تنقید میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ ارتضیٰ کریم، اردو فکشن کی تنقید، دہلی، 1996ء، ص:21

۲۔ ملّا وجہی، سب رس، مرتب، ڈاکٹر قمر الہدا فریدی، ایجوکیشنل بُک ہاوس، علی گڑھ،

۳۔ میر امن دہلوی، باغ و بہار، مرتب مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، 1931ء، ص:4

۴۔ پروفیسر محمود الٰہی، خطِ تقدیر، لکھنؤ، ص:21-20

۵۔ ایضاً، ص:19

۶۔ ایضاً، ص:۳۶

۷۔ اعجاز علی ارشد، نذیر احمد کی ناول نگاری، پٹنہ، 1984ء، ص:77

۸۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیہ اور منشائے مصنف کے مسائل، خصوصی شمارہ، سہ ماہی، فکرو نظر، علی گڑھ، جون 1994، ص:29

۹۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد، تصحیح و ترتیب توبۃ النصوح، مالک رام، فروری، 1972، ص:2

۱۰۔ مولوی نذیر احمد، بنات النعش، نول کشور پریس، لکھنؤ، 1932ء ص:4

۱۱۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد، تصحیح و ترتیب توبۃ النصوح، مالک رام، فروری، 1972، ص:21

۱۲۔ ایضاً ص:21

۱۳۔ ابوبکر عباد، فکشن کی تلاش میں، دہلی، 2014ء، ص:38

۱۴۔ ایضاً ص:40

۱۵۔ ایضاً ص:41

۱۶۔ ایضاً ص:43

۱۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر، داستان اور ناول کا تنقیدی مطالعہ، دہلی، 2012ء، ص:100

۱۸۔ عبدالحلیم شررؔ، دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء، مشمولہ، انتخابِ مضامین، مرتب علی احمد فاطمی، لکھنوَ، 1990ء، ص:96

۱۹۔ ایضاً ص:97-96

۲۰۔ ایضاً ص:96

۲۱۔ عبدالحلیم شرر، ''ناول'' مشمولہ، رسالہ دلگداز، لکھنوَ، جولائی 1910ء، ص:11

۲۲۔ ایضاً ص:13

۲۳۔ عبدالحلیم شررؔ، ''ناول'' مشمولہ، انتخابِ مضامین، مرتب علی احمد فاطمی، لکھنوَ، 1990ء، ص:71

۲۴۔ عبدالحلیم شررؔ، ''ناول'' رسالہ دلگداز، لکھنو، جولائی، 1910، ص:14

۲۵۔ ایضاً ص:14

۲۶۔ عبدالحلیم شرر، رسالہ دلگداز، لکھنو، ستمبر 1907، ص:15

۲۷۔ عبدالحلیم شرر، رسالہ دلگداز، لکھنو، جنوری 1907، ص:

۲۸۔ عبدالحلیم شرر، ''ہمارا جدید ناول''، مشمولہ، رسالہ دلگداز، لکھنو، جنوری، 1907، ص:13

۲۹۔ ایضاً ص:13

۳۰۔ ایضاً ص:13

۳۱۔ ایضاً ص:14

۳۲۔ عبدالحلیم شرر، رسالہ دلگداز، لکھنو، ستمبر، 1904، ص:12

۳۳۔ عبدالحلیم شرر، ''ہمارا جدید ناول''، رسالہ دلگداز، لکھنو، جنوری، 1907، ص:15

۳۴۔ عبدالحلیم شرر، ''ہمارا جدید ناول''، رسالہ دلگداز، لکھنو، جنوری، 1907، ص:16

۳۵۔ عبدالحلیم شررؔ، دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء، مشمولہ، مرتب علی احمد فاطمی، لکھنوَ، 1990ء، ص:98

۳۶۔ ایضاً، ص:98

۳۷۔ عبدالحلیم شرر، ''ناول''، رسالہ دلگداز، لکھنو، جولائی، 1910، ص:15

۳۸۔ عبدالحلیم شرر،''ہمارا جدید ناول''، رسالہ دلگداز لکھنو، جنوری، 1907، ص:

۳۹۔ عبدالحلیم شرر،''ناول''، رسالہ دلگداز لکھنو، جولائی، 1910، ص:12

۴۰۔ ایضاً، ص:12

۴۱۔ مرزا محمد ہادی رسوا،''مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات''، علی گڑھ، 1961ء، ص:81

۴۲۔ ایضاً، ص: 81

۴۳۔ ایضاً، ص: 81-82

۴۴۔ ایضاً، ص:82-83

۴۵۔ ایضاً، ص:83

۴۶۔ ایضاً، ص:83

۴۷۔ مرزا محمد ہادی رسوا،''دیباچہ شریف زادہ'' لکھنؤ، ص:4

۴۸۔ ایضاً ص: 4

۴۹۔ ایضاً، ص: 3

۵۰۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیہ اور منشائے مصنف کے مسائل، مشمولہ، فکر و نظر، سہ ماہی، خصوصی شمارہ، علی گڑھ، جون 1994، ص:30

۵۱۔ ابوبکر عباد، فکشن کی تلاش میں، دہلی، 2014ء، ص:94

۵۲۔ ایضاً، ص:94

۵۳۔ مرزا ہادی رسؔوا،''امراؤ جان ادا''، علی گڑھ، 1982، ص:47

۵۴۔ ابوبکر عباد، فکشن کی تلاش میں، دہلی، 2014ء، ص:95

۵۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، داستان اور ناول کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، ص:105

۵۶۔ مرزا ہادی رسؔوا،''ذاتِ شریف''، علی گڑھ، 1982، ص:6

۵۷۔ ابوبکر عباد، فکشن کی تلاش میں، دہلی، 2014ء، ص:97

۵۸۔ ایضاً، ص:98

۵۹۔ مرزا محمد ہادی رسوا،''ذاتِ شریف'' لکھنؤ، ص:3

۶۰۔ مدن گوپال، 'مرتبہ' کلیاتِ پریم چند'' جلد نمبر 20، دہلی، 2003ء، ص:158

۶۱۔ ایضاً، ص:158

۶۲۔ ایضاً، ص: 160

۶۳۔ ایضاً، ص:159

۶۴۔ ایضاً، ص:158-159

۶۵۔ ایضاً، ص:164

۶۶۔ عتیق احمد، مرتبہ''مضامینِ پریم چند''، کراچی، ص:237-238

۶۷۔ ایضاً، ص:238

۶۸۔ ایضاً، ص:238-239

۶۹۔ ایضاً، ص:220

۷۰۔ ایضاً، ص:209

۷۱۔ ایضاً، ص:224

۷۲۔ عبدالقادر سروری،''دنیائے افسانہ'' حیدر آباد، ص:38

۷۳۔. عتیق احمد، مرتبہ''مضامینِ پریم چند''، کراچی، ص:226-227

۷۴۔ ایضاً، ص: 210

۷۵۔ ایضاً، ص:211-212

۷۶۔ ایضاً، ص:212-213

۷۷۔ ایضاً، ص:213

۷۸۔ ایضاً، ص:213

۷۹۔ ایضاً، ص:213

۸۰۔ ایضاً، ص:213-214

۸۱۔ ایضاً، ص:214

۸۲۔ ایضاً، ص:58،63،252،255،258،261

۸۳۔ ایضاً، ص:262

۸۴۔ ایضاً، ص:263

۸۵۔ ایضاً، ص:63

۸۶۔ ایضاً، ص:64

۸۷۔ ایضاً، ص:262

۸۸۔ ایضاً، ص:264

۸۹۔ ایضاً، ص:261

۹۰۔ ایضاً، ص:56-57

۹۱۔ پروفیسر احتشام حسین، ''نیاز سے انٹرویو، مشمولہ، رسالہ پکڈنڈی، امرت سر، یلدرم نمبر، نومبر، 1961 ص:121

۹۲۔ نیاز فتح پوری، ''افسانہ پر نیاز کی رائے''، مشمولہ، نگار، پاکستان، نیاز نمبر، حصہ اول، 1963ء ص:282

۹۳۔ پروفیسر احتشام حسین، ''نیاز سے انٹرویو، رسالہ پکڈنڈی، امرتسر، یلدرم نمبر، نومبر، 1961 ص:117

۹۴۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز، مشمولہ، رسالہ نگار، لکھنؤ، دسمبر 1942، ص:27

۹۵۔ ایضاً ص:27

۹۶۔ نیاز فتح پوری، مکتوباتِ نیاز، رسالہ نگار، لکھنؤ، مارچ 1929، ص:39

۹۷۔ ایضاً، ص:40

۹۸۔ ایضاً، ص:41

۹۹۔ سجاد حیدر یلدرم، ’’ناول نویسی‘‘، رسالہ پکڈنڈی، امرت سر، یلدرم نمبر، نومبر، 1961, ص:153

۱۰۰۔ ایضاً، ص:155

۱۰۱۔ ایضاً، ص:156

۱۰۲۔ ایضاً، ص:156

۱۰۳۔ ایضاً، ص:156

۱۰۴۔ پریم چند، ناول کا موضوع، مشمولہ، مضامین پریم چند، عتیق احمد، کراچی، 1981، ص:223

۱۰۵۔ سجاد حیدر یلدرم، ’’ناول نویسی‘‘، رسالہ پکڈنڈی، امرت سر، یلدرم نمبر، نومبر، 1961, ص:159

۱۰۶۔ ایضاً، ص:159

۱۰۷۔ ایضاً، ص:159

۱۰۸۔ ایضاً، ص:153

بابِ دوم

تقسیمِ ہند سے قبل پریم چند پر لکھی گئی تنقید

تقسیمِ ہند سے قبل پریم چند پر لکھی گئی تنقید

تقسیمِ ہند سے قبل اردو میں پریم چند کے بارے میں جو تنقید ملتی ہے وہ اتنی غیر وقیع، محدود اور تعمیم زدہ ہے۔ کہ ان کے فنی شعور کی ہیئت اور انفرادیت کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ان کی اہمیت وعظمت کا ذکر تو بار بار کیا گیا ہے لیکن ان کی عظمت کے اصلی محرکات یا اسباب کی نشاندھی کی گئی ہے نہ اس کا تعین کیا گیا ہے۔ فکشن کی تنقید دراصل نظریات کی تبلیغ، نظریات سے وابستہ مصنف کی ستائش اور فکشن کی غیر فنی تنقید کی آویزش سے عبارت تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ممتاز شریں، محمد حسن، قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، شمس الرحمان فاروقی، وارث علوی فکشن تنقید کے اہم نام ہیں۔ لیکن تقسیمِ ہند سے قبل فکشن کی تنقید پر باضابطہ طور پر لکھنے والوں کے نام ناپید ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید کے ابتدائی نمونے دیباچوں تقریظوں اور تبصروں میں ہی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کی پریم چند پر باضابطہ طور پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی گئی۔ ایک آدھ تنقیدی مضامین رسالوں میں ملتے ہیں لیکن کلی طور پر تنقید نظر نہیں آتی اور یہ سلسلہ تقسیمِ ہند سے پہلے تک اسی طرح سست رہا لیکن تقسیمِ ہند کے بعد لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد تیار ہوگئی ہے۔ لیکن تقسیمِ ہند سے قبل جن نقادوں کی نظر پریم چند کی تحریروں پر ٹھہری ان نقادوں نے پریم چند کی تحریروں کا تجزیہ کر کے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ ان میں اوپندر ناتھ اشک، فراق گورکھپوری، سید علی جواد زیدی، مالک رام، عبدالماجد دریابادی، عبدالحق، جگر بریلوی، طالب بنارسی، دیانرائن نگم، مسز پریم چند شیورانی دیوی، سلیم جعفر، ساغر نظامی، جگت موہن لالِ رواں، ایچ۔ ایل گاندھی اور منشی جگیشور ناتھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک:

اوپندر ناتھ اشک پریم چند کے ناقدین میں ایک اہم نام ہے۔ جنہوں نے اپنی حیات کا ایک حصہ اردو کی بقا اور خدمت کے لیے صرف کر دیا۔ ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ اردو کو استقامت بخشی ہے۔ ان کے مشہو افسانوی مجموعے ڈاچی، کونپل، قفس، ناسور وغیرہ سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان

افسانوں کی مقبولیت نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگادیئے اوپندر ناتھ اشک منشی پریم چند کے معاصرین میں سے تھے۔ وہ پریم کے ہمنوا بھی تھے۔

اوپندر ناتھ نے تمام تر وقت افسانہ نگاری پر صرف کیا جس کی وجہ سے ان کو فن پر پختگی حاصل ہوگئی۔ زبان بہت صاف و شفاف ہوگئی اور روانی وسلاست ان کی تحریروں کی شناخت بن گئی۔ ان کا کوئی منفرد اسلوب نہیں ہے جس کے ذریعے سے اپنی تحریروں پر گہرا نقش نہیں قائم کر پائے۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انھوں نے اپنی بسیار نویس اور زرخیز قلم سے اپنے افسانوں کے ذخائر میں بڑا اضافہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے افسانوں کو بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھا اور سنا گیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ساتھ پریم چند کے افسانوں کو بھی بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا اور سمجھا پریم چند پر ایک مضمون ''پریم چنداور دیہات'' لکھ کر اپنی عقیدت کا لوہا منوایا جو رسالہ ''زمانہ'' کانپور سے 1936ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کی دیہاتی زندگی پر روشنی ڈالی۔ یہ مضمون پریم چند شناسی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اوپندر ناتھ ایک جگہ پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پریم چند کی جب بھی یاد آتی ہے تو ان کی دیہاتی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے لیکن مجھے ان کے نزدیک رہنے اور دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ ورنہ میں یہ بھی دیکھ لیتا کہ وہ اپنے طرز رہائش میں کس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ کس حد تک دیہاتی تھے۔ اِنھوں نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا جائزہ روایتی انداز میں لیا ہے جس کی وجہ سے اس میں نہ تو علامتی کردار پیش کئے ہیں اور نہ تو کوئی نئی جہت کی تلاش کی ہے جس طرح آج کل کے نقاد نئے نئے گوشوں پر روشنی ڈال کر نئے زاویے کی دریافت میں لگے ہوئے ہیں۔ اوپندر ناتھ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کو اپنی زبان میں بیان کر کے سمجھانے کی صرف کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند نے جو گاؤں کی تصویر کشی کی ہے اور ان کے وقت میں جو زمانے کے حالات تھے غریبی، امیری، محنت کش طبقہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل عکاشی پیش کی ہے۔ امر کانت، سمر کانت وغیرہ کی کہانی اسی طرح پیش کر دی جس طرح پریم چند نے تحریر کی ہے۔ یہاں اوپندر ناتھ کا مضمون ''پریم چنداور دیہات'' کا ایک اقتباس دیکھئے اور یہ بھی دیکھئے کہ کوئی نئی بات کہی ہے کہ نہیں:

''شہری زندگی سے تنگ آئے ہوئے امر کانت کو یہ گاؤں خوبصورت لگا۔امرت کانت کہتے بھی ہیں۔''ایسا خوبصورت گاؤں میں نے نہیں دیکھا۔ندی، پہاڑ، جنگل اس کا تو سماں ہی نرالا ہے۔جی چاہتا ہے کہ یہیں رہ جاؤں اور کہیں جانے کا نام نہ لوں۔''امر کانت ہی کیوں کوئی بھی قدرت کا عاشق وہاں جا کر اپنی جلی ہوئی روح کو تسکین پہنچا سکتا ہے۔ہندوستان کے دیہات قدرت کا روپ ہیں۔قدرت کا ہی رنگ ہیں۔جہاں پہاڑ ہے،ندی ہے، ہرے بھرے درخت ہیں کھیت ہیں۔ وہاں مٹی یا پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں کی تصویر خود بخود ذہن میں کھینچ جاتی ہے۔شہر تو قدرت کے حسین جسم پر پھوڑے ہیں اس کی خوبصورتی کے رہزن ہیں۔اور اگر شہریوں کی شاطرانہ چالوں نے ان خوبصورت دیہات میں رہنے والوں کی زندگی کو تلخ نہ کر دیا ہوتا۔تو وہاں جانیوالا سچ مچ ہی پھر آنے کا نام نہ لیتا۔''[1]

اوپندر ناتھ کی ان باتوں میں نہ تو کوئی نیا پن ہے اور نہ ہی اس مضمون میں کوئی حسن پیدا ہوا ہے بس وہی سادگی اور سلاست ہے۔تھوڑا سا انھوں نے اپنے تئیں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔تا کہ قاری کے آنکھوں میں ایک حسین منظر کا نقشہ کھینچ جائے اور دلچسپی قائم ہو جائے لیکن اگر اس میں وضاحت نہ کیا جائے تو پریم چند کے افسانوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور پڑھنے والا اس طرح پڑھتا اور سمجھتا ہے جس طرح اوپندر ناتھ نے سمجھانے اور دکھانے کی کوشش کی ہے:

اوپندر ناتھ پریم چند کے دیہات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریم چند جو چیز بیان کرتے ہیں تو اس کا نقشہ کھیچ کر رکھ دیتے ہیں۔وہ دیہات کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ سارے کردار چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلم نظروں کے سامنے چل رہی ہے اور ہم اسی کو دیکھنے میں مگن ہوں۔ پریم چند کے تعلق سے اوپندر ناتھ اشک اپنے متذکرہ بالا مضمون میں رقم طراز ہیں:

''آپ نے اپنی زندگی میں کوئی گاؤں نہ دیکھا ہو۔آپ کو کبھی دیہات
کی سردیوں سے پالا نہ پڑا ہو۔آپ نہ جانتے ہوں مفلس اور قلاش
کسان موسمِ سرما کیسے گزارتے ہیں۔ پریم چند کے جادو نگار قلم سے
کھینچی ہوئی تصویر دیکھئے۔آپ سب کچھ جان جائیں گے۔اور آپ
کے سامنے گاؤں کی سردی اور اس میں ٹھٹھرتے ہوئے کسان کی تصویر
کھینچ جائے گی۔''۲

حالانکہ اوپندر ناتھ کی نظر بڑی گہری اور عمیق ہے۔انھوں نے کردار کو بیان کرنے میں بڑی ہنرمندی سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور جس افسانے پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اس میں صراحت اور وضاحت سے کام لیا ہے۔منشی پریم چند کی طرح ان کی بھی نظر دیہات کے گلی کوچوں میں چلتی پھرتی اور وہاں کے جزئیات نگاری اور حالات پر مکمل منحصر دکھائی دیتی ہے۔اور کرداروں کے کارنامے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو پاتے ہیں۔ان کا ایک اقتباس دیکھئے:

''دیہات کی اس نیم جاں لاش کو جو جونکیں چمٹی ہوئی اور اس کے خون کا
آخری قطرہ تک چوس جانا چاہتی ہیں پریم چند نے ان کو بھی فراموش
نہیں کیا۔ گئودان کے ''پنڈت داتا دین، جھینگری شاہ، منگرو شاہ،
پٹواری پٹیشوری اور کارندہ نو کھے رام، اور گوشۂ عافیت کے غوث خاں،
فیض اللہ، بشیشر شاہ، تھانیدار دیا شنکر وغیرہ انھی جونکوں کی مختلف اقسام
ہیں۔ دیہاتیوں کے جسم میں خون کا نام تک نہیں رہا۔ بے جان سے
ہو گیے ہیں۔اس بات سے انھیں کوئی غرض نہیں۔وہ تو جب تک خون کا
قطرہ ہے۔ان کے جسم سے چمٹے رہیں گے۔ دیا دھرم، رحم و ہمدردی کا
ان کے ہاں نام نہیں۔''۳

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کے افسانوں کے ذریعے ان کے تحریر و تقریر کی بہترین ترجمانی

کی ہے۔مگر ان کے تنقیدی نقائص بیان کرنے سے گریز کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوپندرناتھ نے جانبدارانہ رویے سے کام لیا ہے۔اورصرف پریم چند کے تعریف وتوصیف بیان کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے اور میانہ روی سے کام لینے کو ہی ترجیح سمجھا اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شروع میں انھوں نے خود جوناول اور افسانے تحریر کئے ان میں ناصحانہ اوراخلاقی رنگ غالب تھا جس کی وجہ سے انھوں نے پریم چند کے افسانوں کو بھی اصلاحی نظر سے دیکھا اوراس کو اس طرح بیان کردیا جس طرح خود پریم چند بیان کرنا چاہتے تھے۔ اوپندرناتھ اشک نے پریم چند کے کرداروں پر ایک خاص قسم کی روشنی ڈالی ہے۔جن سے ان کے ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔لیکن اگر دیکھا جائے تو اپنے عہد کے حساب سے بہتر سے بہتر طریقے سے پریم چند کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔چاہے پوس کی رات ہو، گئودان ہو، گوشۂ عافیت ہو، چوگانِ ہستی ہو، میدانِ عمل ہوان سب کا بہتر مطالعہ کر کے ان کی اہمیت واضح کی جوان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اوران کہانیوں اورناولوں کے ذریعے سے دیہات کی منظر کشی میں اوراضافہ ہوگیا ہے اور ساتھ ساتھ دلچسپی بھی قائم ہوگئی ہے۔

فراق گورکھپوری:

فراق گورکھپوری ہماری اردو شاعری کے ایک عظیم الشان شخصیت کا نام ہے جنہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی فکر نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا ہے۔ان کے ذریعے شاعری نے ایک بلند معیار حاصل کیا۔فراق گورکھپوری نے سنسکرت، عربی، فارسی اورانگریزی ادب کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا اور مغرب کا بھی ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا جس کے ذریعے اردو شاعری کو وہ بہت ساری چیزیں حاصل ہوگئیں۔جو اردو ادب کے لیے نہایت اہم اورضروری تھیں ان کو بڑے بڑے اعزاز واکرامات سے بھی نوازا گیا۔گیان پیٹھ جیسا ایک بہت ہی اہم اور بیش قیمتی اعزاز بھی اپنی زندگی میں حاصل کیا جس کو بڑے بڑے شعراء وادبا حاصل کرنے سے قاصر ومحروم رہے۔جس طرح انھوں نے اردو شاعری میں ایک پہچان بنائی اسی طرح تنقید کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔تاثراتی تنقید میں ان کا بہت ہی بلند مقام ہے۔اسی طرح انہوں نے ایک مضمون ’’پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے‘‘ لکھا جو رسالہ ماہنامہ ’’زمانہ‘‘ 1936 میں شائع ہوا۔انھوں نے تنقید کے اصولوں کے تحت پریم چند کے ادبی تحریروں کو پرکھنے کی سعی کی۔جو پریم چند شناسی میں اضافے کی

حیثیت رکھتا ہے۔

اس طرح انہوں نے پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اوراس کے حسن و قباحت بھی بیان کئے ہیں۔لیکن زیادہ سے زیادہ انھوں نے منشی پریم چند کی تعریف وتوصیف ہی بیان کی ہے اوراپنی تحریرِ قلم سے انکی نجی زندگی اور حالات پر بہت تفصیلی روشنی ڈالی ہےاورتقریباًان کی زندگی کے ہر پہلو کا بہت گہرائی سے مطالعہ کر کے پریم چند کے حیات وخدمات پر بہت گہری نگاہ ڈالی ہےاوراس کے ساتھ ساتھ اپنی کچھ ملاقاتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو ہماری اردو دنیا میں بڑی معنویت رکھتی ہیں پریم چند کی سادہ تحریروں کے جہاں سبھی نقاد عاشق ہیں وہیں فراق گورکھپوری بھی ان کی تعریف کرنے سے نہیں چوکتے لکھتے ہیں ایک اقتباس دیکھیں:

> بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ہندی، اردو پڑھی جاسکتی ہے، خدمت گار، خانساماں، معمولی پڑھی لکھی عورتیں، بچے، گاؤں کے مدرس، زمیندار اور کاشت کار جب کبھی ان کے ہاتھ پریم چند کا کوئی افسانہ یا قصہ لگ جاتا ہےتو وہ سب ہمہ تن متوجہ ہوکراس میں غرق ہوجاتے ہیں۔''[۴]

جس طرح پریم چند کے ناول اورافسانوں میں سادگی اور دیہاتی زندگی نظرآتی ہے بالکل اسی طرح پریم چند کی خود کی زندگی بھی بالکل سادہ ہے بالکل فقیرانہ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔حالانکہ کچھ دنوں کی تکلیفوں کے بعدان کی زندگی میں خوشگواری بھی آگئی تھی کچھ پیسہ روپیہ بھی حاصل کرلیا تھالیکن اس کے باوجود نہ لہجے میں تلخی اورنہ زمانے کے سامنے اِترا کر چلنے کی عادت بنائی۔ بلکہ پریم چند کی جواپنی زندگی تھی یہی ان کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔اس سلسلے میں فراق اپنے مضمون ''پریم چندایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے''ایک جگہ لکھتے ہیں۔جو پریم چند کے زندگی کے بہتر دنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جب ان کی عمرتیس سال سے کچھ زیادہ ہوچکی تھی، میرے یوپی سول سروس کی ملازمت ترک کرنے کے چند ہفتوں بعد وہ بھی سرکاری

ملازمت سے کنارہ کش ہوگیے۔ اس وقت ان کے پاس کچھ روپیہ بھی
جمع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان کی زندگی نہایت سادہ اور با کفایت تھی، وہ اپنے
ابتدائی زندگی میں سختی کے دور سے گزر چکے تھے۔ اور تمام عمر بغیر محسوس
کیے ہوئے ایسی فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے جس میں نہ خشکی تھی نہ ایذا
طلبی۔ نہ خود پرستانہ پا کبازی تھی اور نہ زاہد خشک کا تعصب۔ یہاں بھی
ان کی معصومیت اور عہد طفلی کی سی سادگی میں دھوکا نہ ہوسکتا تھا اور اسی
خصوصیت نے ایک مقناطیسی کشش کی طرح نہایت خاموش اور با اعتماد
طریقہ پر مجھے ان سے بہت قریب پہونچا دیا تھا۔'' ۵؎

فراق کا یہ مضمون پڑھنے سے پریم چند کی تقریباً پوری زندگی کا احاطہ ہوتا ہے اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فراق نے پریم چند کو دیکھا اور سمجھا اور پڑھا بھی ہے۔ اس لیے ان کے قلم سے کوئی گوشہ شاید پوشیدہ رہ گیا ہو۔ فراق نے پریم چند کے افسانوں کا مکمل طریقے سے پڑھ کر کئی مغربی مصنفین سے پریم چند کا موازنہ کر کے ان کی تحریروں کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس تعلق سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے پریم چند کی اہمیت واضح اور نمایاں ہوجاتی ہے۔ فراق کہتے ہیں۔

''وہ جذبات کو پیش کرتے وقت بال کی کھال نہیں نکالتے لیکن ان کی نثر
میں زندگی کی تڑپ موجود ہے میں پھر ایک دفعہ اپنے خیال کو تیس برس
پیچھے لئے جاتا ہوں جب میں نے ان کی ایک کہانی پڑھی تھی اس وقت
میری عمر مشکل سے دس بارہ سال ہوگی۔ اس وقت دنیا میں بچوں کے
لئے جو ادب موجود ہے اس کا خیال کرتا ہوں۔ حکیم اسیپ کی کہانیاں
(Aesop"s fables) اس سے پہلے کی کتاب ہتوپدیش، الف
لیلیٰ، گرم اور اینڈرسن کے حور و پری کے قصے (Fairy Tales of
Grimm and Andrson) جی۔ اے ہنٹی کی تصانیف اور

دوسری بہت سی کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ اگر چہ ان میں سے کئی
گراں قدر تصانیف ہیں۔لیکن یہ سوچ کر میں دھک سے رہ جاتا ہوں
کہ ادب کی لطیف روح اور رنگینی، حقیقت کی جھلک اور نازک
احساسات کا اظہار اور وہ بسی ہوئی تاثیر جو پریم چند کے یہاں ملتی ہے۔
ان سب میں مفقود ہے۔''۶؎

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فراق پریم چند کے بڑے ناقدوں میں شامل ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی گہرائی اور وسعت سے ان کا مطالعہ نہ کرتے اور کیوں نہ کرتے پریم چند کی شخصیت بہت بڑی شخصیت تھی جس سے کوئی ملنے میں فخر محسوس کرتا تھا کہیں کہیں بہت ہلکے تنقیدی رجحان سے بھی کام لینے کی کوشش کی ہے۔شاید یہ تاثراتی تنقید کا نتیجہ ہے۔فراق کہتے ہیں کہ پریم چند کو مختصر افسانوں میں وہ کامیابی نہیں مل سکی جو ملنی چاہئے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پریم چند جس زمانے میں تھے اس وقت افسانوں کی دیواریں اور عمارتیں کھڑی ہورہی تھی۔اس لیے ان کے افسانوں میں کہیں کہیں گر چہ جھول بھی ہے تو وہ عیب کے زمرے میں شامل نہیں ہے نقشِ اول ہمیشہ کمزور ہی ہوتا ہے۔لیکن بعد میں جب لوگ اسکی خامیوں کو دیکھ لیتے اور سمجھ لیتے ہیں تو دوبارہ اس کو بہتر اور عمدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہی حال پریم چند کا بھی تھا اگر چہ ابتداء میں کچھ خامیاں نظر آئیں تو بعد میں اس فن میں پختگی حاصل کر کے ایک معیار قائم کیا۔ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستان کے افسانوں کو ایک مخصوص زبان سے آشنا کیا اور اپنے مزاحیہ اور المیہ اشاروں میں وہی سلاست وروانی کا اثر قائم کیا جو ان کی تحریروں کی شناخت ہیں۔ پریم چند کے تعلق سے فراق نے ایک اور خیال پیش کیا ہے کہتے ہیں کہ پریم چند مطالعے کے بہت زیادہ شوقین نہیں تھے۔اور نہ تو کسی خاص اصول کے تحت کتابیں پڑھتے تھے۔لیکن جن چیزوں کی دلچسپی تھی وہ تھی ناول اور افسانہ جو رسم ورواج، تاریخی واقعات اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر ہوتی تھیں۔اس لیے پریم چند کے ذہن میں ایک خاص قسم کی چیزیں گھر کئے ہوئے تھیں۔ جو باہر نکلتی تھیں تو بہت پُر اثر ہوتی تھی۔ اگر فن کے تعلق سے بات کی جائے تو ان کے فن میں آخری دنوں میں بڑی پختگی حاصل ہوگئی اور ان کا فن نئی طاقت اور نئی قوت حاصل کر رہا تھا۔اس طرح

دیکھا جائے تو فراق نے ہر طرح سے پریم چند کا احاطہ کر کے ان کی تعریف وتوصیف بیان کی ہیں وہیں کچھ خامیوں کو بھی پیشِ نظر رکھ کر اشارے اور کنائے میں ان پر روشنی بھی ڈالی ہے۔لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند جیسے ایک بڑے ادیب کے چلے جانے سے اردو دنیا میں خلا پیدا ہو گیا جس کی تلافی نہایت مشکل اور ناممکنات میں سے ہے۔فراق نے اس مضمون میں پریم چند کے اس دنیا سے چلے جانے کا ماتم بھی کیا ہے اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کر کے دادِ وتحسین سے نواز کر ان کی اہمیت اور فرشتہ صفت انسان کی خصوصیتیں بھی واضح کی ہیں۔

جگر بریلوی:

جگر بریلوی کا نام شام موہن لال تھا اور جگر تخلص، بریلی کے ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے یہ اپنے وقت کی جانی مانی ادبی شخصیت تھی۔اردو نثر ونظم دونوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا لاثانی تھا۔غزل کو انھوں نے ایک نیا آیام دیا۔ جگر نے تقریباً تین سو چوالس غزلیں کہیں اور اپنے دیوان کو عنوان دیا ''پرتوِ الہام'' رباعی اور قطعہ سے لیکر نظم،غزل،مسدس،مثنوی،تنقیدی مضامین سبھی میں کامل تھے۔ جہاں ان کا مسدس ''پپیہا اور پی کہا'' اپنی طرح کا انوکھا نمونہ ہے۔وہیں مثنوی ''پیام ساوتری''ہندی سنسکرتی، دھرم اور فلسفی کی اردو میں انوکھی تصنیف ہے۔جگر کے نثری مضامین،سوانح عمری،تنقید،اور تبصرہ بہت اونچے پائے کے تھے۔یہی وجہ ہے کی پریم چند کے نقادوں میں جگر بریلوی بھی شامل ہیں۔انھوں نے پریم چند پر''ایک مضمون ''پریم چند کی ادبی خدمات'' لکھ کر ان کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا جو رسالہ ''زمانہ '' کانپور سے شائع ہوا۔جگر بریلوی پریم چند کی بعض تصانیف کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ایسے شہرت یافتہ شخصیت پر قلم اٹھایا جس سے کسی کو انکار نہیں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان جگر بریلوی اپنے مضمون ''منشی پریم چند کی ادبی خدمات'' میں یہ بحث اٹھائی ہے کہ سب سے پہلا افسانہ 'فسانہ آزاد' ہے کیونکہ یہ کردار پلاٹ کا بہت اہم اور بہتر افسانہ ہے۔پھر جگر بریلوی نے کچھ ایسی اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن کے علمی وادبی خدمات کو دنیا فراموش نہیں کر سکتی ان میں کالی داس،بھوبھوتی،ویاس،تلسی داس،رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ کا ذکر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔لیکن ان لوگوں نے جہاں اور جس ماحول میں آنکھیں کھولیں تو ان کو وہاں ناز و

نعمت، دولت وثروت عطا کی اوران لوگوں کا مصائب اورآلام سے کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا۔لیکن اس کے علاوہ ان حضرات نے گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیئےان شخصیتوں کو ہمیشہ اردو دنیاسرِ فہرست پر رکھے گی۔

آگے اسی مضمون میں پریم چند کے تعلق سے کہتے ہیں کہ پریم چند اس معالے میں خوش نصیب نہیں تھے۔ ٹیگور جیسی قسمت پریم چند کو نہیں ملی۔اور نہ ہی عشرت وآرام ملا۔مگراس کے باوجود منشی پریم چند نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیا جو ادبی دنیا پر بہت بڑا احسان ہے۔اور اردو دنیا پریم چند کے بغیر ناقص نظر آتی ہے۔جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔وہ سب شہروں میں پیدا ہوئے یا کسی قصبہ میں پیدا ہوئے اوران کی نگاہیں شہروں پر ہی قائم رہیں۔مگر پریم چند دیہات میں پیدا ہوئے اور دیہات پر ہی اپنی نظر مرکوز کی۔اور دیہات ہی کی تصویریں اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیں۔ایک وقت تھا۔ جب لوگ صرف شہروں کی عکاسی اپنے افسانے اور ناولوں میں کرتے تھے اور کسی کی نگاہ نے دیہات کی گلیوں اور کوچوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت پریم چند دیہات میں پیدا ہونے کے ساتھ ہی دیہات کی منظر کشی پیش کی اور دوسری بات یہ ہے کہ جب پریم چند سنِ شعور کو پہنچے تو اس سے پہلے ان کے والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور ایک سوتیلی ماں تھی جس سے متاثر ہوکر پریم چند نے ایک ناول کا نام بھی ''سوتیلی ماں'' رکھا ہے۔سنِ شعور سے پریم چند کے کندھوں پر ایک بوجھ آ گیا تھا۔کسی طرح سے پڑھائی کرنے کے بعد ایک بہت ہی مختصر تنخواہ پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو تنخواں ملتی تھی اس کا آدھا اپنی ماں کو اور اپنے گھر پر دیتے اور آدھا اپنے لیے رکھتے لیکن وہ تنخواں اتنی زیادہ نہیں تھی کہ زندگی کو سکون میسر ہوجائے لیکن اس کے باوجود بڑے سلیقے سے گزر بسر کرتے تھے۔چونکہ یہ ایک سیدھے سادھے اور نہایت شریف آدمی تھے۔زیادہ رنگ و رعنائی کے خواہشمند نہیں تھے۔ ورنہ جو تنخواہ ملتی تھی اس میں بھی گزر بہت مشکل ہوجاتی۔ان کی تنخواہ کے تعلق سے جگر کہتے ہیں اقتباس دیکھئے:

> ''پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن کی آدھے میں خود گزر کی اور آدھا اپنے متعلقین کی گزر بسر کیلئے دیتے رہے۔یہ تھا وہ آزمائش کا زمانہ جس سے پریم چند کے سن شعور کا آغاز ہوا۔ایسی حوصلہ شکن اور صبر آزما مشکلات میں بڑے بڑے جوان مردوں کے پتے پانی ہوجاتے ہیں۔ایک نوعمر

ہندوستانی طالب علم سے جس کا کوئی ہمدرد، دستگیر اور رہنما نہیں ایسی سخت کشمکش حیات کے مقابلہ ہی کی امید نہیں کی جا سکتی ادبی شوق کا پیدا ہونا اور قایم رہنا تو امکانات بعید ہیں ہے

جگر پریم چند کے فن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا فن نہایت پر اثر ہے۔اور کہتے ہیں کہ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' سے پہلے اور نہ بعد میں ان کی جیسی سحر کاری نظر نہیں آئی ''فسانہ آزاد'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان میں جن جن کرداروں کو بیان کیا گیا ہے وہ سب کے سب متحرک اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سرشار نے بڑی جابکدستی سے اس ناول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی ہے اور مکمل طریقے سے کامیاب بھی رہے ہیں۔ رتن ناتھ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ کرداروں کو جہاں چاہتے ہیں انگلی کے اشاروں پہ نچاتے ہیں یہ ان کی اپنی خصوصیت ہے۔جگر مزید آگے لکھتے ہیں کہ سرشار کے بعد یہ خوشنما رنگ ناپید ہو چکا تھا۔لیکن مدت گزرنے کے بعد سرشار کی روح نے پریم چند کے قالب میں اپنی روح ڈال کر پریم چند کی شکل اختیار کی اور پریم چند نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیا جو ان کے معاصرین میں سے کوئی نہ کر پایا نہ تو ان کے بعد کسی کے یہاں وہ سادگی ہے اور نہ ہی تحریروں میں وہ لذت۔ پریم چند ہر اعتبار سے پورے اور مکمل نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے جو کردار اپنے ناولوں اور افسانوں میں شامل کئے ہیں اس کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ سب معاملات ہمارے ہی اوپر گزر رہے ہوں۔جگر اپنے تنقیدی نظریے کا جائزہ لیکر پریم چند کے تعلق سے جو لکھا ہے وہ نہایت بہتر اور بجا ہے۔لکھتے ہیں ایک اقتباس دیکھئے:

> ''ایک مدت گزرنے پر اردو کی قسمت جاگی اور منشی پریم چند کے قالب میں روح ادب نے جنم لیا۔جس کو آپ کے وسیع مشاہدہ، بلند معیار اخلاق اور وسعت نظر نے ایسے ایسے حقیقی دل فریب، اور پاکیزہ مرقعوں میں پیش کیا ہے جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی،آپ کے افسانوں میں مافوق الفطرت موکل یا انسان نظر نہیں آتے بلکہ یہی عام انسان ہیں جن سے ہماری دنیا آباد ہے،لیکن آپ نے ان عام

انسانوں کی نفسیاتی خصوصیات کا اس قدر صحیح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ کہ
یہ انسان مخصوص کردار بن گیے ہیں۔''۸ے

پریم چند نے اپنے ناول اور افسانوں میں کوئی نئی چیز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بس وہی روز مرہ کی ہمارے گردوپیش کی چیزیں ہیں جن کو پریم چند نے اپنے جوہری ہنر سے تراش کر ہیرا بنا دیا ہے۔ یہ پریم چند کا ہی ہنر اور کمال ہے۔

جگر نے اپنے اس مضمون کے ذریعے سے اردو ادب کو ایک پیغام دینا چاہا ہے کہ وہ صرف پریم چند کے علاوہ اور تھوڑی بہت ہستیوں سے واقف ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے متقدمین اور متوسطین اور بزرگ شخصیتوں نے جنم لیا لیکن لوگ بھول گیے ہیں۔ضروری ہے کہ اس طرح کی ہستیاں ہر دور میں ملنی چاہئے۔مگر نہیں ملتی سَرشار کے کافی دنوں کے بعد پریم چند کی ہستی نکھر کر سامنے آتی ہے۔جگر نے پریم چند پر اپنی تنقیدی بصیرت ڈال کر کچھ ہی چیزوں کو نمایاں کیا ہے جو پریم چند کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔انھوں نے اس دور کو بھی ساتھ رکھا ہے جب افسانہ اور ناول اپنے ابتدائی نقوش قائم کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ سرشار نسیم جب نظر آتے ہیں تو بہت دور دور تک کسی اور کی شخصیت نظر نہیں آتی مدتوں کے بعد پریم چند اپنے پورے شد و مد کے ساتھ اردو دنیا پر نازل ہوئے ہیں اور ایک طویل مدت پر حکمرانی کرتے رہے ہیں لیکن ان کے بعد پھر اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔جگر کا کہنا ہے کہ''اگر ہم پریم چند کو ہندوستان کا شیکسپیئر کہیں تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا اگر اس فطرت انسان کی چگونگی و بوقلمونی کے اندازِ بیان پر نظر کی جائے تو ہر ہر لفظ کے پڑھنے والے کے قلب کی حالت اس کیفیت و سرعت کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے۔جس طرح برسات کے موسم میں افق پر جلوہ فرما سورج کی کرنیں ابر کے ٹکڑوں میں مسلسل رنگینی کے عالم پیدا کرتی اور مٹاتی رہتی ہیں۔یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور افسانہ نگاری کی حدیں مل جاتی ہیں اور مصنف کی قدرتِ خلاقی کو دیکھ کر اسے خدایانِ ادب میں تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔''

یہاں جگر نے صرف پریم چند کی ستائش سے ہی سروکار رکھا ہے اور زبانی طور پر پریم چند کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کر دی ہے اور نہ تو جگر نے کوئی اقتباس پریم چند کا پیش کیا اور نہ تو کوئی تحریر۔جس سے پتہ

چلتا ہے کہ دور سے ہی سنی سنائی بات کردی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ایک اقتباس فردوسِ خیال سے پیش کیا ہے۔جس کا تعلق اسی سلسلے سے ہی ہے جس میں پریم چند نے نیکی اور بدی کے تعلق سے روشنی ڈالی ہے اور کہتے ہیں کہ عالم عالم کو دیکھ کر اور سادھو سادھو کو دیکھ کر اور شاعر شاعر کو دیکھ کر نفرت کرتے ہیں لیکن چوروں میں یہ بات نہیں ہے ہمیشہ ایک چور یا شراب خور اپنے شرابی یا چور بھائی کی ضرور مدد کرتے ہیں۔لیکن ہمارے نیک کام کرنے والے یہ سوچتے ہیں کہ اس کو ٹھوکر لگی ہے تو دوسری بھی لگ جائے تو بہتر ہے۔جگر نے ادیبوں کے تعلق سے یہ پریم چند کا نظریہ پیش کیا ہے۔

مالک رام:

مالک رام تحقیق کی دنیا کے ایک قدآور اعلیٰ فنکار کا نام ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کی اپنی تحقیق کے ذریعے اردو کی تحقیقی معیار کو بلند کیا بلکہ متعدد نسخوں کو دریافت کرکے ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔تحقیق کا کام بہت مشکل امر ہے جو علم کے ساتھ ساتھ تحقیقی ذوق کا تقاضہ کرتا ہے۔ جہاں ایک محقق ہمیشہ تحقیقی کاموں کو لے کر اس میں حق وصداقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہر چیز کو اس کی کسوٹی پر آزمانا اور پیائش کرنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔اور ایک سچے اور بہترین محقق کیلئے یہ ساری چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں۔

پریم چند شناس میں ایک اہم نام مالک رام کا ہے جنھوں نے منشی پریم چند کے دوناول میدان عمل اور گئو دان کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لیا جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' 1936ء میں پیش کیا۔اس کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بات کے مدنظر اپنی تنقید میں ایسی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں کہ جس سے بیک وقت عام قارئین اور قدآور ناقدین ساتھ ہی ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔۔اسی طرح مالک رام نےمنشی پریم چند پر تنقیدی نگاہ ڈال کر ان کے افسانوں اور ناولوں کے کچھ تجزیے بھی پیش کئے ہیں لیکن بڑی شائستگی سے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش یہ کی ہے کہ پریم چند کے تجزیئے میں بھی دلکشی باقی رہے اور ان کو پڑھنے پر بھی افسانے یا ناول کا ہی گمان گزرتا ہے۔اس لئے کہ انھوں نے اقتباس بہت طویل اور لمبے بیان کئے ہیں لیکن انھوں نے زمانے کے اعتبار سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔لیکن آج کل تنقید کے نئے نئے اصول وضابطے مقرر

ہو گیے ہیں۔اس لیے انھوں نے زمانے کو ملحوظ رکھا ہے۔

مالک رام نے اپنے مضمون ''میدانِ عمل اور گئودان'' میں جو تنقیدی نگاہ ڈالی ہے وہ بہت ہی آسان اور سلیس انداز میں ڈالی ہے۔جو اس زمانے کا سیاسی ماحول تھا اور سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں ان ہی کو اپنا طرزِ اظہار بنایا ہے کوئی نئی بات کہنے کی کوشش نہیں کی ہے۔اس لئے کہ اس میں (میدانِ عمل) جو کردار ہیں وہ سب سیاسی لباس پہنے ہوئے ہیں، وہی سیٹھ کی کنجوسی اور رشوت کی باتیں پیش کی ہیں اور غریب اور امیر کا فرق دکھایا ہے جو بغیر تنقید کے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔اور اس سیاسی حالات سے اس وقت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔مالک رام نے بہت ہلکی تنقید سے کام لینے کی کوشش کی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ ناول اس وقت کے ابتدائی ناولوں میں سے تھا اس لیے ہوسکتا ہے تنقید کے مکمل اصول پر چلنے میں کوتاہیاں بھی ہو رہی تھیں۔اس میں مالک رام نے جس کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے اس کو اسی زمانے کے سیاسی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔یہاں مالک رام کا ایک اقتباس دیکھئے۔

> ''اگر ایک فقرہ میں اس ناول کا مقصد بیان کیا جائے تو یہ ناول ایک گرد و پیش کے حالات سے متاثر اور حساسِ دل و دماغ والے نوجوانوں کے کردار کی ارتقائی منازل کا بیان ہے۔لیکن درحقیقت اس ناول میں ہماری پچھلے دس پندرہ برس کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔کہیں اچھوتوں کے لیے مندروں کے دروازے کھل رہے ہیں تو کہیں سیوا آشرم بن رہے ہیں۔کہیں لگان کی تخفیف کی تحریک ہے تو کہیں گرام سدھار کی کوشش ہے کہیں مزدوروں کی تنظیم ہے تو کہیں ان کی اقتصادی بہتری کے وسائل کا بیان ہے۔''[9]

مالک رام نے اپنے اقتباس میں بالکل وہی باتیں کہنے کی کوشش کی جو اس زمانے کی ہیں اور کرداروں کے ذریعے سے جو باتیں بیان کی گئیں ہیں وہی اپنے اعتبار سے مالک رام نے بیان کر دیا ہے اس میں نئی جہت اور نئے زاویوں کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

امر کانت،سکھدا،سکینہ،رانا دیوی، پٹھانی، سلیم، کالے خاں وغیرہ سب کے سب مثالی کردار کی زندہ وجاوید شکل میں ہیں لیکن افسوس یہ ہیکہ ان کرداروں کو صرف 33-1930 کے ہندوستان اوراس کے سیاسی اور معاشی ماحول میں سمجھنے کی کوشش کی گئی۔لیکن ان کرداروں کے انداز جذباتیت اور انفرادی سطح کو ابھی تک نظر انداز کیا گیا ہے۔اگر ''میدانِ عمل'' کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں کرداروں کی کمزوری اور پلاٹ میں ضعف ہےاور تکنیکی اعتبار سے بھی اس میں خامیاں نظر آتی ہیں اوراس میں مقصدیت فن پر غالب ہوگئی ہے۔ لمبے اور غیر فطری مکالموں کے ذریعے اس کے فن کو بھی نقصان پہونچتا ہے اور بوجھل پن محسوس ہوتا ہے۔اسی طرح مالک رام نے میدانِ عمل کے علاوہ پریم چند کے ایک اور ناول گئودان کا بھی تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے۔لیکن جس گہرائی سے گئودان کا تنقیدی جائزہ لینا تھااس طرح نہیں لیا گیا گویا سرسری نگاہ ڈال کراس وقت کے تنقیدی روایت کے انداز میں جائزہ لیا ہے۔جوان کے عہد میں تنقیدی رجحان تھے۔ کرداروں کے جذبات نگاری میں وہ اس تہہ تک نہیں پہونچ پائے ہیں جہاں آج کے نقاد رسائی حاصل کر چکے ہیں۔اس ناول کا سب سے تیز اور فعال کردار ہوری ہےاور دھنیااس کی بیوی ہے گوبر ہوری کالڑکا ہے اس ناول میں مالک رام نے سادگی سے کام لیا ہے۔حتی کہ علامتی اور رومانی خیالات کونظر انداز کردیاہے۔گئودان کے پہلے ہی باب کے ابتدا میں گوبر کا باپ ہوری اپنے بیوی دھنیا سے ایک لاٹھی مانگتا ہے۔مگر یہ لاٹھی صرف ایک لاٹھی نہیں ایک بڑھاپے کا سہارا ہے۔مگر یہ سہارا اسکو کہاں نصیب ہوتا گوبر بھولا کی لڑکی جھنیا کو جوکہ بیوہ ہوچکی ہوتی ہےاس کوایک دن لیکر بھاگ جاتا ہےاسی دن سے ہوری کا چین وسکون سب ختم ہوجاتا ہےاور سماج میں رہ کراس کوسزا بھی بھگتنی پڑتی ہے۔اگر چہ ہوری گئودان کا ایک مستحکم کردار ہےلیکن اس کے علاوہ اور جتنے بھی کردار ہیں سب کا رشتہ ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح پیوست ہے اسلئے کہ ناول میں جتنے بھی کردار ہوتے ہیں تو کوئی سست ہوتا ہےتو کوئی چست۔لیکن سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہوتی ہےاور ہر کردار وقت آنے پر اپنی اپنی اہمیت بتاتے رہے ہیں۔

گئودان صرف ایک ناول ہی نہیں بلکہ اس میں انسانی زندگی چلتی پھرتی صاف نظر آتی ہے۔گئودان نے نئی رومانیت کے الگ الگ پہلوؤں کو پیش کیا ہےاوراس کی اہمیت کو زمانے کے سامنے پیش کرنے کی حتی

الامکان کوشش کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہوری کا بھائی ہیرا اپنے بھائی کی گائے کو زہر دیکر مار دیتا ہے لیکن ہوری صبر و استقلال سے کام لیتا ہے۔ اور چھوٹے بھائی کو معاف کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر بات نکلے گی تو بہت دور تک جائیگی چونکہ غربت وافلاس کا زمانہ اور ہر طرف پریشان حالی کے عناصر ہی نظر آتے ہیں۔ ہوری گائے لاکر اپنی غربت دور کرنے کے بارے میں سوچتا ہے مگر جس دن سے یہ گائے لایا اس دن سے اس کی زندگی کے المیے کی ابتدا ہوتی ہے اور جائزہ لیا جائے تو اس ناول میں ایک چھوٹی سی آرزو ناول کے بنیادی اور مرکزی کردار کے جذبات کو مختلف رنگوں میں پیش کرتی ہے اور طرح طرح کے خیالات ناول میں قید ہو جاتے ہیں۔ ان علامتی اور فطری چیزوں سے مالک رام تھوڑا دور نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''پریم چند نے شاید یہ ظاہر کرنے کیلئے اس قصہ کو اس ناول میں داخل کیا ہے کہ جس شخص کا قلم غریبوں کی دنیا پیدا کر سکتا ہے اس کا قلم قارون کی ذریات بھی پیدا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ ہماری تو یہی رائے ہے کہ غریبوں کی دنیا ہوتی یا امیروں کی، مگر تنہا ہوتی تو یہ ناول نہایت شاندار ہوتا لیکن دونوں دنیاؤں کو نامناسب طریقے سے خلط ملط کر دینے سے پریم چند کا یہ ناول ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' ہو گیا ہے۔''[۱۰]

مذکورہ بالا اقتباس میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ غریبوں کی دنیا الگ ہوتی ہے ایسا نہیں ہے، جب کوئی ناول، افسانہ، داستان لکھتا یا پیش کرتا ہے تو اس میں امیری اور غریبی دونوں چیزیں پیش کرتا ہے اسلئے کہ یہی دونوں چیزیں دنیا میں ایک فرق بنائے ہوئے ہیں۔ آدمی جب ایک چیز کو پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے تو اس اکتاہٹ کو دوسری چیز سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح پریم چند کے جتنے افسانے یا ناول ہیں تقریباً غربت، مفلسی کا ذکر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر امیری اور غریبی کے قصے نہ چھیڑتے تو کہانی میں دلچسپی نہ پیدا ہو پاتی اور قاری کے دل میں جو تجسس پیدا ہونا چاہئے وہ نہ ہو پاتا اس لیے ایسے مسائل کو پیش کرنا ضروری ہے۔ لیکن مالک رام کہتے ہیں کہ غریبوں اور امیروں کی دنیا الگ ہوتی تو بہتر ہوتا ایک ہی رخ پیش

کرنے سے یہ ناول اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ قاری کو پریم چند ہر طرح کے لطف سے سرشار کرنا چاہتے ہیں یہی پریم چند کی خوبی ہے اور یہی ان کے افسانے کا حسن ہے جس کے ذریعے توجہ ایک جگہ مرکوز رہتی ہے اور قاری کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے نہیں پاتا ہے۔ داتا دین، ماتا دین، بھولا، ٹنخا صاحب، مس مالتی، پروفیسر مہتہ، جھنگری سنگھ، رائے صاحب وغیرہ بھی اس ناول کے کرداروں میں شامل ہیں، اور اپنی اپنی جگہ سب کردار بالکل مسلم اور مستحکم ہیں۔ لیکن جو علامتی چیزیں ہیں اس سے مالک رام بے خبر ہیں یا انہوں نے ایسی چیزوں کو دھیان نہیں دیا۔ حالانکہ ہر کردار میں کچھ نہ کچھ علامتی چیزیں اور فطری چیزیں ضرور شامل ہیں اور افسانے یا ناول کو جس انداز سے دیکھئے اس میں ایک نیا آہنگ نکھر کر سامنے آتا ہے۔

سلیم جعفر:

پریم چند کے افسانہ اور ناول کے تجزیہ نگاروں میں سلیم جعفر ایک شہرت یافتہ ادیب کا نام ہے۔ سلیم جعفر نے علمی و ادبی اور تصنیفی کام کے ذریعے جو تنقیدی اصول قائم کئے ہیں اس سے ان کی متانت و ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے افسانوں کو بڑی غور و خوض کے ساتھ پڑھ کر اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سلیم جعفر بہترین نقادوں میں شامل کئے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ خود ان کے ادبی کارنامے ان کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور یہ کہ سلیم جعفر نے پریم چند کے افسانوں کو پڑھ کر اور وسیع مطالعہ کر کے ان کے کرداروں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ سلیم جعفر نے ''منشی پریم چند کی مصوری'' پر مضمون لکھ کر پریم چند کی کردار نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ جو ماہنامہ رسالہ 'زمانہ' کانپور 1936ئمیں پیش کیا۔

سلیم نے جس طرح سے پریم چند کی مصوری کی ہے بالکل اس کا نقشہ جوں کا توں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ سلیم جعفر جب کرداروں کی مصوری کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار سب کے سب ہمارے گھر کے ہیں کرداروں سے ایسا لگاؤ ہو جاتا ہے کہ ہم ان سے علیحدہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔

سلیم جعفر نے پریم چند کے تحریروں اور تصویروں دونوں کو پیش کر کے اپنی انفرادیت منوائی ہے اپنی اس تحریری مضمون میں سلیم پریم چند کے تعریف و تحسین بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند نے جو بھی کردار اپنے افسانوں یا ناولوں میں پیش کئے ہیں وہ غیر ضروری اور فرضی نہیں ہیں۔ ان سے کہیں نہ کہیں ضرور

کام لیا گیا ہے اوران کرداروں سے جو تصویرا بھرتی ہے وہ موقع محل کے اعتبار سے ایک مکمل کردار نظر آتے ہیں۔سلیم جعفر کہتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں جو کردار ملتے ہیں اور جتنے بھی ملتے ہیں وہ سب کے سب اپنے آپ میں ایک مثالی کردار ہیں۔جن کے ذریعہ سماج اور معاشرت کی عکاسی بہتر طریقے سے پیش کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔سلیم جعفر نے خاص کر اس مضمون میں ''سوتیلی ماں'' کے تعلق سے بہتر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔اوراس افسانہ کے کرداروں پر بہتر بحث کرنے کی سعی کی ہے۔کرداروں کے تعلق سے اپنے مضمون ''منشی پریم چند کی مصوری'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''فسانہ بہ لحاظ خدوخال کامل ہے۔اگراس میں کوئی پانچواں کردار داخل
کردیا جاتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی اور لطف زائل ہوجاتا۔''[۱۱]

لیکن یہاں سلیم جعفر اپنے منھ میاں مٹھو بن گیے ہیں جو ان چار کرداروں کی باتیں ''سوتیلی ماں'' میں کرتے ہیں تو کیا پریم چند نہیں جانتے تھے کہ پانچواں کردار شامل کرنے سے افسانے میں جھول پیدا ہوجائیگا۔اگر پریم چند چاہتے تو اسی افسانے میں دس کرداروں کو شامل کردیتے اور دسوں کرداروں میں وہ دلچسپی پیدا کر سکتے تھے کہ ہر کردار ایک مکمل تصویر کی شکل میں ہوتا یہ پریم چند کا فن ہے کہ جب جہاں جس طرح کی ضرورت ہوئی اس میں اس کردار کو جگہ دی جو وہاں مکمل طریقے سے سانچے میں ڈھل کر پیش ہوتا ہے۔اب یہ بات کہنا کہ پانچویں کردار سے رفتار سست ہوجاتی ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔تو کیا یہاں سلیم جعفر جانتے تھے کہ یہاں پانچویں کردار کو بھی جگہ دی جاسکتی تھی۔نہیں ایسا نہیں ہے تو کیا یہ پریم چند نہیں جانتے ہیں کہ اگر پانچواں کردار شامل ہونے کی جگہ ہوتی تو پریم چند نہیں چوکتے اور پانچواں ہی کیا کئی اور کرداروں کو شامل کر کے افسانے کو لطف آمیز بنا سکتے تھے۔عربی میں کہا جاتا ہے کہ (المعنیٰ فی بطن الشاعر) یعنی شاعر ہی اپنے شعر کا بہتر مطلب سمجھ سکتا ہے۔دوسرے لوگ صرف خیال کر کے اپنے اپنے اعتبار سے معنی و مطالب نکالتے رہتے ہیں یہ ان کی اپنی سوچ و تخیل ہے۔اس طرح پریم چند نے بھی اپنے افسانوں کے تعلق سے جو بہتر جانا اور سمجھا اس کو پیش کردیا۔اوراب لوگ اپنے اپنے فکر و ذہانت کے سمندر کی غوطہ زنی کر کے نئے معنی نکالیں یا جو بات منشی پریم چند نے کہہ دیا بس وہ پتھر کی لکیر ہوگئی۔اوراس پر چاہے جتنے بھی تبصرے ہوں پریم چند پر کوئی

فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ ہر شخص صرف ان پر تبصرہ کر کے ان کی قدر و قیمت متعین کر سکتا ہے۔

پریم چند اپنے علوم و فنون پر مکمل دسترس رکھتے تھے اس لیے ڈاکٹر گریہم بیلی نے گو اپنے تصیف ''تاریخ ادب اردو'' میں اس کا التزام کیا تھا کہ جو مصنف بقید حیات ہیں ان کا ذکر اگر نہیں ہوگا تو بھی وہ اردو کا افسانہ سناتے سناتے مرحوم کا ذکر کر ہی گیے۔ پریم چند ایک ایسی شخصیت تھی جس پر نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں نے نوکِ قلم کو جنبش ضرور دی ہے۔ اس لیے کہ پریم چند نے دیہات کا جو منظر پیش کیا ہے۔ جہاں ہر جگہ شادابی و خوشگواری ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیت اور خوبصورت باغ ہیں وہیں ساہوکار، امیر اور غریب کے جو مسائل پیش کئے ہیں وہ اپنے آپ میں ایک نئی دنیا پیش کر دینے کے مترادف ہے۔ اب یہاں گریہم بیلی کا ایک اقتباس دیکھئے جس سے پریم چند کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ''ناولوں کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا بڑا ناول نگار پیدا نہیں ہوا جو کریکٹر کے ارتقاء کی تصویر کھینچ سکے اور پلاٹ تیار کر سکے۔ فسانہ نگاری ترک کر کے طویل ناول شروع کرنے سے پہلے پریم چند نے ایک باب میں قریب قریب ایک بلند درجہ حاصل کر لیا ہے ان کے افسانے بہت قابلِ تعریف ہوتے تھے۔''[۱۲]

یہ ہے کمال پریم چند کا کہ جو چاہتا نہیں ہے وہ بھی تعریف و توصیف سے اپنے قرطاس و قلم کے ذریعہ پریم چند کی اہمیت بتا رہا ہے۔

سلیم جعفر کا اس افسانے یا ناول میں یہ کہنا ہے کہ پریم چند اپنی تحریروں کے ذریعے حقیقت نگاری کو ترجیح دیتے تھے۔ خیالی باتوں کو اپنے صفحۂ قرطاس پر جگہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جب کبھی پریم چند کچھ کہتے ہیں تو اس میں اصلاحی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ پریم چند اپنی زندگی میں بدگمانی کے قائل نہیں ہیں اور نہ تو یہ کسی کو بدگمان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا دل ایک حساس دل تھا طبیعت میں بڑی سوز و گدازی تھی۔ زمانے اور سماج میں جو چیزیں دیکھیں ان کو ایک کردار کی شکل دے کر ناول یا افسانے میں ڈھال دی ہے۔ حقیقت نگاری اور کردار نگاری کے بارے میں اپنے مضمون ''منشی پریم چند کی مصوری''

میں رقم طراز ہیں۔

''ہندوستانیوں کا عام خیال ہے کہ سوتیلی ماں بچوں کو اچھی طرح نہیں رکھتی اور بچوں کے باپ اکثر اس بارے میں اپنی دوسری بیوی سے بدگمان رہتے ہیں۔لیکن بدگمانی بہر حال بدگمانی ہے اس لیے اکثر اس کی کچھ اصلیت نہیں ہوا کرتی۔ پریم چند ملک میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ واقعات کی تفسیر بدگمانی کے رنگ میں نہ کرنی چاہئے بلکہ حقیقت کو تلاش کرنا ضروری ہے چنانچہ اپنے مشہور قصہ ''سوتیلی ماں'' میں انھوں نے چار کردار مقرر کیے ہیں۔(۱) ایک وہ شخص جس کی بیوی مرچکی ہے اور اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔(۲) پہلی بیوی سے اس کا لڑکا۔(۳) دسری بیوی یا اس لڑکے کی سوتیلی ماں۔(۴) ایک دوست۔

غور کیجئے کہ یہ اتنے گنے کردار کس قدر ضروری ہیں۔آپ ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ چوتھا بظاہر بیکار نظر آتا ہے لیکن یہ اس لیے ضروری ہے کہ بیوی کی طرف سے شوہر کو جو بدگمانی ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ صرف بچہ کے ذریعے سے لگ سکتا ہے اور بچہ چونکہ طبعاً اپنی سوتیلی ماں کے سامنے اس کی شکایت نہیں کر سکتا اس لیے اس کو ایسا موقع ملنا چاہئے جہاں وہ کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کر سکے۔''[۱۳]

اس طرح پریم چند کے ناولوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اور اگر دیکھا جائے تو پریم چند نے اس کو افسانے کا رنگ دیا ہے مگر کہیں نہ کہیں اس میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ پریم چند کے سبھی ناول اور افسانے سماج کے ترجمان ہیں ان کے افسانوں میں ایک جذباتیت ضرور نظر آتی ہے۔مگر ایسا نہیں ہے کہ اس جذبات میں پریم چند آ کر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سلیم جعفران افسانوں اور ناولوں کی تہہ داری میں ضرور گیے ہیں۔لیکن

وہی سماجی باتیں کہیں ہیں جو عام نقادوں نے کی ہیں نئے پہلو بھی ان کے یہاں روپوش ہے۔بس کرداروں کی وضاحت کر کےعوام اور قاری کے لیےآسان اور عام فہم کر دیا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اس کو بہتر طریقے سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔

ایچ ایل گاندھی:

ایچ ایل گاندھی پریم چند کے عہد کا ایک اہم نام ہے۔ان کا ذکر رسالہ ''زمانہ'' 1936ء میں ملتا ہے جنہوں نے علمی وادبی خدمات انجام دی ہیں۔اور یہ تنقیدی نگاہ بصیرت کے ساتھ اردو دنیا میں داخل ہوئے اس لیے ان کی علمی لیاقت کے چراغ آج بھی روشن ہیں۔اس طرح انھوں نے اپنے مطالعے میں پریم چند کو بھی جگہ دی۔ان کا ایک اہم مضمون ''پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر'' ہے جو رسالہ ''زمانہ'' کانپور 1936ء میں ملتا ہے۔انھوں نے اس میں ان کے فن اور ان کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کے فن کو سمجھ کر ان کے آرٹ پر گفتگو اور سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے اور حتی الامکان کوشش یہی کی ہے کہ آرٹ کو بہتر طریقے سے بیان کرنے میں کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے پریم چند کا آرٹ بیان کرتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جانبدارانہ طریقے سے پریم چند کے آرٹ پر روشنی ڈالی ہے۔اور تحریروں کی گہرائی تک نہیں پہونچ پائے ہیں جہاں تک ان کو پہونچنا چاہئے تھا۔ان کے وقت کے بہت سے ادیبوں نے جس طرح پریم چند پر تبصرے کئے ہیں۔ بالکل اس روایتی انداز کو اپناتے ہوئے اور انھیں کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے پریم چند کی تعریف سے ہی سروکار رکھا ہے۔ان کو پریم چند کی تحریروں میں کہیں کوئی خامیاں نظر ہی نہیں آئیں جو ان کی علمی لیاقت کیلئے باعثِ شرم ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تہہ داری میں ہیرے جواہرات ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی ہے۔جب ہیرے جواہرات کے تلاش کیلئے غوطہ زنی کی جاتی ہے تو اس میں کچھ بیکار چیزیں بھی ملتی ہیں اور کچھ اچھی بھی تو اگر بیان کیا جائے کہ غوطہ زنی میں ہم کو وہ ساری چیزیں ملی ہیں جس کی ہم کو تلاش نہیں تھی تو کوئی برا نہیں ہے۔اس طرح گاندھی جی کو صرف ہیرے ہی مل گیے۔وہ بھی بغیر کسی محنت و دریافت کے اور اس کو بیان کر دیا۔ ذرا محنت اور توجہ سے کام لیتے تو ان کی تحریروں میں اچھائیوں کے ساتھ کچھ خامیاں بھی نظر آتیں جس طرح بہت سے نقادوں نے بیان کئے حالانکہ کہیں کہیں

پریم چند کی تحریروں میں اوران کے کرداروں میں لچک دکھائی دیتی ہے۔ان کے افسانے اورناول ابتدائی دور کے ہیں اس لیے ان میں کچھ کمیاں ضرور محسوس ہوتی ہیں۔اورکہیں کہیں جذباتیت بھی نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دیہاتی منظرکشی میں پریم چند کا ایک نمایاں کردار رہا ہے۔ پریم چند کی اوران کے افسانوں کی تعریف گاندھی نے بہت جم کر کی ہے اورایسا محسوس ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو کہیں کوئی خامی نظر ہی نہیں آئی ہے پلاٹ کے تعلق سے گاندھی جی رقم طراز ہیں۔

''منشی پریم چند ایک زبردست داستان گو ہیں۔ان کے ناول دلآویز اور فنی خامیوں سے مبّرا ہیں۔ان کا پلاٹ ہمیشہ نہایت دلکش اور چست ہوتا ہے، ان کے ناول مجلسی معاشرتی،قومی اور ملکی واقعات کا آئینہ ہیں۔ان کی بنیاد میں اظہار حقیقت کا خیال اوراصلاح کا جذبہ کارفرما رہتا ہے، دراصل ان کے سب قصے ہماری روز مرہ زندگی کی عکسی تصویریں ہیں۔اوران کو پڑھ کرایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی داستان حیات کے کسی واقعہ کو پڑھ رہے ہیں۔'' [۱۴]

ایچ ایل گاندھی نے پریم چند کے تعلق سے یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کی ترجمانی پیش کر کے سماج ومعاشرے کوایک عبرت آموز سبق دیں اس لیے کہ جب سماج ومعاشرے میں برائیاں عام ہوجاتی ہیں تو ان کی اصلاح لینے کیلئے کسی نہ کسی چیز کواصلاح کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اورانھیں کرداروں کے ذریعے اس برائی کو واضح کر کے اس کوختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس لیے گاندھی کی نگاہ فنی خوبیوں کے بجائے ان کے کرداروں پر جا کرٹکتی ہے اوروہ صرف سماج کے اصلاحی عناصر کوتلاش کرتی ہیں۔''غبن'' پریم چند کے ناول سے کچھ کرداروں کے تعلق سے اقتباس دیکھئے۔

'''غبن' میں رما کوایک کمزورنوجوان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، وہ حالات کے ہاتھوں بالکل کٹ پتلی بن گیا ہے،اس میں جرأت نہیں کہ ان کا مقابلہ کرسکے،رتن واقعی رتن ہے، دنیا کے مکروفریب سے بے نیاز!

چالپا کا کردار فطرت انسانی کا دلکش مطالعہ ہے شروع میں وہ فیشن پرست، لاپروا اور سوسائٹی میں امتیازی شان حاصل کرنا چاہتی ہے، لیکن اس کے شوہر کا فرار اس کے نظامِ زندگی کو یک لخت بدل دیتا ہے جس سے ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ مصمم عزم کر کے شوہر کی تلاش میں نکلتی ہے، اور اپنی بلند حوصلگی سے اس کو روحانی گراوٹ سے بچالیتی ہے۔ اگر جالپا کی جگہ کوئی اور کمزور دل عورت ہوتی تو راما بابو کی کشتی حیات سنگین واقعات کی چٹانوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتی۔'' ۱۵

گاندھی کو کردار کے تعلق سے بہتر تو مانا جاتا ہے۔لیکن اس میں کوئی وہ کام نظر نہیں آیا جسکی ضرورت آج کے قاری اور نقاد کو ہے۔آج کل یہ رواج ہے کہ جب بھی کسی متن افسانہ، ناول، نظم وغیرہ کو پڑھا جاتا ہے تو اس میں سب سے پہلے تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس میں فن کے تعلق سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کون سی نئ بات کہنے کی سعی کی گئی ہے گذشتہ ادیبوں کی طرح آپ نے بھی کوئی نیا طریقہ نہیں اپنایا بس اسی لکیر پر چلتے گیے جس کو کچھ ادیب و نقاد وقائم کر گیے تھے۔کرداروں کے تعلق سے اگر گاندھی بات نہ کرتے تب بھی افسانہ یا ناول پڑھ کر پریم چند کے کرداروں کی اہمیت کا اندازہ قطعی طور پر ہو جاتا ہے اور ہر کوئی پریم چند کے ناول کو بہتر طریقے سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور آرام سے سمجھ بھی لیتا ہے اور اس کی تہہ تک آرام سے پہونچ بھی جاتا ہے۔اس لیے کہ پریم چند نے ناول یا افسانہ، خطوط، ڈرامہ وغیرہ ایسے سادے اور دلکش انداز میں تحریر کئے ہیں کہ ان کو پڑھنے اور سمجھنے میں قاری کو ذرہ برابر پریشانی نہیں ہوتی اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ پریم چند کی تحریروں میں ایسی جادو بیانی ہے کہ اگر کسی نے افسانہ شروع کر دیا تو بغیر مکمل کئے اس کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے یہ پریم چند کا تحریری امتیاز ہے ورنہ بہت سے لوگوں نے بھی افسانوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔لیکن ان کو پڑھنے اور سمجھنے میں قاری کو دقت پیش آتی ہے۔اور وہ دلکشی اور دلچسپی بھی نظر نہیں آتی۔جس کے لیے پریم چند جانے جاتے ہیں۔گاندھی نے صرف کرداروں اور تحریروں سے سروکار رکھا

ہے۔اس لیے کرداروں کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس پیش ہے۔

''پردۂ مجاز'' میں چکر دھر کو ایک نڈر بے دھڑک اور دلیر آدمی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔وہ غریبوں کا سچا ہمدرد اور کسانوں و مزدوروں کا پکا خیر خواہ ہے، اور ہندو مسلم فساد کو سلجھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے منور ما سچ مچ دیوی ہے۔اس کا وجود کئی تاریک دلوں کے لیے چراغِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ وہ چکر دھرے سے محبت کرتی ہے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے،لیکن اس کی محبت گناہ کی آلائشوں سے قطعی پاک ہے۔ اس کی شادی ایک راجہ سے ہوجاتی ہے، وہ رانی بنتی ہے،لیکن اپنے عروج سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتی، بلکہ ہمیشہ غریبوں کسانوں اور دکھیوں کا ساتھ دیتی ہے۔''[۱۶]

پریم چند کے ناولوں اورافسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو جو چیز ہم کو ان کے افسانے پڑھنے کی طرف مائل کرتی ہیں وہ ان کے کرداراوران کے زبان کی سادگی ہے۔ جو ہم کو برابر لذت سے سرشار کئے رہتی ہے۔اور دیہات کی جو منظر کشی کی ہے۔اس کا کہنا ہی کیا ہے اس کو پڑھنے سے دل یہ چاہتا کہ ہم بھی شہر کو چھوڑ کر کسی دیہات کی زندگی گزاریں۔اس لیے کہ جو ماحول اور کردار ہم کو ان کے افسانوں کے ذریعہ ملتا ہے تو اس میں بڑی کشش نظر آتی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہاں ساہو کاروں اورامیروں کا سکہ چلتا ہے۔مزدور اور غریب کسان مارے مارے پھرتے ہیں اوران کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا ہے۔شہروں میں وہ ساری چیزیں ناپید ہیں جو پریم چند نے دیہات کے گلیوں اور پگڈنڈیوں میں دکھا دی ہے۔ یہ پریم چند کا اپنا معیار ہے جوانھوں نے اتنے سادھے اور سلیس انداز میں پیش کیا۔گاندھی نے انہی پہلوؤں کواجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کوشش کیا؟ صرف پریم چند کی تعریف میں ہی اپنے مضامین کو تحریر کیا ہے۔ جوخودان کی اپنی پزیرائی میں بھی شامل ہے۔

منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی:

منشی جگیشور ناتھ نے اپنے مضامین ''منشی پریم چند کی ادبی خدمات'' اور ''منشی پریم چند مرحوم'' کے ذریعے پریم چند کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جو رسالہ ماہنامہ آجکل دہلی 1943 میں شائع ہوا اور کوشش یہ رہی ہے کہ پریم چند کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کریں لیکن اپنے اس تنقیدی مضامین میں سب پرانے ادیبوں کی طرح روایتی انداز اور سب کی بنائی ہوئی تنقیدی سفر پر چلنے کیلئے ہی راضی ہوئے۔ خود کوئی نئی بات بیان کرنے کی کوشش نہیں کی بس وہی پرانی گھسی پٹی باتیں دیہات کی عکاسی منظر کشی میں کمال وغیرہ۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود جگیشور ناتھ نے اپنے جذبات کی عکاسی پیش کی ہے اور انھوں نے جو تحریریں پریم چند کی پڑھیں ان پر اظہارِ خیال کیا اور یہ ضروری ہے بھی کہ ایک ادیب اگر دوسرے ادیب کے تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لے کر اس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اور بسا اوقات بہت چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو خود کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ لیکن دوسرے لوگوں کو وہ چیز دور سے ہی صاف نظر آجاتی ہے۔ اور یہ ایک فطری اور قدرتی چیز ہے کہ دوسرے انسانوں کی نگاہ دوسرے کے عیب کو دور ہی سے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ جس آنکھ سے عیب جوئی کی ہے تو اس کا تقاضا یہ بھی بنتا ہے کہ اس میں خوبیاں بھی تلاش کی جائیں۔ اس طرح ایک بہتر نام جگیشور ناتھ کا بھی ہے انھوں نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں، ڈراموں اور خطوط نویسی کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ اور اس کے تعلق سے گویا بھی ہوئے ہیں۔ جگشور ناتھ نے پریم چند کو ادبی حیثیت سے 4 مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) پریم چند بحیثیتِ ادیب اور افسانہ نگار (۲) پریم چند بحیثیتِ ناول نویس

(۳) پریم چند بحیثیت ڈرامہ نگار (۴) پریم چند بحیثیتِ اخبار نویس

یہ چار چیزیں پریم چند کی ادبی اور علمی ہتھیار ہیں۔ جس کے ذریعے پریم چند نے بڑے بڑے ادیبوں کو شکست دی ہے اور اپنی فتح کا پرچم میدانِ اردو پر لہرادیا۔

جگیشور ناتھ نے پریم چند سے قبل کی بھی ادبی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند سے پہلے جو ادیب اور شعرا کی تصنیفی روایت تھی اس میں صرف حسن و عشق، عشقیہ غزلیں، مثنویاں، عریاں حیا سوز داستانیں اور فحش قصے کہانیوں کی دنیا میں لوگ گم تھے اور اس پر سارے ادبا اور شعرا کی نظریں تھیں کہ کون کس

سے آگے آتا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ پریم چند سے قبل رتن ناتھ سرشار نے ناول کا سنگِ بنیاد رکھ کر اس کے ساتھ ساتھ کچھ بہترین خاکے اور اپنے تراجم کے ذریعے ادبی تسلسل کو تقویت دی تھی لیکن اس کے باوجود ہمارا ادب ناقص اور ادھورا تھا اور ایک ایسے شخص کا انتظار کر رہا تھا جس سے ادبی دنیا کو تشنگی سے سیرابیت حاصل ہو ایسے وقت میں پریم چند کا نزول ہوتا ہے۔ جو سماج کی عکاسی، اور عوامی نفسیات کے نباض بن کر ابھرے اور اردو دنیا پر چھاگیے۔ حالانکہ پریم چند کا ابتدائی دور کچھ خوشگوار نہیں گزرا لیکن انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے پوری انسانیت کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی ہے۔ تصنیفی شروعات میں انھوں نے کچھ بڑے ادیبوں اور فنکاروں کی تحریروں سے بھی اثرات قبول کئے جن میں ہندوستان کے ادیبوں کے علاوہ مغربی ادیب بھی شامل ہیں لیکن انھوں نے سبھی ادبا کا مطالعہ تو کیا اور اثرات بھی قبول کئے لیکن تحریروں میں صرف اور صرف پریم چند ہی کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ جگیشور ناتھ نے پریم چند کو جن حصوں پر مشتمل کیا ہے اس میں سب سے پہلے انھوں نے افسانے کی تعریف میں فقرے بیان کئے ہیں۔ اور افسانے کی تعریف کرتے ہوئے جگیشور ناتھ لکھتے ہیں:

> ''منشی جی کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہماری روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور اس کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو پیش کر کے ہمارے دلوں پر لافانی نقوش مرتسم کر دیتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ ڈرامیٹک اور اس درجہ جامع ہوتا ہے کہ کوزہ میں دریا کو بند کر دینے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ ان کا مخصوص طرز بیان ہے کہ جو بیک وقت سادگی و رنگینی سے ہمدوش اور تصنع سے خالی و عاری رہتا ہے۔ ان کی ہر کہانی واقعات کی خشک تشریح کے بجائے جذبات کی دل دوز ترجمانی کرتی ہے۔'' [12]

اس طرح جگیشور ناتھ نے ترتیب وار ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور اخبار نویسی پر مکمل روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سبھی میدانوں میں پریم چند نے جس شان و شوکت کے ساتھ اپنی بلندی کے علم نصب

کئے ہیں اس تک شاید کوئی صدیوں تک بھی نہ پہونچ پائے۔

اس سلسلے میں جگیشور ناتھ نے علامہ اقبال کا ایک شعر پیش کیا ہے جس سے پریم چند کی شخصیت کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

پریم چند کی شخصیت کچھ اس طرح کی ہے کہ جو لکھ دیا بس وہ پتھر کی لکیر ہوگئی اور ایسے ایسے نقوش قائم کردئے جن کو نہ تو کوئی طوفان اڑا سکتا ہے اور نہ ہی ایسے دلدل پہ اپنی تحریر بنائی کہ کوئی بارش اس کو مٹا سکے جو لکھ دیا بس وہ لافانی ہے اور اس میں حشو و زوائد کی گنجائش قطعی نہیں ہے۔ جگیشور ناتھ نے اپنے اسی مضمون میں پریم چند کی دل ربا تحریروں کے تعلق سے لکھتے ہیں ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کردار نگاری واقعات کی جدت، تخلیق و ترتیب کے محاسن، مکالموں کی ندرت اور فطرت بشری و نظری کی مصوری، غرض ایسی کون سی بات ہے جس کی منشی پریم چند کے یہاں بہتات نہ ہو۔''[۱۸]

اپنے ایک رسالے میں جگیشور ناتھ پریم چند کے تعلق سے کچھ اور باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''منشی جی کے دور سے پہلے ہمارا افسانوی ادب کسی خصوصیت کا حامل نہ تھا بلکہ محض رکیک اور اسفلی جذبات کو مشتعل کرنے کا ذریعہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا جب کہ وہ ایک ایسی مردہ قوم کا سرمایۂ حیات تھا جسکے مشاہیر ادب محض مفروضہ اور تخیلی عشق کی معاملہ بندی، محاکات اور زبان کے چٹخاروں ہی کو معراجِ کمال سمجھ کر دادِ نشاط دے رہے تھے۔ اور اُن کے اذکار ورشحاب پر بھی خود اُنھیں کی طرح موت کی سی بے حسی طاری تھی۔''[۱۹]

جگیشور ناتھ نے منشی پریم چند کی تحریروں کا مطالعہ جی کھول کے کیا ہے اور سبھی ادیبوں سے بہتر رائے پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ آج کل کے ناقدوں کی طرح کوئی نیا زاویہ یا نیا آہنگ تخریج کرتے ہیں لیکن روایتی ادیبوں سے بہتر طریقے سے جگیشور ناتھ نے پریم چند کو پڑھا جانچا اور پرکھا اور ان کے متعلق اپنی آرا پیش کیں۔جگیشور ناتھ نے پریم چند کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ایک فلمی سین ہمارے روبرو ہو جاتی ہے اور اس سین میں ساری چلتی پھرتی تصویریں نظر آجاتی ہیں۔اس لئے کہ جگیشور ناتھ کے تحریر کا انداز بالکل نیا اور جدگانہ معلوم ہوتا ہے۔ان کی تحریروں سے ایک الگ دلچسپی قائم رہتی ہے۔لیکن یہ جب پریم چند کو بیان کرتے ہیں یا پریم چند کی تحریروں کی بات کرتے ہیں تو خود پریم چند کی تحریروں کے ساتھ ان کا بھی انداز پریم چند جیسا معلوم ہونے لگتا ہے یہ اور بات ہے کہ پریم چند جیسی دیہاتی زندگی کی عکاسی نہیں پیش کر سکتے مگر اپنی تحریروں کے ذریعے ایک خوشنما رنگ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔جگیشور ناتھ کی تحریریں الگ ہیں لیکن دلچسپ بھی ہیں اور دلچسپ کیوں نہ ہوتیں یہ پریم چند جیسی ایک لازوال شخصیت کو قلمبند کر رہے تھے۔منشی پریم چند اور ان کے دہقانی ماحول اور ان کے ناول کے تعلق سے ایک اقتباس دیکھئے جس سے پریم چند کی ترجمانی جگیشور ناتھ کی زبانی ہے لکھتے ہیں۔

> ''منشی جی ہندوستانی دیہات کے چشم و چراغ تھے۔اسی ماحول میں اُن کی ذہنی نشو ونما ہوئی تھی۔ اسلئے ناممکن تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ اور جب اُن کا قلمِ حقیت رقم دُنیائے افسانہ مین نوع بہ نوع گلپاشیاں کرتا تو وہ اپنے غریب کسان بھائیوں کو بھول جاتے۔ چنانچہ منشی جی نے دیہاتی زندگی کی صحیح نمائندگی کرنے میں وکالت کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور ایسے ایسے حسین مرقعے پیش کئے ہیں کہ جنکی داد نہیں دی جا سکتی۔ کہانیوں سے قطع نظر ان کے بعض ناولوں مثلاً چوگانِ ہستی، میدانِ عمل اور گئودان وغیرہ کی بنیاد ہی دیہاتی زندگی ہے۔غرض موجودہ ہندوستانی زندگی کا کوئی ایک بھی پہلو اور اس کا

کوئی ایک بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو لائق مصنّف کے سحر طراز قلم کی حسن کاریوں سے محروم رہا ہوتا ہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ منشی جی کے طویل افسانے اردو کا بے عدیل سرمایہ ہونے کے باوجود بھی ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ہم پایہ نہیں ہیں حالانکہ ان میں بھی ہندوستانی ماحول کے بیشتر حسین ورنگین مرقعے موجود ہیں۔'' [۲۰]

اس اقتباس سے جگیشو رناتھ نے پریم چند کی ساری خصوصیات پیش کردی ہیں اور جہاں تک جگیشور ناتھ نے پریم چند کو پرکھا اور تنقیدی بصیرت سے پریم چند کی تحریروں کا جائزہ لیا اور اپنی بلند پرواز تخیل کے ذریعے ساری کیفیت کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔اور جگیشو رناتھ نے بعض ناولوں کے تعلق سے اپنا بہتر نظریہ پیش کیا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ افسانوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو بھی پڑھ کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے اور یہی نہیں بلکہ پریم چند کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں دیہات کی منظر کشی کا عکس بھی نمایاں کرتے ہیں۔اس سے ان کی تنقیدی اہمیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔لیکن جیسا کے ابتدا میں بتایا جاچکا ہے کہ روایتی ادیبوں کی طرح انھوں نے وہی ساری چیزیں بیان کی ہیں جو عام ادیب بیان کرتے ہیں اور یہ کوشش نہیں کی ہے کہ ان کے اندر کوئی علامتی اور فنی خوبیوں کو تلاش کریں لیکن اس کے باوجود پریم چند کا احاطہ بہت خوبصورت طریقے سے کیا ہے اور کوشش یہ کی ہے کہ پریم چند کا کوئی بھی پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے۔

ساغر نظامی:

ساغر نظامی ایک اہم ذہین اور بے لاگ نقاد ہیں۔انھوں نے اردو کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور اپنے مضامین اور تحریروں کیذریعہ اردو ادب کے بہترین ادب نواز شمار کئے جاتے ہیں۔اردو ادب کی بہت ہی معروف شخصیت منشی پریم چند پر بھی اپنی تحریروں کے ذریعے اظہارِ خیال کیا ہے ایک مضمون ''پریم چند کا ذہنی ارتقا'' تصنیف کی جو ماہنامہ رسالہ آجکل یکم جون 1945ء شائع ہوا۔انھوں نے منشی جی کی شخصیت اور فن کو ان کی تخلیقات اور حالاتِ زندگی کے تناظر میں تجزیاتی اور معاشرتی زاویہ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے حیات وخدمات پر بہترین طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔اور ساتھ ساتھ پریم چند کی اہمیت اور انکی

تحریروں کی ساز اور نغمے کو بھی سراہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساغر نظامی نے پریم چند کو بہت ٹھر ٹھر کے پڑھا اور سمجھا ہے۔ تبھی ان کے حیات اور خدمات کو تحریری شکل دینے میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے اور ہر چیز کو بڑے سلیقے سے بیان کی ہے۔

ایک ادیب بننے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت پڑھتی ہے اس کو ساغر نظامی نے مکمل طریقے سے اور بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ساغر نظامی نے پریم چند کی پوری خدمات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے پریم چند کے تعلق سے بہت کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک چیز یہ ہے کہ انھوں نے صرف حیات و خدمات پر ہی انحصار کیا ہے۔ پریم چند کے فن اور علامتی چیزوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اور یہ ہونا ہی چاہیے کہ جو شخص کسی ادیب کی زندگی اور اسکی خدمات کا جائزہ لے رہا ہو اس کے لیے بہتر ہے کہ بس ایک ہی پہلو کو نمایاں کرے ورنہ مصنف کی الجھن بڑھنے کے ساتھ قاری کی بھی الجھن بڑھنے لگتی ہے وہ اس لیے کہ جب ایک بات بیان کی جائے گی تو قاری یا سامع تسلسل کے ساتھ پڑھتے جائیں گے اور افسانے یا ناول کے ساتھ مکمل طریقے سے چلنے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے نظامی نے جو رویہ اپنایا ہے وہ بہتر اور اچھا ہے انھوں نے پریم چند کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پریم چند ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے اپنی شہرت اس طرح سے حاصل کی جو بعض لوگوں کو تو شاید صدیوں میں نہیں ملتی یہ پریم چند کی ہی انفرادیت ہے۔ نظامی نے پریم چند کی مزاجی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا مزاج بیداری، اصلاح اور خود شناسی کی طرف مائل تھا۔ اور ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کے بہت شوقین تھے اس لیے 15 سال کی عمر سے ہی کہانی، قصہ، ڈرامہ، ناول اور افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اگر چہ ابتدائی دور میں پریم چند کا فن کمزور نظر آتا ہے لیکن عمر کے آخر حصے میں جو کچھ بھی تحریر کیا وہ بہت ہی پر اثر ہے۔ نظامی نے حتی الامکان پریم چند کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی رہے ہیں، انھوں نے ''پریم چند کے ذہنی ارتقا'' پر مکمل روشنی ڈال کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اصل پریم چند کیا تھے اور کیا ہیں اور انھوں نے کس کس سے اثرات قبول کئے اور ان کا اردو ادب میں کیا مرتبہ تھا۔ اسی سلسلے میں پریم چند کے تعلق سے نظامی کا ایک اقتباس دیکھیں:

''پریم چند دراصل ٹیگور ہی سے متاثر ہیں۔اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی کہانیاں شاعرانہ رنگینیوں سے خالی ہیں۔تاہم وہ سرمستی جو شاعرانہ دماغ کا حصہ ہوتی ہیں۔زیادہ نہیں پائی جاتی،مگر جذبات، جوش،اور توازن کی کہیں کمی نہیں۔اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائیگا کہ پریم چند درجہ بدرجہ تکمیل کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔یہ خیال زیادہ صحیح نہیں کہ ادیب زمانے کو پیدا کرتا ہے بلکہ زمانہ ادیب کو خلق کرتا ہے۔ پریم چند کے ادب کا پس منظر مغربی تمدن یا ملا جلا مغربی کلچر نہیں ہے بلکہ ان کی افسانہ نگاری کا پس منظر غریبوں کے جھونپڑے، روزمرّہ کی زندگی اور درمیانی درجہ کے ہندوستانیوں کی حیات ہے۔اور وہ اس میں جس تناسب کے ساتھ قدیم ہندوستانی تمدن کا رنگ بھرتے ہیں۔اور اسی لحاظ سے وہ اخلاق کی سادگی اور مشرقی تہذیب کے مستقل علمبردار ہیں،ان کا ادب یکسر ماحول سے متعلق ہے ان کے ادب کی روش اور یہ فطری تقاضہ نتیجہ ہے ان ملکی تحریکات کا جو سماجی بیداری سے پیدا ہوئیں۔اور جن اثرات نے حالؔی، اکبؔر،اور اقبال کو پیدا کیا۔جس طرح اکبر اور اقبالؔ نے اپنی شاعری میں اسلامی اور مشرقی تصورات پیش کیے۔پریم چند نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ ہندوستانی روایات میں ایک نئی روح دوڑا دی۔''۲۱

اس سلسلے میں ساغر نظامی کہتے ہیں کی پریم چند اتنے بڑے ادیب اور فنکار ہونے پر بھی لہجے میں ذرہ برابر تلخی اور کڑواہٹ نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ انکساری ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ پریم چند نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہی ان کی شہرت کا اصل راز بن گیا۔جن کے ذریعے بڑے بڑے ادبا پر فوقیت حاصل کی۔ پریم چند نے ہر کہانی، ناول،اور افسانے کو اس طرح سنوارا کہ دنیا دست بستہ کھڑی دیکھتی رہ گئی اور پریم چند کی شخصیت اس

زمیں سے چرخ دہم پر پہنچ گئی۔ ان سب چیزوں سے مشہور ہونے کے بعد بھی اپنے طرزِ تحریر سے مطمئن نہیں تھے اس سلسلے میں ساغر نظامی نے پریم چند کے ایک خط سے ایک اقتباس یوں نقل کیا ہے۔

''مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا ہے کہ کون سا طرزِ تحریر اختیار کروں
کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں تو کبھی آزاد دھلوی کے پیچھے چلتا ہوں۔ آجکل
کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں تب سے طبیعت کچھ اسی رنگ
کی طرف مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا ہے۔'' ۲۲؎

نظامی نے پریم چند کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں انھوں نے بڑی حد تک حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جس طرح مذکورہ بالا اقتباس پریم چند نے خود بیان کیا ہے اور اپنی کچھ کمزوریاں بھی بیان کیں مگر اس کے باوجود نظامی نے پریم چند کی جذباتی ترجمانی بھی پیش کی ہے۔ کہتے ہیں کہ پریم چند کی راہ بالکل الگ ہے اور دوسرے لوگوں سے مختلف ہے اسلئے کہ جو پریم چند نے افسانے یا ناول تحریر کئے ہیں اس طرح سے دوسرے ادیب پیش کرنے سے قاصر رہ گیے تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ پریم چند پر شعرا یا ادبا کے اثرات نمایاں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پریم چند خود ایک جگہ اپنی تحریر کے ذریعے انکساری کے ساتھ چند جملے لکھتے ہیں وہ یہ ہیں:

''میری طرزِ تحریر پر کچھ اثر ٹیگور اور بشن نارئن در کا ہے'' ۲۳؎

اس سلسلے میں نظامی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پریم چند نے کچھ ادیبوں کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتدائی دور میں ان حضرات کی کتابیں پریم چند کے زیرِ مطالعہ آئی ہوں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ہی پریم چند کے جذبات جاگے ہوں اور ان ہی ادیبوں کی تحریروں پر قلم اٹھانے کیلئے پریم چند کو ادب نویسی کیلئے ابھارا ہو۔ اس لیے کہ پریم چند نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا کچھ انگریزی اور کچھ ہندی وغیرہ کی کتابیں پڑھیں لیکن ان کو پڑھ کر پریم چند کے جو جذبات نمایاں ہوئے ان میں انگریزی کلچر اور ادب لکھنے کے بجائے اپنی ملکی حالات، سماج و معاشرے کی عکاسی پیش کی اور خاص طور سے دیہات کی ایسی منظر نگاری کی جہاں دوسرے ادیب نہیں پہونچ پا رہے تھے اور اُن کی تحریروں میں شہر اور شہر کی ساری جلوہ سامانی کے

عناصر موجود ہوتے ہیں۔لیکن پریم چند نے اپنے دیہاتی مناظر سے وہ سوز وتمازت پیش کی کہ جس کو پڑھ کر سامعین کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے نم ہو جاتی ہیں۔ یہ پریم چند کا ہی جادوئی کارنامہ ہے جو ہمارے سامنے کے ہوتے ہوئے بھی اتنے پُراثر اور حیرت انگیز ہیں جو ہم کبھی سوچ نہیں سکتے تھے۔

نظامی نے پریم چند کے ذہنی ارتقا پر روشنی ڈال کر ان کے اسلوب اور ناول نگاری پر کافی روشنی ڈالی ہے اور ابتدا سے لیکر انتہا تک ناولوں کو شمار کرا کر ان کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ چاہے وہ ہندی کے ہوں یا ہندی سے ترجمہ ہو کر اردو میں شائع ہوئے۔ سبھی ناولوں کو حقیقت نگاری، منظر نگاری اور کردار نگاری کی کسوٹی پر رکھتے ہیں اور ان کا تعینِ قدر بھی کرتے ہیں۔اور نظامی نے صرف روایتی کرداروں کو ہی شمار نہیں کرایا ہے بلکہ سیرت نگاری پر بھی ان کی نظریں مرکوز ہیں۔وہ پریم چند کی ادبی خدمات پر اپنی زبانی بیان کرتے ہیں۔

> ''پریم چند نے آخری دم تک اردو اور ہندی کی زبردست خدمت کی ہندو مسلمان اپنے اس ادبی ہیرو کو کبھی دلوں سے نہیں بھلا سکتے جس نے بیش از بیش قومی ادب پیدا کیا۔اپنی جیون کہانی ختم کرنے سے پہلے ان کے افکار میں بلندی اور اندازِ تحریر میں اُستادانہ تراش اور بانکپن پیدا ہو چلا تھا۔اب پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی چیز آنے والی ہے۔''[۲۴]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظامی نے پریم چند کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی ہے کچھ کمیاں رہ گئی ہیں جن کو بیان نہیں کیا جو شروع میں کہا گیا کہ فنی اور علامتی چیزوں پر نگاہ نہیں ڈالی ہے لیکن نظامی نے جو بھی بیان کیا وہ مکمل اور پورا ہے۔''پریم چند کا ذہنی ارتقاء'' پر روشنی ڈال کر سبھی پہلوؤں کو احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ نظامی نے پریم چند کے ابتدائی دور سے لیکر دورِ شباب اور آخری عمر کے سبھی ناولوں اور افسانوں اور ڈراموں کے کردار پر روشنی ڈال کر سبھی چیزوں کو قلمبند کرنے کی سعی کی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر پریم چند کوئی ڈرامائی قصہ تحریر کرتے ہیں تو اس میں ڈرامائی کردار شامل کر کے طنز ومزاح پیدا کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ یہ پریم چند کا ہی کمال ہے کہ وہ آدمی کو اپنے افسانے کے ذریعہ اگر ہنساتے ہیں تو

رولانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

سید علی جواد زیدی:

تنقیدی روایت درجہ بدرجہ ترقی کرتی رہی اور ادیب اپنے اپنے تنقیدی نظریے کو تنقید کے اصول و ضابطے کی کسوٹی پر پرکھتے رہے اور ادبی تحریروں کی جانچ پرکھ کر کے تنقیدی اصول کو تقویت دیتے رہے۔ ابتدائی تنقیدی روایت میں کچھ مستحکم اصول نظر نہیں آتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ تنقید نے اپنے اصولی پیمانے طے کئے تو ادیبوں کی تحریریں مضامین وغیرہ پرکھنے اور جانچنے کا ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا جس پر ادیبوں نے اپنی تنقیدی نگاہ کو صیقل کر کے تنقید نگاری میں ایک مقام بنایا اور اس پر بہت سے ادیبوں کے افسانے، ناول اور شعراء کے کلام کو جانچ پرکھ کر ان کے اصول اور قدر کا تعین کیا گیا۔ اس تنقیدی سلسلے میں علی جواد زیدی کا بھی ایک اہم نام ہے جواد زیدی نے پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو بہتر طریقے سے پڑھا اور سمجھا اور پھر اس کے تعلق سے اپنا نظریہ تنقید بیان کیا۔ ایک مضمون ''پریم چند کی زندگی اور تصنیف پر ایک نظر'' قلمبند کی جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور 1936ء میں پیش کیا۔ جواد زیدی کے مضامین پڑھ کر پریم چند کی پوری حیات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اور شاید کوئی گوشہ ایسا ہو جو جواد زیدی کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا ہو۔ چونکہ وہ پریم چند کے زمانے کے تھے اور ساتھ رہنے سے بات چیت کے مواقع ملتے رہے جس سے پریم چند کے احوال مکمل بیان کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ابتدائی دور کے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ جن میں پریم چند کے کھیل کود کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ اور اسکول کے واقعات بھی بیان کئے گیے ہیں۔ جواد زیدی نے پریم چند کے بچپن پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس طرح ایک چھوٹے بچے کے اندر گھومنے پھرنے اور شرارت کے عناصر موجود ہوتے ہیں وہ سب جواد زیدی کے قلم سے پریم چند کے تعلق سے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پریم چند خود اپنے افسانہ ''چوری'' میں خود اپنے بچپن کی باتیں تحریر کی ہیں جن کو پڑھنے سے پریم چند کے بچپن کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہی نہیں جب ہم پریم چند کو پڑھتے ہیں اور جب بچپن کا حال بیان ہوتا ہے تو ساتھ ساتھ اپنے بچپن کے واقعات بھی ذہن میں آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جواد زیدی نے اپنے مضمون ''پریم چند کی زندگی اور تصنیف پر ایک نظر'' میں پریم چند کا ایک اقتباس یوں نقل کرتے ہیں:

''دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا...... میری عمر آٹھ سال کی تھی........ علی الصباح جو کی روٹیاں کھا کر.......... روانہ ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے یہاں حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں....... پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑیوں کی بہار دیکھتے.......... کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر جائیں۔''[۲۵]

اس اقتباس کے ذریعے جواد زیدی نے یہ دکھانے نے کی کوشش کی ہے کہ جو ایک خصوصیت بچپن میں عام طور پر سبھی بچوں میں ہوتی ہیں وہ ساری خوبیاں پریم چند کے اندر بھی موجود تھیں۔ لیکن ماں کے سایہ سے محروم ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس کے بعد سایۂ پدری سے محروم ہونے سے ایک اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی خود میرے دوشِ ناتواں پر رکھ دیا جو پریم چند کی عمر کے لحاظ سے بہت گراں تھا لیکن وقت نے کروٹ بدلی اور ایک چھوٹے سے گھرانے میں پریم چند نے اپنے قلم سے جواہرات بکھیر نے شروع کئے جس کے ذریعے اردو اور ہندی میں ایک بہت بڑا مرتبہ قائم کیا۔

جواد زیدی بہت ہی توجہ اور التفات کے ساتھ پریم چند کے ایک ایک پہلو کو روشن کرتے ہیں اس لیے ان کا یہ مضمون بہت طویل ہے اگر اس کو کتابی شکل دی جائے تو یہ الگ سے پریم چند پر ایک کتاب ہو سکتی ہے اور عام قاری اس کو پڑھ کر پریم چند کی پوری زندگی کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اور قاری کو ادھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ جواد زیدی نے پریم چند کے مقبول اور معروف افسانوں اور ناولوں، ڈراموں، اور اخباروں کا ذکر بہتر طریقے سے کیا اور یہی نہیں ان کی خانگی زندگی کے تعلق سے بھی روشنی ڈالی ہے۔ جیسے ابتدا سے لیکر شادی تک اور پھر دوسری شادی سے لیکر آخری وقت تک۔ گویا سبھی پہلوؤں کو یکے بعد دیگرے بیان کرتے چلے گئے

ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شیورانی دیوی تھیں اور ہر قدم پر پریم چند کے ساتھ رہیں اسی طرح جواد زیدی بھی رہے ہونگے یا اکثر و بیشتر پریم چند سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہونگی اور ملاقات ہونے پر ساری تفصیل معلوم کر کے تقریری شکل دیتے رہے ہونگے تبھی تو کوئی گوشہ چھوٹا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔اور اتنی ساری باتیں ایک ملاقات میں ممکن نہیں ہیں اس لیے پریم چند کو پڑھنے اور پرکھنے کیلئے کافی وقت درکار ہے جواد زیدی پریم چند کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ جس طرح ہر بڑے شاعر یا ادیب کی زندگی اس کیتصنیفات کے پردے سے صاف نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح پریم چند بھی تھے۔ پریم چند کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے بس ان کی تحریریں ہی کافی ہیں اس لیے کہ پریم چند کی تحریریں ان کی پوری زندگی کی ترجمان ہیں۔ جواد زیدی پریم چند کا ایک خاص امتیاز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پریم چند کے افسانوں میں بوڑھوں، بچوں، جوانوں، مردوں، عورتوں، عالموں، جاہلوں، پنڈتوں، مولویوں، پروفیسروں، کلرکوں، ججوں، اخبار نویسوں سب کو جگہ ملی ہے۔ لیکن سب علاحدہ علاحدہ خصوصیت اور عادات و اطوار کے مالک ہیں۔ اس بات نے ایک امتیازی شان پیدا کر کے مختلف طبقوں اور صنفوں کی عادات میں ایک خط فاصل کھینچ دیا ہے۔''۲۶

پریم چند نے ہر اعتبار سے اپنے سبھی اصناف کو دلچسپ اور دلکش بنانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کردار، پلاٹ، مکالمہ اور منظر نگاری اور واقعات نگاری کی خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں جس کی وجہ سے افسانے میں توازن پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں تحریروں میں جھول ہے لیکن وہ کسی برائی کے درجے میں نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے چاند کے اندر دھبہ لیکن اس دھبے سے چاند میں عیب نہیں ہے۔ بلکہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ یہی پریم چند کے افسانوں کا عالم ہے۔ پریم چند نے لکھا اور خوب لکھا ایسا لگتا ہے کہ پوری زندگی میں ہر وقت وہ قلم کو ہی رفتارِ تحریر دیتے رہے مگر پریم چند کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کی رفتار بہت تیز نہیں تھی۔ جس کا ذکر جواد زیدی نے پریم چند کے اقتباس کے ذریعے بیان کیا ہے۔ پریم چند کہتے ہیں:

''میں بہت سست رفتار ہوں۔ مہینے بھر میں میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کریکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔''

''ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں اگر اس میں کچھ قدرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔''[۲۷]

جواد زیدی کے اس مضمون میں پریم چند کی پوری سوانح حیات سمٹ آئی ہے اور یوں کہیئے کہ جس کو پریم چند کی زندگی کا جائزہ لینا ہو تو جواد زیدی کے اس مضمون کو پڑھ کر پوری سرگزشت سمجھ سکتا ہے۔ یہ جواد زیدی کی اپنی انفرادیت رہی ہے۔ جس پر روشنیڈالی اس کو سورج سے بھی زیادہ چمکدار بنا دیا تا کہ وہ شخصیت نہ نظروں سے اوجھل ہو اور نہ بادل کے دھندلکے میں گم ہو۔

جواد زیدی نے پریم چند کے سیاسی حالات کا جائزہ بھی بہتر طریقے سے لیا ہے۔ چاہے وہ سوزِ وطن کے تعلق سے ہو یا وہ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ہو۔ ان کی شخصیت ہر جگہ ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ جواد زیدی نے پنڈت بنارسی داس چترویدی کے سوالوں کو بھی اپنے مضمون میں جگہ دی ہے جو انھوں نے پریم چند سے کئے تھے۔ اور وہ سوالات بہت اہم ہیں۔ چونکہ ان سوالوں میں ایک سوال ایسا ہے جس میں بہت سے ادیب مشکوک نظر آتے ہیں۔ لیکن پریم چند نے اس کے ذریعے سے سارا معاملہ حل کر دیا ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں جن کو پنڈت بنارسی چترویدی نے کئے تھے۔

''(۱) آپ کے سب سے بہتر پندرہ افسانے کون ہیں؟

(۲) آپ پر کس مصنف کے طرزِ تحریر کا اثر پڑا ہے؟

(۳) آپ کو اپنی تصنیفات سے کتنی آمدنی ہوئی؟''

ان سوالات کے جوابات منشی پریم چند نے دیے ہیں وہ درجہ ذیل ہیں۔

جواب۔(ا)اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔دوسو سے زیادہ افسانوں میں کہاں تک انتخاب کروں لیکن یاد سے کام لیکر لکھتا ہوں۔ (ا) بڑے گھر کی بیٹی (۲)رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵)اَبھوشنڑ (۶) پرائشچت (۷) کامنا (۸) مندراور مسجد (۹) گھاس والی(۱۰) مہاتیرتھ(۱۱) ستیا گرہ (۱۲)لانچھن (۱۳)ستی (۱۴)لیلیٰ (۱۵)منتر۔

جواب۔(۲) میرے طرزِتحریر پرکسی دوسرے مصنف کے اسلوب کا کوئی خاص اثرنہیں پڑا ہےلیکن پنڈت بشن نرائن دراورڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے۔

> جواب۔(۳) آمدنی کی کچھ نہ پوچھئے کچھ ابتدائی کتابوں کا حق پبلیشرز کو دیدیا ''سیواسدن'' ''پریم آشرم'' اور سپت سروج سنگرام کیلئے ھندی پستک ایجنسی نے ایک مشت تین ہزارروپے دیے تھےاورنوندھ کے لیے شاید اب تک دوسو روپے ملے ہیں۔دولارے لال جی نے رنگ بھومی کے لیے اٹھارہ سو روپے دیے تھےاوردوسرے مجموعوں کے لیے سو دوسو روپے مل گیے ہوں گے۔کایا کلپ۔آزاد کتھا، پریم تیرتھ، پریم پرتیما، پرتگیا میں نے خود چھاپیں۔لیکن ابھی تک مشکل سے چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں اورترجموں میں شاید دو ہزار سے زائدنہیں ملا۔آٹھ سو روپے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہوگیا۔''ہنس'' اور جاگرن کی اشاعت میں تقریباً دوسو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔'' ۲۸

اس اقتباس سے پریم چند کے کسبِ معاش کا پتہ چلا کہ کتنی آمدنی پریم چند کی تھی۔لیکن اس کے باوجود ہمہ تن کام کرتے تھےاورکبھی بھی ایسے مسائل سے تھکن تک محسوس نہیں کی یہ پریم چند کی انفرادیت ہے

ان کے ہر ہر لفظ میں حب الوطنی اور قوم پرستی کی تصویر جھلکتی ہے۔اس کا اندازہ اس حوالے سے لگایا جا سکتا ہے کہ عدمِ موالات کی تحریک میں شریک ہونے کے لیے اپنی نوکری بھی چھوڑ دی، اور ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر آخری عمر تک حب الوطنی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جواد زیدی نے پریم چند کی تحریروں اور کرداروں پر خاص گفتگو کی ہے اور اخبار ''زمانہ'' اور رسالہ ''مادھوری'' کی ادارت پر بھی جواد زیدی کی نظر پڑی اور ان دونوں زمانہ اور رسالہ کے تعلق سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں سیاسی تحریک کا بھی عکس نمایاں ہے جو ہم کو بھی حب الوطنی اور قوم پرستی پر ابھارتا ہے۔ جواد زیدی نے پریم چند کے یہاں ایک افسانہ ''فلسفی کی محبت'' کا بھی ذکر کیا ہے جو عام ادیب یا تنقید نگار بیان کرنے سے قاصر رہے۔ گویا پریم چند نے جن جن افسانوں یا ناولوں کو تحریر کیا ہے اور جو عنوان دیا ہے اس عنوان پر پریم چند کا افسانہ بالکل کھرا اترتا ہے اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ڈراموں میں بھی پریم چند نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ڈراموں کے ذریعے سماج کی جیتی جاگتی تصویر کو پیش کر کے قاری اور عوام کو ایک نادر طرزِ تحریر فراہم کرتے ہیں۔ جواد زیدی نے افسانہ ''فلسفی کی محبت'' کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس کی کچھ فلسفی تحریر نمایاں نہیں کی ہے۔اگر پریم چند کچھ فلسفیانہ عناصر کی عکاسی کرتے اور اس کو تحریری شکل دیتے تو اس میں پریم چند ایک بہت ہی اہم رول ادا کر سکتے تھے۔اور جواد زیدی کی اہمیت بھی دوبالا ہو جاتی لیکن اس کے باوجود جواد زیدی کی لیاقت وصلاحیت میں کچھ کمی نہیں آئی ہے۔

جواد زیدی کا پریم چند پر یہ مضمون سمندر کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔اس لیے کہ ان کے مضمون ''پریم چند کی زندگی اور تصانیف پر ایک نظر'' میں پریم چند کی پوری شخصیت سمٹ آئی ہے۔لیکن تصانیف پر انھوں نے سرسری نظر ڈالی ہے اور شخصیت سے متعلق تقریباً سبھی پہلوؤں کو پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

طالب الہ آبادی:

پریم چند شناسی میں سید طالب علی کا نام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے اردو ادب کی بے لوث

اوگرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔انھوں نے جس چیز کا بھی مطالعہ کیا اس میں اس کی خامیوں، کوتاہیوں اور حسن کاری کو بھی سامنے رکھ کر اس کی قدر متعین کی ہے۔ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے پریم چند کو کچھ الگ طریقے سے پڑھا ہے اور ان کی کمیوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کیا ہے۔حالانکہ بہت سے نقادوں نے منشی پریم چند کو پڑھا اور ان کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔وہی تحریر کی روانی سلاست، اثر پزیری، دلکشی کے راگ چھیڑے ہیں اچھا اور بہتر نقاد وہ ہوتا ہے جسکی بصیرت میں تنقیدی اصول کے سارے چراغ روشن ہوں تبھی وہ نقاد سبھی باریکیوں پر نظر رکھ سکے گا۔لیکن حصولِ علم کے اور تنقیدی نظریے سے واقفیت کے بعد کسی کی تحریر پر اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ پڑھ کر اس کی اہمیت واضح کرے اس طرح کسی تحریر کی خامیوں اور کوتاہیوں پر بھی نگاہ ڈال کر اس کی قباحت کو ختم کرنا یا اس کی نشاندہی کرنا ایک نقاد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس طرح سید طالب علی نے پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کر کے اس کی کمیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اسکی خامیوں کی وضاحت بھی کردی ہے اس سلسلے میں طالب الہ آبادی نے اپنا ایک مضمون ''پریم چند کے ناول'' لکھ کر پریم چندیات میں جگہ بنائی جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' 1936ء میں شائع ہوا۔اس مضمون میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کون سا کردار خاموش ہے یا فرضی ہے یا جو بات کہنا چاہتے تھے اس کو ادا کرنے سے کس طرح محروم ہو گیے ہیں یا اختصار کی جگہ طوالت سے کام لیا ہے۔طالب علی کو جہاں جہاں بھی خامیاں نظر آئیں اسکی وضاحت انھوں نے پیش کردی ہے تا کہ قاری کی نظروں کے سامنے یہ بات بھی آجائے کہ پریم چند کے ناولوں یا افسانوں میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں نہیں تھیں بلکہ کہیں کہیں ان کے جذبات سرد پڑ گیے ہیں اور زبان و بیان سے وہ کہنے سے قاصر رہ گیے ہیں جو افسانے اور ناول کے معیار کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔طالب علی کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس جس میں وہ جو کہنا چاہتے ہیں وہ دیکھئے:

> ''میری صرف اسی قدر تمنا ہے کہ پریم چند کے ناولوں کے متعلق جو کچھ بھی میرے خیالات ہیں ان کو پوری سچائی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کردوں، آپ بھی اس مضمون کو مانگے کی عینک سے نہ پڑھیں

اور قیاس کی دور بین سے موشگافیوں پر آمادہ نہ ہو جائیں، ہمہ دانی کو مطالعہ سے بڑا بیر ہے، ذرا سی زحمت ضرور ہے مگر خود کتابیں پڑھیے اور رائے قائم کیجیے۔ میری مسرت صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ آپ ایک نظر پریم چند کے ناول خود دیکھ ڈالیے پھر آپ کی جو رائے ہوگی خواہ وہ بالکل وہی ہو جو میری ہے یا اس کے سراسر خلاف مجھے پروا نہیں۔ میرے دماغ کا ہر دروازہ آپ کے خیالات کے لیے آغوش محبت کے لیے کھلا رہے گا۔'' ۲۹

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ طالب علی نے پریم چند کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ اس لیے طالب علی نے پریم چند کے تحریروں کی اچھائیاں بھی دیکھیں اور کچھ کمیاں بھی نظر آئیں۔ جن کی وضاحت اپنی تحریروں میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جلوۂ ایثار کا بھی انھوں نے نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس میں وہ ساری چیزیں پیش کیں جو دوسرے نقادوں کو بہت ہی کم نظر آئیں۔ ''جلوۂ ایثار'' کے ایک کریکٹر بالا جی کے تعلق سے کہتے ہیں کہ بالا جی ایک متحرک کردار نظر آیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کرداروں میں وہ چُستی اور تیز رفتاری نظر نہیں آتی ہے۔ اس لیے وہ اس ناول کا جائزہ لینے کے ساتھ کہتے ہیں اقتباس:

''اس ناول کی دوسری سیرتیں برائے بیت معلوم ہوتی یں یا پہیلیاں بن کر رہ گئی ہیں، بالا جی مرکزِ نور ہیں اور تمام کریکٹر صرف پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ کس کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے۔

پریم چند کے دیگر تمام ناولوں میں آپ کو مکمل اور اثر انگیز سیرت نگاری کا اتنا صاف نمونہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کسی ناول کا پورا پلاٹ پہلے سے اپنے دماغ میں طے نہ کر لیتے تھے بلکہ دوران تصنیف ہی ان کے افراد کے کیریکٹر کا نشو ونما ہوتا رہتا تھا۔

اس لیے ان کے اکثر ناولوں میں پلاٹ اور ضمنی پلاٹ کا سلسلہ نہیں ہے۔ بلکہ متعدد پلاٹ پوری حیثیت اور شان کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی نتھی کردیے گیے ہیں....

پریم چند کے یہاں دوسری کمی اس چیز کی ہے کہ تدریجی ترقی سے جذبات کا اپنی انتہا پر پہنچنا اور وہاں سے پھر سہولت کے ساتھ واپس ہونا۔ بہر حال ہم پورے طور پر حادثات اور انقلابات کے لیے تیار نہیں ہونے پاتے اور شاید اسی کی بدولت ذہن میں کوئی وقفہ یا تعطل Suspence محسوس نہیں ہونے پاتا اور ہم اس لطف سے محروم رہ جاتے ہیں جو کیف کشمکش سے حاصل ہوتا ہے۔'' ۳۰

اس اقتباس کے ذریعے سے طالب علی کی ذہنی سطح کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے افسانوں اور ناولوں میں بڑے غور و خوض کے ساتھ اپنی بینائی صرف کرتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ سرسری طور پر پڑھ لیا اور اس کو بالائے طاق کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ طالب علی نے پریم چند کی تحریروں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی کوشش کی ہے اس لیے انھوں نے وہ باریک اشارے اور کنائے بیان کئے ہیں جہاں دوسرے نقادوں کی چشمِ بصارت پہونچنے سے گریزاں ہے۔

طالب علی کو ایک شکایت یہ ہے کہ جلوۂ ایثار میں بالاجی ایک متحرک کردار ہے اور باقی سب کردار ڈھیلے ڈھالے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ افسانے کے اندر جتنے کردار ہیں سب کے سب جذباتی اور چُست ہوں منشی پریم چند نے بے مقصد کرداروں کا انتخاب بہت ہی کم کیا ہے ان کے ناولوں یا افسانوں میں جو کردار ہیں وہ کسی نہ کسی وجہ سے ضرور شامل ہیں بلکہ کمال تو یہ ہے کہ جس طرح اور جہاں جس کردار کی ضرورت ہوتی ہے اس کو وہاں پیش کرتے ہیں تبھی افسانے کا حسن نکھرتا ہے اور قاری کی دلچسپی وہ تجسس برقرار رہتی ہے۔ اور دلچسپی کیوں نہ ہو ان کے سبھی ناولوں اور افسانوں میں تقریباً اصلاحی رنگ غالب ہے۔ جس کی وجہ سے دلچسپی اور تجسس کا قائم رہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پھر آگے طالب صاحب کہتے ہیں کہ اگر پریم چند کے ناول

''غبن'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی کہیں کہیں تحریروں میں وہ چاشنی نہیں ہے جن سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے اپنے مضمون ''پریم چند کے ناول'' میں رقم طراز ہیں۔

''مکالمہ میں سادہ گفتگو سے کام لیا گیا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور اعتقادات کا جلوہ پوری تابانی سے نمایاں ہے۔تعارف یا نفس شناسی کا کوئی پہلو باقی نہیں ہے۔عورتوں کی خالص گفتگو میں وہ لہجہ وہ لوچ اور مزہ نہیں جو فسانہ نگار عورتوں کے یہاں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ واقعات گو غیر فطری نہیں اور روزمرہ کے بھی نہیں مگر بہت دلچسپ بنائے گیے ہیں گویا کسی نے کٹھ پتلیوں کو جادو کی چھڑی سے رقاصۂ فلک بنادیا ہے مگر کہیں کہیں توازن کی کمی محسوس ہوتی ہے جیسے بوڑھے وکیل کے بعد رتن کی حالت وارفتگی شباب ایک ہی ٹھوکر میں رشک شیب بن گئی ہے۔''[۱۳]

اس طرح طالب بنارسی نے پریم چند کی جتنی تصانیف پر بھی روشنی ڈالی ہے ان کی اہمیت ضرور بیان کی ہے۔مذکورہ ناولوں کے علاوہ ''گوشۂ عافیت'' دونوں حصے پردۂ مجاز، بازارِ حسن، نرملا، بیوہ، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل وغیرہ جتنے ناول ہیں تقریباً سبھی طالب بنارسی کے نظروں سے گزرے ہیں اور انھوں نے ابتدائی نقادوں کی طرح تنقید نہیں کی ہے بلکہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر کردار بڑے سلیقے سے جانچا پرکھا اور سمجھا ہے۔جو کردار جس طرح کا ہے اس کو اسی طرح اہمیت بھی دی ہے اور اگر کوئی کردار ان کی نظر یا ان کی سوچ میں بہتر نہیں ہے تو اس کو بھی اسی انداز میں مقام متعین کیا ہے۔

انھوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر منشی پریم چند کے جذبات کو سمجھنے کے ساتھ ان کی ساری تحریروں کی حساس قائم کی اور غیر جانبدارانہ رویے سے کام لینے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔زبردستی تعریف کے پل نہیں باندھے ہیں۔اور ہونا بھی یہی چاہیے تاکہ کسی ادیب یا شاعر کی پوری زندگی اور اس کے سرمائے پر روشنی پڑھ جائے اور اس کو وہ مقام و مرتبہ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے اور یہی ادب کا تقاضا بھی ہے۔

طالب بنارسی کے یہاں ایک چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ جہاں منشی پریم چند نے بہتر طریقے سے کام لیا ہے وہاں ان کی تعریف کرنے سے گریز نہیں کی۔ اور جہاں کچھ کمیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشاندہی سے آپ کو مخفی نہیں رکھا اور نہ اپنے قلم کو خاموشی کے طرف مائل کیا بلکہ انھوں نے ہر اعتبار سے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا بخوبی مطالعہ کرکے اس کی قدر و قیمت متعین کی تو دوسری طرف اس کے نقائص کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہ ان کی (طالب الہ آبادی) اپنی انفرادیت ہے اسی لیے یہ ہر نقاد سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور اگر ان کو پریم چند کا بہت بڑا نقاد کہا جائے تو بجا نہیں۔

دیا نرائن نگم:

منشی پریم چند کے نقادوں میں دیا نرائن کا نام بھی قابل ستائش ہے۔ انھوں نے دورانِ تعلیم ہی رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ حالانکہ ان کے اہلِ خانہ ان سے وکالت کا پیشہ کرانا چاہتے تھے لیکن طبیعت اس کی طرف مائل نہ ہوئی۔ یہ اردو کی خدمت کو مشعل راہ سمجھتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کی شہرت بہت دور دراز تک پھیلی۔ اور اردو دنیا نے ان کو اور ان کے مضامین کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔

یہ ایک بہت ذہین اور محنتی طالب علموں میں شمار کئے جاتے تھے اور ان کے مضامین نہایت عمدہ اور بہتر ہوتے تھے۔ نرائن نگم نے نومبر 1903ء سے ماہنامہ ''زمانہ'' کی ادارت سنبھالی اور اس رسالے کو منشی برت لال درمن نے فروری 1903ء میں بریلی سے جاری کیا۔ منشی جی اسکو بریلی سے کانپور لائے اور تقریباً چالس سال تک اس پرچے کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ اردو کا ایک معیاری رسالہ سمجھا جاتا تھا اس میں بڑے بڑے ادبا و شعرا کے تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ جیسے اکبر الہ آبادی، سوالی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے، محسن الملک، پریم چند، مولانا شبلی، حالی، نذیر احمد، سرور، چکبست، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، اور اقبال وغیرہ کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ اس کی ادارت میں انھوں نے اپنی عمر کا ایک بہت قیمتی حصہ صرف کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے پریم چند پر علمی، عملی، اور مخلصانہ نظر ڈالی ہے اور پریم چند کی پوری زندگی کے حالات تقریباً بیان کئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کبھی پریم چند کو اکیلا چھوڑا ہی نہیں ہے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ اس لیے کہ پریم چند کی زندگی کا کوئی بھی

شعبہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو رہا ہے۔انھوں نے پریم چند کا گہرائی سے مطالعہ کیا اوران کے جذبات کو جانچا اور پرکھا اور سراہا بھی ہے اور بہت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ دیانارائن نگم نے ان کے ابتدائی ناول سے لیکر آخری سانس تک کی تحریری تصانیف کا ذکر کیا ایک مضمون ''پریم چند کے بعض تصنیف کے حالات'' رقم کیئے جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور سے 1936ء میں شائع ہوا۔ جو اپنے آپ میں ایک بڑی مثال ہے۔ پریم چند نے جو ناول ہندی میں لکھے اور جس کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ یا جو ناول اردو میں لکھے گئے اوراس کا ترجمہ ہندی میں ہوا اور کہا سے ترجمہ کیا گیا سب کو بڑی تفصیل سے اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہی نہیں پریم چند کے پورے حالات کا بھی نقشہ انھوں ے پیش کیا ہے۔ کس کس پریشانی سے گزرے اور پیشہ کمانے کا کیا طریقہ تھا۔ پورے واقعات کی ترجمانی کی ہے۔طبیعت میں کس طرح کا رجحان تھا اسکو بھی قلمبند کیا ہے۔ قوم وملت کی ہمدردی ان کی رگ وپے میں رچی بسی ہوئی تھی اپنے ملک کے سچے محبِ وطن تھے۔اور وطن کے ساتھ قوم وملت کے سبھی لوگوں کے ساتھ یکساں محبت رکھتے تھے اور ملک میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف تھے۔اس لیے کہ انگریزوں نے ہمارے ملک پر حکومت کی اور لوگوں پر ظلم وستم کے پہار توڑے تھے۔ وہ جس چیز پر چاہتے تھے اس پر لوگوں کو سزائیں دیتے تھے اور کوئی دوسرا آدمی اس پر آواز بھی نہیں اٹھا سکتا تھا دیانرائن نگم ایک بار کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میرے یہاں ایک مرتبہ لڑکی کی شادی کے موقعہ پر دیگر احباب کے ساتھ چند انگریز حکام کی بھی دعوت ہوئی تھی مگر پریم چند نے اس کو پسند نہ کیا، اور ایک خط میں لکھا کہ آپ نے انگریز حکام کی دعوت ناحق کی، آخر اس سے کیا فائدہ سمجھا، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ خیال ان کے ذہن نشین ہوگیا تھا کہ جب انگریز ہم ہندوستانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں تو ہم لوگوں کو بھی ان سے دور ہی رہنا چاہئے۔قومی خودداری کے وہ بڑے حامی تھے۔اور ادبی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں سرکاری افسران نے ان کے ساتھ جو نامنصفانہ برتاؤ کیا اس کا اثر ان

کے دل سے کبھی زائل نہیں ہوا۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں سرکاری تشددات نے انھیں اور بھی برگشتہ کر دیا۔ واقعی ''سوز وطن'' کے متعلق حکام کی کاروائی سراسر بیجا تھی کیونکہ اس کا کوئی قصہ ایسا نہ تھا جس پر ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی جاسکتی۔''[۳۲]

نگم کی اس تحریر سے پریم چند کی ملک وقوم سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔اور یہ ہونا ہی چاہئے۔ جب ایک غیر ملکی حکومت ہم پر ظلم وستم اور اذیتیں دے رہے تھے ایسے وقت میں ان کی دعوت کے بجائے ان کا مکمل بائیکاٹ کرنا چاہئے۔اوران کو کسی بھی محفل میں شریک نہ کیا جائے۔ چونکہ پریم چند ملک وقوم کے سچے ہمنوا اور خیر خواہ تھے اگر کہیں کچھ ہوتا تو ان کا دل تڑپ اٹھتا اور وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ دیا نرائن نگم نے پریم چند کی تصانیف کے تعلق سے یہ بتاتے ہیں کہ کون سی ناول کب اور کہاں لکھی گئی یہ بھی ایک بڑے نقادوں میں شامل ہونے کی وجہ ہے کہ جتنا مصنف کو اپنے بارے میں پتہ نہ ہو اس سے زیادہ دوسرے لوگ ان کے بارے میں جانتے ہیں۔

اس سے پریم چند کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کے سب سے زیادہ مضامین ''زمانہ'' میں شائع ہوئے ہیں۔ چونکہ ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیا نارائن نگم ہی تھے۔اس لیے پریم چند کے مضامین کو ہمیشہ شائع کرتے رہے۔اور کونسا افسانہ کس رسم الخط میں لکھا ہے اسکی بھی وضاحت کی ہے۔ چونکہ پریم چند ابتداء میں ہندی میں لکھتے تھے۔ اور بعد میں اردو رسم الخط اختیار کر لیا تھا حالانکہ یہ نہیں تھا کہ پریم چند اردو نہیں جانتے تھے۔ یہ اردو کے ایک بہترین عالموں میں شمار ہوتے ہیں کبھی انہوں نے ہندی میں لکھا تو کبھی اردو میں یہ ان کی زندگی میں ہمیشہ چلتا رہا۔

پریم چند کی یہ عادت تھی کہ وہ آپسی خلفشار اور جھنجھٹ سے دور رہتے تھے اور ہمیشہ اپنی حیات کو امن و سکون کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے وہ کسی کے ساتھ سختی کو ناپسند کرتے تھے اور نہ تو وہ خود کسی کی کڑی بات پسند کرتے تھے اپنے نجی معاملات میں ہمیشہ اعتدال وتوازن سے کام لیتے تھے۔ان کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش ان کی دوسری شادی کے موقع پر ہوئی اس لیے کہ جہاں تک یہ بات معلوم ہو پائی ہے کہ ان کی پہلی

بیوی بہت بدسلیقہ تھیں جس کی وجہ سے ان کی مزاج میں بھی تلخی پیدا ہوگئی تھی۔اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ آئے دن جھگڑوں کے علاوہ اور بھی کچھ واقعات پیش آتے رہتے جس کی وجہ سے صلح سمجھوتہ کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ دیانارائن نگم کہتے ہیں کہ پہلے تو میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ پریم چند کا ہی قصور ہے جس کی وجہ سے ان کی بیوی ان کے یہاں رہنا نہیں چاہتی۔مگر جب مفصل حالات معلوم کیئے تب جا کر پتہ چلا کہ کمی کس کی ہے۔ پریم چند اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتے ہیں اور بہت دلبرداشتہ ہو کر لکھتے ہیں خود پریم چند کا ایک اقتباس دیکھئے:

> ''برادرم، اپنی بیتی کس سے کہوں، ضبط کیے کیے کوفت ہورہی ہے، جوں توں کرکے ایک عشرہ کا ٹا تھا کہ خانگی تردد ات کا تا تھا بندھا....... بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی ، میکے جاؤں گی، میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ناچار کھیت کا منافع وصول کیا،ان کی رخصتی کی تیاری کی، وہ رو دھو کر چلی گئیں، میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔آج ان کو گیے ہوئے آٹھ روز ہوگیے نہ خط نہ پتر، میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہوں، غالباً اب کی ان کی بدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو، میں بلا بیوی کے رہوں گا۔۔ ادھر نانہال سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس ہوں.... تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضا مندی دے دو، تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی.... بہر حال اب کی تو گلا چھڑا ہی لوں گا، آئندہ کی بات نارایٔن کے ہاتھ ہے۔جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کروں گا۔اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔'' ۳۳

حالانکہ ایسی سختی اور ناخوشگوار حالات میں پریم چند اپنی پہلی بیوی کو گزارنے کیلئے کچھ ماہواری روپیہ

بھی بھیجتے رہتے تھے۔ یہ پریم چند کے اخلاق کردار کی ایک بہترین مثال ہے۔اس کے بعد غور وفکر کر کے دوسری شادی کا فیصلہ کیا مگر یہ بھی فیصلے میں رکھا کہ جس سے دوبارہ شادی ہو وہ عورت بیوہ ہو اور ایسا ہی کیا۔ بیوہ سے شادی کر لیا اور یہ پہلی والی بیوی سے زیادہ خوبصورت اور ہنس مکھ تھیں۔اور زندگی میں جس طرح کی بیوی چاہتے وہ بالکل اسی طرح تھیں سمجھ دار پڑھی لکھی،فہم وفراست، دانائی، دانشوری سارے ہنر انکی دوسری بیوی ''شیورانی دیوی'' کے اندر موجود تھے۔اس لیے شیورانی دیوی نے پریم چند کی زندگی کو ہر طرح سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ پریم چند بہت نرم مزاج اور رحم دل آدمی تھے اور ہمیشہ اعتدال کو پسند کرتے تھے اور میانہ روی سے کام لینے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ اپنی تحریروں میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کسی بھی مذہب کے لوگوں پر گراں نہ گزرے اور نہ تو ان کی وجہ سے کسی کو ٹھیس پہونچے اس لیے جو بھی لکھا بڑی دور اندیشی سے لکھا اور بڑی دانائی سے لکھا۔انھوں نے ایک ڈرامہ کربلا بڑی غور وفکر کے ساتھ تحریر کیا۔ ڈرامہ چھپنے سے پہلے ''زمانہ'' کے دفتر میں بھی اس بات پر غور فکر کی گئی کہ کہیں کوئی لغزش نہ ہونے پائے اس سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت سنی کے علاوہ شیعہ حضرات سے بھی مشورہ کر کے ہر ممکن پہلو پر نظر ڈالی اور انہیں تاریخی اوراق کی بھی ورق گردانی کرنی پڑی۔ دیانرائن نگم کہتے ہیں کہ میں نے ابتدا میں انھیں لکھا تھا کہ اس ڈرامے میں کہیں ایسی کوئی بات نہ لکھنا جو شیعہ احباب کو ناگوار گذرے اس بات کا جواب مورخہ 17 فروری 1924 کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو یہ لکھا:

> ''آپ یقین رکھیں میں نے احتراماً کہیں نظر انداز ہونے نہیں دیا ہے
> ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی
> احساسات کو صدمہ نہ پہونچے،اس کا مقصد پولیٹیکل ہے۔ باہمی اتحاد کو
> بڑھانا اور کچھ نہیں۔''۳۴

اس طرح پریم چند نے ہر مذہب کا خیال رکھتے ہوئے کسی کا دل نہیں دکھایا ہے۔ چاہے مسلم ہوں، عیسائی ہوں، یا وہ کسی بھی مذہب کے متعلقین میں سے ہوں۔اس کے علاوہ پریم چند سیاست سے بھی دور رہے اور صرف قلم کے ذریعے ساری چیزوں کو متحرک کرتے رہے۔اگر چہ پریم چند کا نام مجاہدین میں نہیں آتا

ہے لیکن وہ ذہنی طور پر ملک کو آزاد کرانے کے حق میں تھے۔گاندھی جی سے ملاقات کے بعد وہ عملی طور پر بھی آزادی میں کسی حد تک شریک رہے۔شروع سے ہی مظلومیت کے خلاف رہے۔ چنانچہ 1936ء میں جب انہیں ترقی پسند تحریک کی صدارت کے لیے دعوت دی گئی تو وہ بخوشی قبول کر لیے اور ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں ایک اہم شخصیت کی حیثیت حاصل کر لی دیا نرائن نگم کا یہ مضمون بہت طویل ہے لیکن اس کے مطالعے سے پریم چند کی جتنی بھی تصانیف ہیں سب پر برابر روشنی پڑ جاتی ہے نیز ان کی زندگی کے نشیب وفراز اور حالات و کیفیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق:

ہمارے اردو ادب کی دنیا میں مولوی عبدالحق کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اردو کی خدمت کیلئے اپنی پوری زندگی صرف کردی وہ ایک بہت بڑے محقق بن کر اردو دنیا میں پیدا ہوئے اور وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو دوسرے محققین نہیں کر پائے۔عبدالحق بہت ہی ذی علم اور دانشور شخصیت کا نام ہے۔انہوں نے تحقیقی کاموں کے علاوہ تبصرہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔خاص کر انھوں نے دکنی ادب اور دکنی نسخے کو جو بہت ہی نیچے اور گہرے رَدّی میں چلے گیے تھے ان کو چھان پھٹک کر اور تحقیق کر کے عوام کے سامنے پیش کیا اور ان نسخوں کی قدر متعین کی۔تحقیقی کام ایک نہایت دقت طلب اور صبر آزما کام ہوتا ہے جس کو مولوی عبدالحق نے بڑی دیدہ ریز اور ژرف نگاہی کے ساتھ کیا۔

مولوی عبدالحق کے تحقیقی مضامین کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین بھی کچھ کم نہیں ہیں بلکہ جس طرح تحقیقی مضامین کی اہمیت ہے بالکل اسی طرح تنقیدی مضامین کی بھی اہمیت ہے۔انھوں نے تنقیدی نظریئے کو تسلسل دیتے ہوئے منشی پریم چند کی ناولوں اور افسانوں کو بھی حسن و قبح کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی متعین کئے ہیں۔اس کے لیے انہوں نے ایک موثر اور تحقیقی اور تنقیدی مضمون 'پریم چند کا آرٹ'' کے عنوان سے رسالہ اردو 1936ء لکھا جس کا ذکر رسالہ ماہنامہ زمانہ 1936 میں بھی کیا گیا ہے۔یہ مضمون پریم چند شناسی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں انہوں نے پریم چند کے ادب کو زندگی کا ترجمان بتایا ہے۔مزید لکھتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے عہد کے حالات کو اس طرح اپنی تحریر

میں سمو دیا ہے جیسے وہ خارج میں نہیں بلکہ پریم چند کے داخل کے حالات ہوں پریم چند نے اپنے تحریر میں دلی کیفیات اور واردات کا ذکر کر کے اپنے تحریروں کو دلچسپ اور موثر بنایا ہے۔ پریم چند سماجی ہمواری کو اتنی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے سماجی ناانصافی کو ان کا ذاتی واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ پریم چند کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں۔ جو اکتوبر 1936ء میں شائع ہوا اس میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''ہندوستانی ادب پر منشی پریم چند کے بڑے احسانات ہیں۔انھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا۔ انہوں نے بے زبانوں کو زبان دی اوران ہی کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔''

پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی تھی حقیقت کو لٹکانے کیلئے سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھےاور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کی زندگی کا مشن ہو گیا تھا۔

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے۔ وقتی مسائل کی اہمیت کو انھوں نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کردیا۔ افسانہ نگاروں میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالی کا۔ دونوں پیش رو تھے، دونوں پیغمبر تھے، دونوں بیداری کے نقیب تھے۔ شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ سادگی کے رسیا اور اخلاص کے پجاری۔ انھوں نے زندگی کی کامرانی کا پیغام سنایا ،اور اس میں عمر گزاری اور سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجے کو پہنچے'' ۳۵

گویا عبدالحق کے اس اقتباس سے پریم چند کے جذبات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ پریم چند جو کچھ بھی

کرنا چاہتے تھے اس میں ان کا ایک مقصدِ عین چھپا ہوتا تھا۔ لکھنے کو تو افسانہ لکھتے ہیں مگر ساری چیزیں ہماری اپنی زندگی اور سماج کے تعلق سے ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو بھی کردار پیش کیئے وہ خیالی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ہیں اور جو ہمارے ارد گرد گھومتے ہوئے ملتے ہیں۔ پریم چند نے اپنی نظروں سے جو دیکھا اس کو اپنا درد سمجھ کر عوام کے سامنے پیش کر دیا۔

ایک وقت تھا جب ہمارے ادیبوں کو ساری چیزیں صرف شہروں میں ہی نظر آتی تھیں اور وہ یہ سوچتے تھے کہ دیہاتوں میں بڑا سکون اور آرام ہے وہاں لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں ہر طرف ہریالی و سبز و شادابی کے خوشنما مناظر ہیں۔ کھیتوں میں پھلوں اور پھولوں کا ایک حسین موسم ہوتا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا میں بڑی تازگی و خوش گواری ہوتی ہے۔ وہاں پھولوں پر بھونرے الگ الگ راگنی گاتے ہیں۔ تتلیاں ایک سے ایک حسین پھولوں کا انتخاب کر کے اس پر اپنا بسیرا ڈالتی رہتی ہیں پرندے شام کے وقت جب اپنے اپنے آشیانے کو واپس لوٹتے ہیں تو ایک بہت ہی سہانا ماحول ہوتا ہے۔ کبوتر اور گوریے گھروں کی زینت بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ گھر کے آنگن خوشنما پیڑ خوشبودار ٹھنڈی اور صحتمند ہواؤں سے دلوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے منشی پریم چند جس ماحول میں پیدا ہوئے وہاں کے ماحول کو دیکھا اور محسوس کیا تو ان کا حساس دل تڑپ اٹھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر شہر کے بجائے دیہات کی ہی منظر کشی کی اور وہاں کی وہ ساری چیزیں پیش کیں۔ جو شہری ادیب سمجھنے سے قاصر تھے۔

عبدالحق کہتے ہیں کہ پریم چند کا افسانہ نگاروں میں وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں مولانا الطاف حسین حالؔی کا اس لے کہ یہ دونوں اپنے اپنے قلم کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگانا چاہتے تھے اور عوام کو برابری کا حق دلانا چاہتے تھے اس لیے کہ مزدور غریب اور سرمایہ داری کا دو الگ الگ نظام قائم تھا۔ اس فرق کو یہ دونوں حضرات ختم کرنا چاہتے تھے۔ عبدالحق کا اسی اقتباس میں یہ بھی کہنا ہے کہ پریم چند نے بے زبانوں کو زبان دی اور ان کی ہی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے جو بھی افسانے لکھے ہیں وہ بالکل صاف ستھرے انداز میں لکھے ہیں جس کو ہر کوئی بڑی آسانی سے پڑھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے، زبان میں بڑی شائستگی اور شگفتگی ہے اور لہجہ بہت پُر اثر اور اسلوب نہایت سادہ اور دلکش۔

گویا عبدالحق نے پریم چند کے آرٹ پر لکھا تو بہت کم ہے لیکن جو بھی لکھا ہے اس سے مکمل طریقے سے پریم چند کی پوری شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ اوصاف صرف کچھ ہی محققین کے نمایاں وصف ہیں ان میں عبدالحق کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔اسی مذکورہ بالا اقتباس میں عبدالحق لکھتے ہیں کہ پریم چند سماج کو بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کی زندگی کا مشن ہو گیا تھا۔

اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ پریم چند کی زندگی کا کوئی دوسرا مشن نہیں تھا بلکہ وہ یہ مشن لیکر پیدا ہی ہوئے تھے۔گویا یہ ساری چیزیں ان کے خمیر میں شامل تھیں۔ یہ اپنے زمانے کے لیے قوم وملت کیلئے ،عوام کیلئے ایک رہنمائے کامل تھے۔عبدالحق نے اس دور میں جو بھی تنقیدی معیار قائم تھا اس کے ذریعے سے جانچا پرکھا تنقید کے معنی صرف قباحت ہی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اگر ادب بہتر ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی لچک اور جھول نہیں ہے تو اس میں اگر کوئی نقاد زبردستی قباحت اور برائی بیان کرے تو یہ اسکی اپنی کمی اور حماقت ہے۔ بلکہ اگر ادب بہتر ہے تو اسکو بہتر ہی بتانا چاہئے۔اور ہر نقاد اپنے اپنے فن شعور کے ذریعے جانچتا اور پرکھتا ہے اس طرح عبدالحق نے اپنے بہتر اور میانہ روی سے کام لیکر پریم چند کی شخصیت کو نکھارنے کے لیے حتیٰ لامکان کوشش کی ہے۔

جگت موہن لال رواں:

شعر گوئی کی روایت ہمارے ادب میں ایک مدت سے چلی آرہی ہے۔اور اس کے ساتھ داستان بھی ہمارے قدیم اصناف کا اہم حصہ ہے جس کے ذریعے لوگوں کو اپنے وقت کا احساس نہیں ہوتا تھا اور جب اکتاہٹ اور گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی تھی تو فوراً کوئی قصہ چھیڑ دیتے تھے جو مہینوں اور سالوں مستقل اور تواتر کے ساتھ چلتا رہتا تھا۔اور لوگ بڑی دلجمعی کے ساتھ ان قصوں اور داستانوں کو سماعت کیا کرتے تھے۔اور اس سلسلے میں لوگ کبھی محلوں اور کبھی درباروں کا بھی رخ کیا کرتے تھے۔اور قصہ گو یا داستان گو لوگوں کو تجسس آمیز قصے کہانیوں میں مصروف رکھتا تھا اور اگر کہیں پتہ چلتا کہ لوگوں میں بے چینی بڑھتی جارہی ہے تو فوراً قصہ تبدیل کر کے کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتا تا کہ لوگوں کی توجہ ایک بار پھر قصے کی جانب مرکوز ہو جائے۔اور ساتھ ساتھ شعری تسلسل کا بھی ایک خوشنما ماحول بنا رہے۔شعرا حضرات اشعار کبھی قافیہ ردیف کی پابندی میں کہتے

تھے تو کبھی آزاد نظم کہتے تھے یہ ان کا اپنا طرۂ امتیاز تھا جس کو چاہتے اپناتے اور جسکو چاہتے نظر انداز کرتے۔ چونکہ شعر میں حسن تب ہی پیدا ہوتا ہے جب اس کے اندر قافیہ ردیف ،تشبیہ، استعارہ، بدائع، صنائع کا خیال رکھا جاتا ہے اوراس کے برعکس نثر ہے۔جس میں نہ تو قافیہ ہوتا ہے اور نہ ردیف کی پابندی کا لحاظ ہوتا ہے۔ زمانے میں تبدیلی ہوئی اور لوگوں نے داستانوں کی طرف سے اپنا رخ موڑا۔اوراس سلسلے میں ناول اور پھر اس کے بعد افسانے کا وجود ہوا۔

جب افسانے کا وجود ہوا تو افسانے کے بھی کچھ اصول مرتب ہوئے جن کے تحت افسانہ اور ناول نگاری کو بہتر مانا جاتا تھا۔اس افسانہ لکھنے والوں میں ایک بہت ہی اہم نام منشی پریم چند کا بھی ہے۔جنہوں نے اردو ادب کی دنیا کو روشن کیا۔ کچھ نقادوں نے پریم چند کی تحریروں کو جانچا پرکھا اس کی قدر متعین کی اس سلسلے میں ایک نام جگت موہن لال رواں کا ہے۔انھوں نے ''پریم پچیسی'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ''نومبر 1914ء میں ملتا ہے۔اس میں انھوں نے شاعرانہ عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو الگ نوعیت کا مضمون ہے۔ پریم چند شناس میں جگت موہن لال رواں اہم نام ہے جنھوں نے اپنے تنقیدی بصارت کے ذریعے پریم چند کے افسانوں ناولوں کا تجزیہ کر کے اس کے اقدار متعین کئے ہیں۔لیکن جگت موہن لال رواں دوسرے تنقید نگاروں سے ذرا ہٹ کے تنقید کرتے ہیں یہ ان کی انفرادیت ہے۔ہم نے بہت سے تنقیدی نظریہ رکھنے والوں کو دیکھا اور پڑھا لیکن سب نے وہی باتیں کی ہیں جن کو پڑھنے سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے جیسے پریم چند کی تحریروں کے تعلق سے۔ دیہاتی منظر کشی اور مکالمہ نگاری، کردار نگاری کے متعلق سے تو سبھی نقادوں نے پریم چند کو پرکھا اور جانچا ہے۔لیکن لال رواں کا انداز کچھ یوں ہے کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں میں شاعرانہ عناصر تلاش کئے جس کو دوسرے نقاد بیان کرنے سے کوسوں دور رہے۔ لال رواں کہتے ہیں کہ پریم چند اپنے قلم سے ایسی تصویر کشی کرتے ہیں جیسے کوئی مصور برش سے دیوار پر تصویر بناتا ہو اور ایسی نقالی اور نقاشی کرتے ہیں اور ایسا کمال دکھاتے ہیں جس پر کسی شاعر یا کسی مصور کو فخر محسوس ہو سکتا ہے۔لال رواں پریم چند کے یہاں وہ چیزیں تلاش کرتے ہیں جو ادبا، علما، نقاد شعرا کے یہاں تلاش کرتے ہیں اور جن کے ذریعے سے شاعری میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔وہ ساری چیزیں لال راواں نے پریم

چند کے افسانے بیان کرکے اپنی لیاقت کا لوہا منوایا ہے اور ایک نئی جہت کی تلاش کرکے پریم چند کے افسانوں کو چراغِ راہ ثابت کیا ہے۔ لال رواں کہتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں دلکشی اور جادو بیانی ہے۔ اپنے دوستوں کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لگتا ہے ان کی زندگی کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ پریم چند جب کوئی قصہ یا واقعہ بیان کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارے متعلق یا دوستوں کے متعلق کہا جارہا ہے اور اس میں کلی طور پر دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چشم دید واقعہ یا قصہ بیان کرنے والا کسی شخص کا حال بیان کر رہا ہے۔ لال رواں کہتے ہیں کہ پلاٹ سے زیادہ منشی پریم چند کا اندازِ بیان ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں دلکشی زورِ بیان اور اثر انگیزی سے ہوتی ہے جو قاری کو مکمل طریقے سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور اس کے علاوہ جتنی بھی شاعرانہ خصوصیات ہوتی ہیں لال رواں نے سب کو پریم چند کے افسانوں میں تلاش کئے ہیں اور اسی شاعرانہ لہجے میں افسانوں کی قدر و قیمت واضح کرتے ہیں۔ مثلاً جذبات نگاری، سادگی، نزاکت، قوتِ بیان، اختصار عبارت، تشبیہ واستعارہ، قوتِ الفاظ، سلاست، توازن، جملوں میں الفاظ کی نشست اور بندش کی چستی، خیال آفرینی، مضمون آفرینی یہ سب وہ چیزیں ہیں جو شاعری کا اعلیٰ معیار ہیں لیکن لالِ رواں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں پریم چند کے یہاں افسانوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ اسی سلسلے میں لال رواں کا ایک اقتباس دیکھئے:

> تاثیر جو شاعری کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ ان قصص میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ راقم نے خود اکثر ان قصص کو اپنے دوستوں کو پڑھ کر سنایا ہے اور بعض حضرات کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے دیکھے ہیں۔ قوانین قدرت اور انسانی جذبات کے مشاہدہ میں اور اُس پر غور کرنے میں منشی صاحب کا نظیر دنیائے اردو میں شاید ہی دوسرا ہو۔'' ۳۶

اس کے علاوہ لال رواں نے منشی پریم چند کے یہاں طنز و مزاح کے عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح اکبرالہ آبادی کے یہاں مزاحیہ نشتر ہیں بالکل ہنسی ہنسی میں پریم چند بھی لوگوں کے قول و فعل پر طنز کرکے کوئی نہ کوئی اصلاحی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔ اور سامنے والا صرف ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور

ہو جاتا ہے۔ یہ پریم چند کا ایک انوکھا ہنر ہے۔ لال رواں کہتے ہیں:

''پریم چند ظریفانہ انداز میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو سنجیدہ طور سے بھی کہنی مشکل ہیں۔ جب تبسم کے بعد ہمارے ہونٹ پرانی نشست پر آنے لگتے ہیں تو ہمارے خیالات میں ہل چل سی مچ جاتی ہے۔ اور سنی ہوئی بات کی حقیقت اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے۔''۳۷

لال رواں نے بالکل صحیح اور بجا کہا ہے کہ پریم چند کے یہاں شعری عناصر پائے جاتے ہیں اور مندرجہ بالا اقتباس سے تو یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے۔ لال رواں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ انھوں نے افسانے کی تنقید نہیں کی بلکہ کسی شاعر کے شعر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس سے پریم چند کی اہمیت تو نکھر کر سامنے آتی ہی ہے اور ساتھ ساتھ لال رواں کے اندازِ تکلم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ منشی پریم چند بہت سے جذبات کا اظہار استعارات کے پہلو میں کرتے ہیں۔ نازک اور خوبصورت احساسات وتعلقات کیلئے وہ مناسب اور بہتر تشبیہ ڈھونڈنے کا ہنر جانتے ہیں مثلاً پریم چند کا ایک بہت چھوٹا سا اقتباس دیکھئے۔

''کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھُرا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت انسان کے دل کی ہے۔''۳۸

لال رواں کہتے ہیں کہ منشی جی حالات اور واقعات کا بالکل من وعن نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور موجودہ سوسائیٹی کی کیفیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید بھی کرتے ہیں اور لال رواں نے اس سوسائٹی کا نقشہ بہت ہی بہتر طریقے سے یوں کھینچا ہے جس کو پڑھنے سے پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''ووٹ اور انتخاب ممبری کا جنون، حصولِ خطاب کا خطبہ۔ بابو صاحبان کی خامکاری۔ نئے بی اے کا ضعیف جثہ۔ زمینداروں کی مقروض مگر مشیخت سے بھری ہوئی حالت۔ نئے جاگیرداروں کی خودسری۔ پُرانے آدمیوں کے بے غرض کام۔ لالہ صاحبان کی خیانت اور دیانت۔

پنڈت صاحبان کا سرسوتی کی پوجا چھوڑ کر لکشمی جی کی مجاوری کرنا۔
بہوؤں کا قابل اعتراض برتاؤ۔ ماؤں کی بے لوث مامتا۔ دیہات کی
زندگی کے فوائد۔نوجوان نئی روشنی والی عورتوں کے خیالات اور برتاؤ۔
راجپوتوں کی شجاعت راج پتریوں کی وفاداری۔کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر
منشی صاحب نے کچھ خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ اور یہ اُن کے تخیل کی
وسعت اور جامعیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔'' ۳۹

ان سب چیزوں کے بعد لال رواں نے ایک خاص بات یہ کی ہے کہ منشی پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی زبان میں بات کی ہے اور ہندوستان کی اردو کو ہندوستان میں لکھنے کی طرف توجہ کی ہے۔ جب ہمارے ادب میں فارسی کا غلبہ تھا اور مضامین میں ہندوستانی اساطیری قصوں کے علاوہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، دشت بغدا اور جوئے شیر وغیرہ نے لے لی تھی۔ ایسے وقت میں ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی قصے کہانیوں میں ہندوستانی کرداروں، مہینوں، موسموں، ندیوں، نالوں اور برگد کی چھاؤں وغیرہ کے زیرِ اثر جو کچھ بھی لکھا اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں ہندوستانی عوام کو بہت بھا گئیں جن کے ذریعے ہمارے ہندوستانی ادب کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور لوگ خیالی اور فرسودہ قصوں کے حدود سے نکل کر پریم چند کی حقیقت نگاری کے قائل ہو گیے۔

لال رواں نے پریم چند پر اپنی نظر ڈالی اور خوب ڈالی یہ شاعرانہ رنگ و تخیل پہلی بار ہمارے سامنے کسی افسانہ نگار کی افسانہ نگاری میں دکھنے کو ملا ہے۔جن کو لال رواں نے بڑی ذمہ داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔زبان و بیان کا ایسا ماحول دکھایا ہے جس کے ذریعہ شاعرانہ رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔تشبیہ واستعارہ وغیرہ کے استعمال کے تعلق سے تو گفتگو خوب کی ہے۔لیکن زبانی کی ہے کہیں کوئی اقتباس پریم چند کا اگر بیان کرتے تو قاری کو لطف آمیز ہونے کے مواقع اور مل جاتے اور قاری کی دلچسپی بھی مزید بڑھ جاتی اور پڑھتے پڑھتے افسانہ محسوس کرنے کے بجائے لوگ شاعری کی دنیا میں کھو جاتے۔اور ایک کے ساتھ دوسرے اصناف کے حسن سے دل و دماغ کو معطر بھی کر لیتے۔

شیورانی دیوی:

پریم چند کی اہلیہ شیورانی دیوی نے ''پریم چند اور مسز پریم چند'' مضمون لکھ کر پریم چند کی زندگی کے کچھ آخری لمحات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' 1936 میں ملتا ہے۔لیکن اس مضمون میں شیورانی دیوی نے اس لمحات کو پیش کیا ہے جو پریم چند کے بالکل آخری مرحلے تھے۔ پریم چند کا آخری وقت ہے لیکن قرطاس وقلم سے ایسا لگاؤ ہے کہ اس کے بغیر ان کا جینا مشکل ہے۔اچانک ایک دن پریم چند کو بیماری کے حالت میں قے ہوئی اور وہ قے خون کی ہوتی تھی۔ یہ منظر شیورانی نے دیکھا تو ان کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔ وہ گھبرا گئیں اور رونے لگیں فوراً انھوں نے اپنے لڑکے دھنوں کو دوڑا کر ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے آ کر منشی جی کو تسلی بخش جواب دیا اور کہا کہ آپ گھبرایئے مت آپ بالکل اچھے ہو جائیں گے۔اس طرح کے کئی مریضوں کو ہم نے اچھا کیا ہے اور یہ صرف بلغم کی وجہ سے ہوا ہے اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔شیورانی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر کے اس تشفی بخش جواب سے مجھے اطمینان تو ہو گیا لیکن ان کی طبیعت برابر خراب رہنے لگی اور اس دن سے ان کو اچھی طرح نیند بھی نہیں آئی پھر بھی لکھنے پڑھنے پر کوئی اثر نہیں پڑا مسز شیورانی دیوی ایک جگہ لکھتی ہیں اقتباس دیکھیں:

> ''رات کو آپ روشنی میں لکھتے پڑھتے اس غیر معمولی علالت کے زمانہ میں بھی آپ برابر لکھتے رہے۔اسی حالت میں انھوں نے ''منگل سوتر'' کے بیسوں صفحے لکھ ڈالے مجھے خوف تھا کہ کہیں طبعیت اور خراب نہ ہو جائے اس لیے میں نے کئی بار ان کو لکھنے پڑھنے سے روکا۔، پہلے تو وہ مان گیے ،مگر پھر میں انھیں نہ روک سکی۔کبھی کبھی ان کو رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ اور میں یہ سوچ کر کہ اس طرح پڑھنے لکھنے میں ان کا جی بہل جائیگا ان کو کتاب دے دیتی تھی۔ میں رات دن ان کی چارپائی کے چاروں طرف چکر کاٹتی رہتی تھی، ان کا سر سہلایا کرتی تھی اور ان کے سامنے ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔''[۴۰]

ایک سچا اور مشفق ادیب جس نے ہمیشہ قوم وملت کے تعلق سے افسانے لکھے اور ہمیشہ سب کی بھلائی کیلئے کسی کو کچھ نہ کہا ہو اور صرف تحریر وتصنیف سے واسطہ رکھا ہو تو وہ آخری وقت ہی کیسے یہ سوچے گا کہ اب کچھ نہ کہنا ہے اور نہ لکھنا ہے۔ حالانکہ آخری وقت میں انسان کی خواہشات تو اور بڑھ جاتی ہے تو جس طرح جوانی میں افسانے اور ناول ڈرامہ وغیرہ لکھے اسی طرح دورانِ ضعیفی میں علم وادب سے ہی سروکار رکھا آخر وقت میں تو تجربے اور بھی بہت زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور ان پختگی نے ان کے شہرت کو اور بلند کر دیا تھا۔ پریم چند کی بیماری بڑھتی جارہی ہے لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق کم نہیں ہو رہا ہے۔ اور بیماری کی حالت میں جب نیند نہیں آتی تو ساری ساری رات بیٹھ کر قلم کی رفتار کو کم نہیں ہونے دیتے اور صبح تک یہی عالم رہتا تھا۔ ایک دن پریم چند کے پیٹ میں درد تھا اور شیورانی دیوی پریم چند کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی جب پیٹ کا درد کچھ کم ہوا تو شیورانی دیوی سے کہتے ہیں جس کو شیورانی نے اپنی زبان میں پریم چند کے زبانی بیان کرتی ہیں اس مضمون سے شیورانی کا اقتباس پریم چند کے تعلق سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''ان کے پیٹ میں درد تھا، اور میں ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی، جب درد کچھ کم ہوا تو بولے ''رانی!'' مجھے تمھاری اور بنّو کی بڑی فکر ہے، دھنو تو ہاتھ پیر والا ہے، بیٹی کی شادی ہوگئی ہے۔ وہ آرام سے ہے۔ مگر تمھاری اور بنو کی کیا حالت ہوگی؟'' اس وقت میرے صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہوگیا زندگی میں پہلی مرتبہ میں ان کے سامنے رو پڑی، ورنہ میں ہمیشہ ہر رنج وغم کو سہہ لیتی تھی مگر اس دن برداشت نہ ہوسکی، تاہم فوراً میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور انھوں نے میرے دل کو دیکھ لیا مگر اشکوں کو نہ دیکھ سکے، مجھے معلوم تھا کہ وہ سب تکلیفیں برداشت کر سکتے تھے مگر میرے آنسوان کے واسطے ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ کہنے لگے ''رانی! میں بھی تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا، یہاں سب کلفتیں جھیلنے کیلئے تیار ہوں مگر میرا اختیار ہی کیا ہے؟'' اس کے بعد۔۔۔۔ وہ کہنے

لگے ’’رانی تم اگلے جنم کی ماں ہو، اس جنم میں میری دیوی ہو‘‘ میں ان کا منہ بند کر دیا۔ پھر بھی وہ کہنے لگے۔

’’تمھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو، گھبرانا مت کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہوگی؟‘‘ اس طرح اس رات الٹے ہی مجھے دلاسا دیتے رہے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ان کے پاکیزہ الفاظ سن رہی تھی۔ میری آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں، اور ان کا دستِ نازک میری پیشانی پر تھا‘‘[۱۴]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کی پہلی بیوی ان کو پسند نہیں تھی ان کے جانے کے بعد دوسری بیوی شیورانی دیوی نے آکر جب گھر سنبھالا تو پریم چند کی مکمل طریقے سے دیکھ ریکھ کی شیورانی کے آنے کے بعد ان کی قسمت سنور گئی تھی وہ اپنے شوہر کے ہر دکھ درد میں شامل رہتی تھیں اور قدم قدم پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتی تھیں گویا انھوں نے پریم چند کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا تبھی تو وہ اتنی معلومات رکھتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو شیورانی نے اپنے سے زیادہ پریم چند کو چاہا اور بہت ٹوٹ کر چاہا۔ ایک مرتبہ کی بات ہے جب ’’پریس‘‘ کھل گیا تھا اور آپ خود بھی وہاں کام کرتے تھے شیورانی کہتی ہیں کہ مجھے ان کے پرانے کپڑے اچھے نہیں لگے تو میں نے ان کو نئے اور گرم کپڑے بنوانے کے لیے چالیس روپئے دئے مگر انھوں نے اپنے کپڑے بنوانے کے بجائے وہ کپڑے اپنے پریس میں کام کرنے والے مزدوروں کو دیدیا کہ وہ اپنے کپڑے بنوالیں۔ تو مزدوروں نے جا کر اپنا کپڑا بنوالیا۔ ایک دن ان کی چہیتی بیوی شیورانی دیوی نے پوچھا کہ کپڑے سلوائے کی نہیں تو کہا کہ سلوایا نہیں ہے بلکہ وہ پیسے ہم نے اپنے مزدوروں کو دیدیئے ہیں تا کہ وہ اپنا کپڑا سلوالیں اس بات پر شیورانی دیوی جھنجھلا اٹھیں تو پریم چند حسب عادت ان سے مسکرا کر کہا کہ جو میرے یہاں مزدوری کرے رات دن کام کرے وہ بھوکے مرے اور میں بہترین اونی سوٹ پہن کر آرام سے رہوں نہیں یہ نہیں ہوسکتا پریم چند نے اپنے تمام ناولوں اور افسانوں میں یہی چیز دکھائی ہے اور غریب اور امیر، ساہوکار، کسان یہی ان کا موضوع رہا اپنے اور غریبوں اور کسانوں سے ہمیشہ ہمدردی رکھی ہے اور ہمیشہ ایسے ہی مضامین کو سامنے رکھ کر افسانے تحریر کئے ہیں اور یہ گویا ان کی اپنی زندگی کی

ترجمانی تھی پریم چند کا حساس دل کبھی یہ نہ چاہتا تھا کہ وہ آرام سے رہیں اور غریب محنت کش اور کسان مصیبت میں رہیں۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو پریم چند اپنا کپڑا خود بنوا لیتے اور مزدوروں کو صرف مزدوری دیتے اسی لیے زمانے نے ان کی قدر کی ان کو عزت سے دیکھا۔ پریم چند بہت خودار آدمی تھے اور یہ خوداری ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ پریم چند جیسا افسانہ نگار شاید ہی کوئی پیدا ہو حالانکہ افسانے وغیرہ آج بھی لکھے جارہے ہیں لیکن پریم چند پریم چند تھے دیہات کی منظر کشی نے ان کا ایسا منظر کھینچا کہ تاحیات کوئی بھی ان کی تصویر اپنی آنکھوں سے مفقود نہیں کر سکتا۔ پریم چند کے رخصت ہوجانے کے بعد شیورانی دیوی کا رو رو کر بہت برا حال ہوگیا تھا کسی طرح صبر و استقلال خدا نے بخشا لیکن افسوس کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

''آہ، آج میں لٹ گئی ہوں، میرا تمام خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ آج مجھے اپنی حالت پر افسوس آتا ہے، افسوس میں کتنی بدنصیب ہوں، میرے تمام خیالات اور اعتقادات مٹے جارہے ہیں۔ ایشور کے انصاف پر بھی میرا اعتقاد کم ہورہا ہے۔ یہ میری زندگی کی اماوس ہے، مجھے بار بار یہی خیال آتا ہے کہ وہ کتنے عظیم الشان تھے، کیسے فرشتہ خصلت تھے اور میں ان پر کس طرح حکومت کرتی رہی کہ اس قدر قریب ہونے پر بھی میں ان کے اوصاف کی قدر نہ کرسکی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ میں ان کی عظمت کو بھی پوری طرح محسوس نہ کرسکی، مگر انھوں نے مجھے نباہ دیا، مجھے چاہا، پیار کیا اور بڑی خاطر داری کے ساتھ اپنے دل میں اونچے سے اونچے آسن پر بٹھایا، اس دن مجھے کتنا غرور تھا، میں ان کی ملکہ تھی۔ وہ دنیا کی نظروں میں افسانہ نگاری کے شہنشاہ تھے۔ مگر میرے شوہر ہوتے ہوئے بھی عزیز دوست تھے۔ مجھے ان کی بدولت دنیا کی تمام راحتیں تمام نعمتیں موجود تھیں، آج میں اکیلی ہوں، آج میری زندگی کی تمام طاقت برباد ہوگئی ہے، میرا دل ویران ہوگیا ہے۔ نہ قلم چلتا ہے اور

نہ گھر گرستی کا کام کرسکتی ہوں، افسوس ان کے بعد میں بالکل مفلس
ہوگئی!''۴۲؎

یہ ایک ہمدرد اور مخلص عورت کے الفاظ تھے جس کے ایک ایک لفظ میں سچائی اور صداقت ہے اور جیسا کہ شیورانی نے کہا کہ ان کے جانے کے بعد ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو یہی ہوتا ہے کہ ایک اچھے اور نیک آدمی کی اہمیت اس کے جانے کے بعد ہی ہوتی ہے خواہ کوئی ہو اور ایک کہاوت بھی ہے جب چیزیں موجود ہوتی ہیں تب تک اس کی قیمت نہیں معلوم ہوتی مگر جب وہ کھو جاتی ہے تو آدمی اس کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اسے اسکی ناقدری کا احساس ہوتا ہے یہاں ایک شاعر کا ایک شعر صادق آتا ہے جس کی ترجمانی شیورانی دیوی کرتی ہیں۔

بھول ہی نہیں سکتے تم ہمیں بھلانے سے
ہم تو یاد آئیں گے نِت نئے بہانے سے
تذکرے وفاؤں کے بعدِ مرگ ہوتے ہیں
زندگی ابھرتی ہے نبض ڈوب جانے سے

مختصر یہ ہے کہ پریم چند پر شیورانی دیوی کا یہ مضمون ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے اور افسانہ نگار کے لیے ایک نیا دروازہ کھول کر ایک نئی علمی کائنات قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے پریم چند پر جو تنقید لکھی گئی اور جن کا جائزہ اس باب میں لیا گیا ہے۔فکشن کی تنقید اور پریم چند کی تنقید کا ابتدائی دور تھا تقریباً 1936ء میں دیا نرائن نگم نے پریم چند کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے رسالہ ''زمانہ'' میں پریم چند کا ایک نمبر نکالا جو اردو میں پریم چند پر پہلی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پریم چند کے وفات کے کچھ دنوں بعد ان کے قریبی دوست دیا نرائن نگم کی ادارت میں شائع ہوا۔اس میں کوئی تحقیقی مضمون تو نہیں ہے لیکن اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل کم وبیش تمام مضامین پریم چند کے احباب اور معاصرین کے لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے پریم چند کی زندگی اور تصانیف کے حوالے سے قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ نمبر تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ پریم چند کے

سوانح شخصیت وحالات سے متعلق ہے جس میں چند مقالے شامل ہیں ان میں دیا نرائن نگم کے مقالوں کی تعداد پانچ ہے جن میں انھوں نے پریم چند کے حالات وکوائف پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔اس میں شریمتی شیورانی دیوی کا بھی مضمون ہے۔اس نمبر کے دوسرے حصے میں چند مضامین ہیں جن میں پریم چند کی افسانہ نگاری، ناول نگاری، آرٹ اور دیگر تصانیف پر بطور خاص توجہ دی گئی ہے۔اس باب میں پریم چند کے دو ناول میدان عمل'' اور ''گئودان'' پر عملی تنقید بھی شامل ہے۔تیسرا باب نہایت انفرادیت کا حامل ہے کیونکہ اس باب میں ہندوستان کے مشہور شاعروں نے پریم چند کی خدمت میں اپنے اشعار کے موتی پروئے ہیں پریم چند سے متعلق ''زمانہ'' کا یہ نمبر پریم چند شناسی کا پہلا مثبت قدم ہے۔انہیں تمام چیزوں کا میں نے اس باب میں جائزلیا ہے۔

پریم چند کے نقادوں نے پریم چند کے عہد اوران کے معاشرتی پس منظر میں ان کے ذہنی ارتقاءاور فنکارانہ تجسس کی بازیافت میں ان کے چند افسانوں اور غیر افسانوی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز ان کے مذہبی،سیاسی،معاشی،اورتاریخی رجحانات کے منظرنامے میں پریم چند کے فکروفن کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔لیکن ان میں تنقیدی نقطۂ نظر کم تعریف وتوصیف کا پہلو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔صرف پریم چند کی زندگی اورخاندانی حالات کونقادوں نے پیش کیا ہے۔لیکن کچھ نقادوں نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا جائزہ بھی لیا ہے لیکن کھل کر تنقید نہیں کی ہے بلکہ تجزیہ پر اکتفا کیا ہے۔فکروفن کے بجائے پریم چند کی دیہاتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے انھیں سب کا جائزہ اس باب میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ اوپندر ناتھ اشک، پریم چند اور دیہات، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء ص:191

۲۔ اوپندر ناتھ اشک، پریم چند اور دیہات، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:193

۳۔ اوپندر ناتھ اشک، پریم چند اور دیہات، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:196

۴۔ فراق گورکھپوری، پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:88

۵۔ فراق گورکھپوری، پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:89

۶۔ فراق گورکھپوری، پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:92-91

۷۔ جگر بریلوی، پریم چند کی ادبی خدمات، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:106

۸۔ جگر بریلوی، پریم چند کی ادبی خدمات، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:107

۹۔ مالک رام، میدانِ عمل (تنقید) اور گئو دان (تنقید)، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:284

۱۰۔ مالک رام، میدانِ عمل (تنقید) اور گئو دان (تنقید)، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی،

جولائی2002ء،ص:291

۱۱۔ سلیم جعفر، منشی پریم چند کی مصوری، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:116

۱۲۔ سلیم جعفر، منشی پریم چند کی مصوری، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:117

۱۳۔ سلیم جعفر، منشی پریم چند کی مصوری، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:115

۱۴۔ مسٹر ایچ ایل گاندھی، پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:187

۱۵۔ مسٹر ایچ ایل گاندھی، پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:187

۱۶۔ مسٹر ایچ ایل گاندھی، پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی2002ء، ص:187

۱۷۔ جگیشور ناتھ بیتاب، منشی پریم چند مرحوم، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:98

۱۸۔ جگیشور ناتھ بیتاب، منشی پریم چند مرحوم، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:100

۱۹۔ جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی، منشی پریم چند کی ادبی دخدمات، رسالہ آجکل، دہلی، اگست 1943، ص:34

۲۰۔ جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی، منشی پریم چند کی ادبی دخدمات، رسالہ آجکل، دہلی، اگست 1943، ص:35

۲۱۔ ساغر نظامی، پریم چند کا ذہنی ارتقاء، رسالہ آجکل، دہلی، جون 1945، ص:57-58
۲۲۔ ساغر نظامی، پریم چند کا ذہنی ارتقاء، رسالہ آجکل، دہلی، جون 1945، ص:58
۲۳۔ ایضاً ص:58
۲۴۔ ایضاً ص:58
۲۵۔ سید علی جواد زیدی، پریم چند کی زندگی اور تصنیف پہ ایک نظر، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، ن ء ی دہلی، جولائی 2002ء، ص:205-206
۲۶۔ ایضاً ص:231
۲۷۔ ایضاً ص: 218-219
۲۸۔ ایضاً ص: 222
۲۹۔ طالب الہ آبادی، ’’پریم چند کے ناول‘‘، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:233
۳۰۔ ایضاً ص: 237
۳۱۔ ایضاً ص: 238
۳۲۔ دیا نرائن نگم، ’’پریم چند کے بعض تصانیف کے حالات‘‘، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، ی دہلی، جولائی 2002ء، ص:140
۳۳۔ ایضاً ص:143
۳۴۔ ایضاً ص:147
۳۵۔ مولوی عبدالحق، ’’پریم چند کا آرٹ‘‘ زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 1936ء، ص
۳۶۔ منشی جگت موہن لال رواں، ’’پریم پچیسی (تنقید)‘‘، رسالہ زمانہ، کانپور، مرتبہ، دیا نارائن نگم، نومبر 1914، ص:221

۳۷۔ ایضاً ص: 222

۳۸۔ ایضاً ص:222

۳۹۔ ایضاً ص:223

۴۰۔ شریمتی شیورانی دیوی، پریم چند اور مسز پریم چند، زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، نئی دہلی، جولائی 2002ء، ص:59,60

۴۱۔ ایضاً ص:60

۴۲۔ ایضاً ص:62

بابِ سوم

پریم چند تنقید: تقسیم ہند تا 1980

پریم چند تنقید: تقسیم ہند تا 1980

اردو کے ایک بڑے نقاد کلیم الدین نے جب کہا تھا کہ ہمارے یہاں تنقید محبوب کی موہوم کمر کی طرح ہے تو یقینی طور پر ان کی مراد فکشن کی تنقید نہیں تھی، بلکہ شاعری کی تنقید تھی۔ اردو فکشن کو ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہو گیا لیکن آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ قابلِ ذکر تنقید لکھنے والوں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

تنقید کے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا۔ یہ تنقیدی شعور انسانوں کے علاوہ جتنی بھی مخلوقات اس روئے زمین پر موجود ہیں سبھی کے اندر قطعی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ صرف ادب کے لئے یا کسی نقاد کے لئے خاص ہو۔ تنقیدی شعور انسان کی پیدائش سے لیکر موت تک ہمیشہ اپنا کردار ادا کرتا ہے اور بھلے بُرے کی پہچان کراتا رہتا ہے۔ تنقیدی شعور ہمارا ہر جگہ برابر کام کرتا رہتا ہے ہم اگر کسی مارکیٹ میں کچھ سامان لینے جاتے ہیں تو اگر دکان دار دو چیزیں دکھائے گا تو ہم اس میں بھلے برے کی تمیز کرنے لگتے ہیں یہی تنقیدی شعور ہے۔ آج کل خاص طور سے جب ہم کسی مدرسے یا یونیورسٹی میں جاتے ہیں تو وہاں باقاعدہ طور پر تنقیدی کتابیں نصاب میں شامل رہتی ہیں اور ہم کو ان کے تنقیدی اصول و ضابطوں سے مکمل آگاہی کرائی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس تنقیدی نقطۂ نظر نے ہمارے ادب میں ایک بڑا مقام حاصل کر لیا ہے۔ جس کے ذریعے تخلیق کار کی تخلیق کو جانچ پرکھ کر ان کی کمیوں کی نشاندہی کر کے ادب پارے کو بہتر بنانے کی طرف گامزن کیا گیا ہے۔ اس طرح تنقیدی روایت کی بنیاد تو بہت پہلے پڑ چکی تھی لیکن حالی نے باقاعدہ طور پر ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر تنقید کے نئے اصول قائم کیے اور ان کے قائم کردہ اصول کے تحت ادب پارے کو جانچنے اور پرکھنے کا کام آج بھی ہو رہا ہے۔

پریم چند نے اپنی مختصر سی ادبی زندگی میں 260 کے قریب افسانے اور تقریباً 15 ناول تصنیف کیے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر درجنوں مضامین، ڈرامے، تبصرے اور ترجمے بھی احاطہ تحریر میں لائے۔ پریم چند کے فکر و فن کا جائزہ لینے کے لیے کچھ مشہور اہل قلم نے ان کی الگ الگ تصنیف پر مختلف اوقات میں چند

بلند اور معیاری مقالات رقم کیے۔

بہت سے نقادوں نے پریم چند کی تحریروں پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اپنے اپنے اعتبار سے ان کی حسن وقباحت بیان کی۔ ان میں چند نام یہ ہیں ہنس راج رہبر، امرت رائے، قمر رئیس، جعفر رضا، مدن گوپال، مانک ٹالا، محمد حسن، شیورانی دیوی، مسعود حسین اور سید احتشام حسین وغیرہ۔ اس باب میں قمر رئیس، مانک ٹالا، جعفر رضا اور دوسرے اہم ناقدین کی پریم چند سے متعلق تحریروں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ان لوگوں نے پریم چند کی تحریروں کو بڑی محنت ودلجوئی کے ساتھ پڑھا اور سمجھا اور پھر پریم چند کی اہمیت واضح کی جو ان کی کتابوں سے نمایاں ہے۔

ان لوگوں نے جب پریم چند پر قلم اٹھایا تو پریم چند کو غور وفکر کے ساتھ پڑھا اور پریم چند کے حالاتِ زندگی بیان ہی کئے۔ خاص طور پر پریم چند کے ناولوں، افسانوں کے کرداروں کے تعلق سے نئے نئے گوشے پیش کئے۔ خاص کر تقسیم ہند کے پہلے کے نقادوں میں نئے گوشے بہت کم ملتے ہیں بس وہی روایتی باتیں کر کے پریم چند کی تعریف بیان کردی ہے۔ بہت زیادہ ہوا تو ان کی دیہاتی زندگی اور سماجی کشمکش وغیرہ کی کچھ تفصیل دے دی۔ لیکن اس باب میں پریم چند کے ہر گوشے پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اور جس چیز کو بیان کرتے ہیں اس کی پوری تفصیل پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک لمبا اور بیش قیمتی وقت پریم چند کی تصنیف کو پڑھنے میں صرف کیا تب کہیں جا کر اس مقام کو حاصل کر پائے ہیں۔ ان کی اس تنقیدی زاویئے کی وجہ سے قمر رئیس، مانک ٹالا، اور جعفر رضا کو ادب میں ایک نمایاں اور بلند مرتبہ ملا۔ پریم چند تنقید تقسیم ہند تا 1980 میں ہنس راج رہبر، مدن گوپال، مانک ٹالا سے سید احتشام حسین تک پریم چند شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے چند کا عمومی جائزہ اس باب میں پیش کر رہا ہوں۔

ہنس راج رہبر:

پریم چند شناسوں میں ہنس راج رہبر نے بھی پریم چند کے حوالے سے اپنے قلم کے ذریعہ اردو فکشن کی تنقید میں ایک اہم اور منفرد مقام بنایا۔ پریم چند ایسی شخصیت کا نام ہے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہر خاص و عام کو متاثر کیا ہے۔ چاہے وہ پہلے یا دوسرے درجے کے طالب علم ہوں یا کسی یونیورسٹی کے

پروفیسر، پریم چند کی تحریروں میں ایسی شیرینی اور چاشنی ہے کہ اس سے لطف اندوز ہونا ہر کوئی چاہتا ہے۔ اسی طرح لطف اندوز ہونے والوں میں ایک نام ہنس راج رہبر کا ہے۔ انھوں نے پریم چند کی حیات وشخصیت کو نکھارنے کی حتی الوسع کوشش کی اور کوشش کے ساتھ ساتھ رہبر کو یہ بات ہر جگہ اور ہر قدم پر اکسارہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھیں وہ صداقت وحقیقت کی روشنی میں رہ کر لکھیں تاکہ آگے چل کر پریم چند کو صاف اور شفاف آئینے میں دیکھ کر ان کی اہمیت کا تعین کیا جاسکے۔ رہبر نے اپنے پورے مقالے ''پریم چند'' میں پریم چند کی زندگی پیش کرنے کے ساتھ ان کے فن پر بھی قدرے گفتگو کی ہے۔ اس لئے کہ اگر زندگی صحیح طور سے پیش کر دی گئی تو ان پر لکھنے والے اور سمجھنے والے بہتر طریقے سے ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ نئے نئے زاویوں اور گوشوں کی تلاش میں انھیں ادھر ادھر بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ ہنس راج رہبر کہتے ہیں کہ میں جب ساتویں جماعت میں تھا تب میرے اسکول میں ایک رسالہ ''مخزن'' نام سے آتا تھا جس میں پریم چند کی کہانیاں چھپتی تھیں میں نے اس میں پریم چند کی کہانی ''منتر'' پڑھی اور اس کہانی کا ہیرو ''بوڑھا بھگت'' اتنا پسند آیا کہ وہ میرے دل میں ایک ان مٹ نقش قائم کر گیا اور اس نے میرے دل کو بہت متاثر کیا۔ جس کے چلتے مجھے ہمیشہ پریم چند کی تحریروں کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا جب جہاں مجھے پریم چند کی کوئی بھی تحریر نظر آتی اس کو پڑھے بغیر نہیں رہتا تھا۔ انھیں چیزوں نے ہنس راج رہبر کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے پریم چند پر کتابیں لکھ کر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کے حالات اسکول، بچپن، درسگاہ، اسکول ماسٹر، پہلی تخلیق، کانپور میں، بمبوق، سوزِ وطن، نیا بیاہ، استعفیٰ، گھر میں پبلیشر، پریس، ایڈیٹر سرمایا ترا، فلم، صدارت، عمل، آرٹ اور شہرت پر بہترین اظہار خیال کیا ہے۔ جس کے ذریعے پڑھنے والے پر ایک سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ اور قاری نہایت شائستگی سے پریم چند کو پڑھتا اور حالات کی تہہ میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ہنس راج نے جو مقالے لکھے ہیں ان کے ذریعے پریم چند کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ہندوستان کی موجودہ تحریکوں کو سمجھنے اور انہیں آگے بڑھانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک شرط یہ ہے کہ ان کا مطالعہ زندگی اور ادب کے سماجی اور طبقاتی تعلق کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ سید احتشام حسین کہتے ہیں:

''پریم چند پر ہنس راج کی یہ کتاب ایک ایسے ہی مطالعے کی حیثیت

رکھتی ہے اوراس کمی کوایک حدتک پورا بھی کرتی ہے۔۔۔۔

پریم چند افسانوی ادب کا ایک عہد اور ایک روایت تھے۔تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو اردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کا آغاز انھیں کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت پسندی انسان دوستی اور جانبداری کا رنگ لئے ہوئے ہے۔اس کا ایک سماجی مقصد ہے جسے شروع میں پریم چند نے اصلاحی رنگ دے کرآدرش اور مثالیت کے روپ میں پیش کیا تھالیکن اپنی زندگی کے آخری دور میں ادب اور زندگی کے تعلق کوسمجھ کرانھوں نے اس ادب کی مذمت کی جوعوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار نہ ہواور جوحرکت اور بےچینی پیدا نہ کرے''[1]

پریم چند نے بہت سے مضامین کے ساتھ ڈرامے بھی تحریر کیے جو پریم چند کی مقبولیت اورشہرت میں اضافے کا باعث ہیں۔لیکن اردو کے دوشعبے خاص کر پریم چند کے قلم کی رہین منت ہیں۔ایک افسانہ اور دوسرا ناول۔ان اصناف کا مطالعہ کرنے سے پریم چند کے فن کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے محلوں، درباروں، شہزادوں،شہزادیوں، جن اور دیو پری سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنے دیہات کے غریب مزدور کسانوں کے کردار کواپنے افسانے اور ناولوں کی زینت بنایاہے اوران افسانوں اور ناولوں میں پریم چند کی دیہی زندگی کے سارے عناصر ملتے ہیں اسلئے کہ پریم چند نے ایک دیہاتی علاقے میں جنم لیا اور وہیں پلے بڑھے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔اور کھیلے کودے بھی جس کی وجہ سے دیہات کی ہر چیز پر پریم چند کی نظر تھی۔ پریم چند کے گاؤں کے تعلق سے ہنس راج رہبر کے مقدمہ میں سید احتشام حسین کہتے ہیں:

''اس ہندوستان میں پریم چند بنارس کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے۔ وہ گاؤں کی زندگی سے واقف ہی نہ تھے اس سے جذباتی اور ہمدردانہ تعلق بھی رکھتے تھے۔ان کا گھر ایک نچلے متوسط طبقے کا گھر تھا حالات ایسے تھے کہ بچپن ہی سے انھیں اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ

پالنے کے لئے میدانِ عمل میں اترنا اور زمانے کے اونچ نیچ کو دیکھنا

پڑا۔''[۲]

پریم چند نے انھیں مواد اور مضامین کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں استعمال کیا جس کو وہ خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ بہت دور کی کوڑی لانے سے گریز کیا ہے۔ پریم چند نے داستانی قصوں اور مافوق الفطرت کرداروں سے پرہیز کیا ہے۔ بس اپنے اردگرد کے کرداروں کو اٹھایا اور اپنے تحریروں میں پیش کردیا تاکہ صداقت اور سچائی کے عناصر موجود رہیں اور قاری کے دل پر زیادہ اثر پزیر ہوں۔ اسلئے کہ ناول نگار اور افسانہ نگار اپنے خیالات کا اظہار اپنے کرداروں کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ اور ان کرداروں میں بعض کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں مصنف خود پسند کرتا ہے اور وہ کردار اس کے موافق عمل بھی کرتے ہیں اور بعض کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو مصنف کی باتوں سے گریز بھی کرتے ہیں اور اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان ہی کرداروں کے ذریعے سماج کی عکاسی اور معاشرے کی ترجمانی بھی ہوئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ انھیں دونوں کرداروں کے اردگرد کہانی گردش کرتی ہے۔ بلکہ یہ کردار کہانی میں زنجیروں کی طرح ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس میں تنقیدی بصیرت والے اصل حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

ہنس راج رہبر کہتے ہیں کہ میں نے پریم چند کے فن پر کم لکھا ہے زیادہ تر حقائق پریم چند کی زندگی پر ہی بیان کیے ہیں۔ ہنس راج رہبر پریم چند کے بچپن کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند جن کا اصلی اور بچپن کا نام دھنپت رائے تھا یہ 31 جولائی 1880ء کو موضع لمہی میں پیدا ہوئے جو پانڈے پور کے قریب بنارس سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پریم چند کے والدِ محترم عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے اس لئے پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں ڈاکخانے کا ماحول اور ملازموں کی زندگی کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔ اور انہیں کہانیوں کے ذریعہ پریم چند کے بچپن کے واقعات بھی منکشف ہوتے ہیں بچپن کے تعلق سے ہنس راج رہبر کہتے ہیں وہ اپنے قزاقی افسانے میں لکھتے ہیں:

''قزاقی ذات کا پاسی تھا۔۔۔ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا... جب وہ دوڑتا تو اس کے بلم کے گھنگھرو بجنے لگتے۔''[۳]

اس ننھے منے بچے کے دل پر بلم کے گھنگھروکی آوازسن کر جو کیفیت طاری ہوئی وہ ذیل کے اقتباس میں دیکھیں۔

''میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا جو خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحے میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کی بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ مسرت و سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہوجاتی۔ جب قزاقی مجھے اپنی کندھوں پر لئے دوڑنے لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر دوڑا جا رہا ہوں۔''[۴]

اس طرح کی ننھے اور چھوٹے بچوں کی شرارتیں بجائے بری لگنے کے اور اچھی لگتی ہیں اور اسی طرح کے بچے آگے چل کر ایک بڑا نام بھی پیدا کرتے ہیں۔ شرارتی بچوں کے اندر ذہن کی تیزی اور وسیع الفہمی بھی ہوتی ہے تبھی ان کے ذہن میں ہر طرح کی شرارت سوجھتی رہتی ہے اور یہی نہیں یہ بچے آگے چل کر کوئی نہ کوئی بڑا کارنامہ ضرور انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح پریم چند کو جب اسکول میں اردو فارسی پڑھنے کے لئے بھیجا گیا تو اس وقت مدرسہ کی جو شرارتیں تھیں ان کو اپنے افسانہ ''چوری'' میں تحریر کیا ہے۔ ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند صرف گھومنے والے ہی رہ گیے ہیں لیکن اس بچپن کی آوارگی نے پریم چند کو کتنا نکھارا اس کی پوری وضاحت آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسکول کا حال ملاحظہ کریں:

''دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کی تھی۔ علی الصبح جو کی روٹیاں کھا کر روانہ ہوجاتے تھے۔ مولوی صاحب کے یہاں حاضری رجسٹر تو تھا ہی نہیں پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے ہوکر سپاہیوں کی قواعد دیکھتے۔ کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور

گاڑیوں کی بہار دیکھتے کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے تھے مگر مولوی
صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی تیوریاں اتر جاتیں''۵؎

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کی طبیعت میں آوارگی کو کافی دخل تھا لیکن یہی آوارگی آگے چل کر ایک گرانقدر شخصیت کی روح میں تحلیل ہو کر ادب کی دنیا کا آفتاب بن گئی۔ اور اس کی چمک سے پوری اردو دنیا روشن و تابناک ہے۔ اور آج کا کوئی بھی افسانہ نگار یا ناول نگار یا کوئی نقاد پریم چند کا تذکرہ کیے بغیر اپنا ادبی سفر مکمل نہیں کر سکتا۔ ایک وقت ایسا تھا جب پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک عہد کو متاثر کر دیا تھا اور اس عہد میں جس کا افسانہ یا ناول پریم چند کی تحریر سے میل نہیں کھاتی تھی اسکو دائرے ادب سے نکال دیا جاتا تھا اور بے معنی سمجھا جاتا تھا اس طرح سے جس شخصیت نے اپنے قلم کے ذریعے ایک عہد کو متاثر کر رکھا ہو اس کو کس طرح سے بھلایا جا سکتا ہے۔ پریم چند کا اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہندی رسم الخط کی واقفیت کے باوجود اردو کو ترقی بخشی ہے اور اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اردو کی شان و شوکت کو ایک بلند مقام عطا کیا ہے جہاں پریم چند کی عظمت قائم رہے گی وہیں ہنس راج رہبر بھی امر رہیں گے۔

ہنس راج رہبر نے اپنے مقالے کے ذریعے پریم چند کی زندگی کا تو احاطہ کیا ہی ہے ساتھ ساتھ پریم چند کی زندگی میں آنے والے نشیب و فراز کو بھی بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے ہنس لکھتے ہیں کہ پریم چند پر ابتدا ہی سے معاشی بوجھ آ گیا تھا اور پریم چند اس بوجھ کے نیچے دبے ہوئے تھے لیکن حصولِ تعلیم کا جذبہ کم نہیں تھا۔ حالانکہ ریاضی کے امتحان میں انٹرمیڈیٹ میں پریم چند دو بار فیل ہوئے اس کے بعد امتحان دینے کا سلسلہ ختم کر دیا لیکن دس بارہ سالوں کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو پھر پریم چند نے اپنے اعتبار سے انگریزی، منطق، فارسی اور زمانہ حال کی تاریخ وغیرہ لیکر انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس طرح تعلیمی سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور انھوں نے بی۔اے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویزن میں پاس کر لیا اور ان کے سبجیکٹ تھے۔ انگریزی، فارسی اور تاریخ پھر اس کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش میں رہے اور آخر گورنمنٹ اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر ہو گیے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا شوق تو بہت ہی تھا اس سلسلے میں ہنس راج لکھتے ہیں۔

''انھیں (پریم چند) قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا ہی اور یہ شوق ہمیشہ بڑھتا رہا کیونکہ یہ قصے کہانیاں ان کی بے کیف اور بے رنگ و بو زندگی میں رومان اور رنگ بھرتی تھیں۔ ''طلسم ہوش ربا'' اور ''چندر کانت سنتتی'' کے تخیل کردار خارجی واقعات کے خلاف جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتے تھے قوتِ عمل کو محرک رکھتے تھے اور ان کے رگ و پے میں جو حرارت پوشیدہ تھی اسے شعلہ گر بناتے تھے اس سے ان کے ذہن پر ادب کی افادیت نقش ہو گئی تھی۔''[۶]

اس طرح ابتدائی قصے کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے پریم چند نے آگے چل کر اپنے قلم کے ذریعے بھی کچھ کہانیوں اور ناولوں افسانوں پر طبع آزمائی شروع کی۔ اور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا اردو میں سب سے پہلا ناول ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' 1901ء میں لکھا لیکن کہانی کی بات کریں تو سب سے پہلی کہانی 1907ء ہی میں لکھی۔ لیکن ناولوں کا سلسلہ تو انھوں نے 1901ء ہی میں شروع کر دیا تھا۔ ان کی کہانیوں میں بڑی دلچسپی ہے اس لئے کہ ان کی کہانیاں زیادہ تر حقیقت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اس لئے کہ پریم چند جو سماج میں دیکھتے تھے اس کی ناولوں افسانوں اور کہانیوں کے کرداروں کے ذریعے اصلاح ممکن سمجھتے تھے۔ جس میں مکمل کامیابی بھی حاصل کی۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ماموں کا مذاق بھی ایک کہانی میں اڑایا ہے جن کو ایک چماری سے عشق تھا اور اس نے پریم چند کے ماموں کی اچھی طرح سے پٹائی کرائی تھی اور یہ کہانی تھی ''پہلی تخلیق''، جس میں پریم چند نے خوب مزے لے لے کر ماموں کا واقعہ بیان کیا ہے۔ پریم چند کے شروعاتی ناولوں اور افسانوں میں نئے ادیب کی تصنیفات کی طرح فنی اعتبار سے کمیاں ہیں۔ اس لیے ان کی عبارت اپنے پیش رووں کی طرح مقفع اور پر تکلف تھی۔ ان کے قصوں اور ناولوں پر قصہ چہار درویش، اور رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' کا رنگ غالب تھا اسی سلسلہ میں سید علی جواد زیدی نے پریم چند کے تعلق سے ایک اقتباس پیش کیا ہے کہتے ہیں:

''جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں وہ سب اس کی کوشش کرتے ہیں کہ

وہ ایک انفرادی حیثیت حاصل کریں یہی وجہ ہے کہ اگر پریم چند کی تصانیف کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تمام افسانے ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ مختلف مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں کہیں سرشار کا رنگ نظر آئے گا کہیں بشن نارائن در کا اور کہیں رابندر ناتھ ٹیگور کا اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کا یہ عقیدہ تھا کہ عبارت اور خیالات میں حتی الوسع ہم آہنگی پیدا کی جائے جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ویسے ہی طرز ادا کا انتخاب بھی کرتے تھے۔''[۷]

یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہر ادیب اپنے ہم عصروں اور اپنے پیش رؤں سے متاثر ضرور ہوتا ہے اور پھر اسی سے متاثر ہو کر اپنی عمارت کی بنیاد قائم کرتا ہے پھر اپنی عمارت کی صورت چاہے جس طرح قائم کرے یہ ناول نگار اپنے اعتبار سے طے کرے گا۔

پریم چند بہت سنجیدہ مزاج کے مالک تھے اور انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے سماج اور معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے دلوں پر چوٹ بھی کی ہے بعض افسانے تو ایسے ہیں جن کو پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ حالات کے تعلق سے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جس طرح کے موضوعات کا استعمال کیا ہے اس سے ان کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن انھوں نے ایک افسانہ ''بمبوق'' بھی تحریر کیا ہے جس کا معنی ہے بہت ہنسنے اور قہقہے لگانے والا۔ بمبوق نام پریم چند کے دوستوں نے پریم چند کو دیا تھا۔ بابو کرشن پریم چند کے بمبوق ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے آپ کی اور مرحوم بابو گرجا کشور اسسٹنٹ کمشنر آبکاری کی وجہ سے ہمارا ایک چھوٹا سا لافنگ کلب (Laughing Club) بن گیا تھا جس کا روزانہ اجلاس میرے ہی

> کمرہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس میں شاید اور بھی دو ایک صاحب تھے لیکن اس وقت خیال نہیں آتا۔ لیکن بہر حال ان میں سبھی ہنسنے والے تھے مگر دھنپت رائے غضب کرتے تھے۔ جب ہنستے تو خوب ہنستے اور قہقہے پر قہقہے لگاتے چلے جاتے اسی وجہ سے ہم لوگ خاص کر یہ۔۔۔۔۔ اور گرجا کشور انہیں ''بمبوق'' کہا کرتے تھے اور ممکن ہے یہ لقب میرا ہی اختراع ہو۔ اکثر اسی نام سے راقم کی ان سے خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔''[۸]

اس تعلق سے پریم چند کے بہت سے واقعات ہنس راج رہبر نے قلم بند کیے ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند سنجیدہ رہنے کے ساتھ بہت ہنس مکھ بھی تھے۔ جس کی زندگی میں ابتدا سے غم نے گھر کر لیا اور پھر اس شخص نے زندگی کو خوشگوار بنائے رکھا ہو تو یہ بڑی بات ہے ورنہ ذرا سا غم ہو تو آدمی پوری زندگی مسکرانے کیلئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ یہ پریم چند کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے غموں کے ساتھ ہنسنے کا سلیقہ بھی اپنے دامنِ ہنر میں رکھا۔ اور ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہے۔ ہنس راج رہبر نے ایڈیٹر کے حوالے سے پریم چند کے ان جذبات کا بھی اظہار کیا ہے جس کیلئے پریم چند وکیل بننا چاہتے تھے لیکن پریم چند کا یہ خواب پورا نہ ہوا تو انھوں نے اپنے ناولوں، افسانوں اور کہانیوں کے ذریعے مظلوم عوام کی مدد کی اور عوام کے درد کو اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کیا اسی سلسلے میں پریم چند کو کسی رسالے کا ایڈیٹر بننے کی بھی امنگ پیدا ہوئی اور یہ اس کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک ایڈیٹر کا کام ہوتا ہے۔ عوام اور ملک کی خدمت اور اس کے مفاد کی چیزیں اور بہتر مشورے پریم چند ''مریادا'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور خود اخبار ورسائل وغیرہ بھی چھاپنے کی کوشش میں تھے لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہوا۔ جولائی 1929ء میں لکھنؤ پریس نول کشور کے مالک منشی بشن نارائن نے پریم چند کو لکھنؤ بلایا ان کے مطبع سے مشہور ہندی رسالہ ''مادھوری'' نکلتا تھا یہاں بلا کر بشن نرائن نے پریم چند کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا اور نومبر 1931ء تک نول کشور پریس میں کام کرتے رہے لیکن بشن نارائن کے انتقال کے بعد پریم چند کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ لیکن پریم چند نے ''مادھوری'' کے ایڈیٹری کے دوران ہی اپنا پرچہ ''ہنس''

جاری کر دیا جس کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں لگے رہے۔ جس کے اندر ملک کی محبت ہوتی ہے وطن سے لگاؤ ہوتا ہے وہ کہیں بھی رہے کسی بھی حالت میں رہے اپنے وطن پر غیروں کی حکومت کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی جذبہ پریم چند کا بھی تھا۔ انھوں نے ہر اعتبار سے ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے کو سرکاری ملازمت سے بھی الگ کرلیا اس لئے ملک کو آزاد دیکھنے کی تمنا رکھنے والے کسی بھی چیز کی پروا نہیں کر سکتے ہیں۔ ہنس راج رہبر نے اپنے مطالعے کے ذریعے پریم چند کے مکمل حالات سے آگاہ ہو کر اپنا یہ مقالہ نہایت ہی عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے اور پریم چند کی زندگی کے حقائق بیان کئے ہیں۔ ان کی کہانیوں، قصوں، ناول اور افسانوں کا بھی تعارف کرایا ہے۔ خاص طور سے پریم چند کے سلسلے میں آج تک سبھوں نے صرف سنجیدگی کی بات کی ہے لیکن کسی نے ''بمبوق'' کے تعلق سے پریم چند کی صورت نہیں دکھائی ہے۔ اس کے لئے ہنس راج کو بڑی محبت سے دیکھا جانا چاہئے۔

ہنس راج رہبر نے ان سبھی چیزوں کے ساتھ پریم چند کے خطوط کو بھی اجاگر کیا ہے ان میں سے ایک خط وہ بھی ہے جو پریم چند نے اوپندر ناتھ اشک کو ارسال کیا تھا۔ یہ خط اس وقت کا ہے جب اوپندر ناتھ اشک نے لکھنا شروع کیا تھا اور پریم چند کے رسالے ''ہنس'' میں اپنی تحریریں چھپوانے کیلئے بھیجا کرتے تھے۔ اس خط کو دکھانے کا مقصد یہ نہیں کہ صرف خط کو دکھایا جائے لیکن ان کے خطوط کے ذریعے پریم چند نے تحریکِ آزادی میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور یہ خطوط ہمارے ادبی سرمایے کا ایک بڑا حصہ بھی ہیں۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

''گنیش گنج لکھنؤ 25 فروری 1932

پریہ بندھو

آشیرواد! معاف کرنا تمھارے دو خط آئے ''بہشتی کی بیوی'' میں نے پڑھا تھا اور بہت پسند کیا تھا۔ تم نے اردو کا ایک اور چھوٹا سا چٹکلا بھیجا تھا میں اسے ہندی میں دے رہا ہوں۔ مگر ہندی میں جو چیزیں تم نے اب

تک بھیجی ہیں۔ان میں زبان کی ابھی بہت خامی ہے۔ ہندی کے پتر دیکھتے رہو گے تو سال چھے مہینے میں یہ ترٹیاں دور ہو جائینگی۔کوئی کہانی ہمارے لئے ہندی میں لکھو مگر کہانی ہو۔فینسی نہیں۔اگر کسی مہان ویکتی کا جیون چرتر ہوتو اس سے بھی کام چل سکتا ہے۔مگر میری تو صلاح یہی ہے کہ بہت زیادہ لکھنے کے مقابلے میں لٹریچر اور فلاسفی کا ادھیئن کرتے جاؤ کیونکہ اس وقت کا ادھیئن زندگی بھر کے لئے اُپ یوگی ہوگا۔

اور تو سب خیریت ہے　　　　سبھیش دھنپت رائے

گنیش گنج لکھنؤ''۹

ان چیزوں کے ذریعے ہنس راج رہبر نے پریم چند کی زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کر کے پریم چند کی اہمیت کو اجاگر ہی نہیں کیا بلکہ آنے والی نسلوں کی اصلاح اوران کے استفادے کیلئے ایک نیا اور آسان راستہ فراہم کردیا ہے۔ جن کے ذریعے پریم چند کو سمجھنے اوران پر ریسرچ کرنے کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ہنس راج رہبر کا یہ کارنامہ ہمیشہ مبارک باد کے قابل رہے گا اس لئے کہ پریم چند کے تعلق سے انھوں نے جو بھی باتیں پیش کی ہیں ان کو بہت غور فکر کے ساتھ پیش کیا۔اورانھوں نے اس میں اپنی طرف سے کوئی خیال پیش نہیں کیا ہے بلکہ جو کچھ پڑھا شیورانی دیوی سے مل کرانہیں باتوں کو اپنے مقالے میں جگہ دی جو پریم چند کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔

مختصر یہ کہ پریم چند پر ہنس راج رہبر کا یہ مقالہ منشی پریم چند کے فن اوران کی شخصیت کو احاطہ کیے ہوئے ہے اوران کے کارناموں کو فراموش کرنے سے قاصر نہیں۔

مانک ٹالا:

منشی پریم چند کی زندگی، شخصیت اورفن پر گزشتہ کئی سالوں سے بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔اسی ضمن میں پریم چند پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں اوران کی شخصیت کی اہمیت کو اجاگر کرنے والوں میں ایک اہم نام مانک ٹالا کا بھی ہے۔ مانک ٹالا نے پریم چند کی تحریروں کو جانچ پرکھ کر نئے نئے زاویے پیش کیے ہیں اوراپنے تحقیق

کاموں کے ذریعے پریم چند کی زندگی کے واقعات کو قلمبند کرنے کی کوشش بھی کی ہے پریم چند پر انھوں نے اپنی پہلی کتاب ''پریم چند اور تصانیف پریم چند۔ کچھ نئے تحقیقی گوشے'' کے ذریعے پریم چند کے چھپے ہوئے گوشوں پر خاص توجہ کی ہے۔ ان کی اہم تصنیف پریم چند کچھ نئے مباحث، پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین، توقیت پریم چند، اور آخری نغمہ، جو (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ) ہے۔

پریم چند کے افسانوں اور ناولوں پر توجہ کی خاص بات یہ ہے کہ مانک ٹالا خود بھی ایک افسانہ نگار تھے اس لیے وہ افسانوں کے فن اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے جس کی وجہ سے انھوں نے پریم چند کی تصویر کو اپنے دل کے آئینے میں اتار کران کو ایک سچے عاشق کی طرح دیکھا جس کو دیکھنے کے لیے معشوق کا چہرہ ہمیشہ عاشق کی نگاہوں کا منتظر رہتا ہے۔ مانک ٹالا کو خود ان کے افسانے بے حد معروف اور مقبول بناتے ہیں۔ وہ کردار پلاٹ منظر نگاری اور واقعات نگاری پر بڑی گہری گرفت رکھتے ہیں جو بذاتِ خود اتنا قابل ہو اور ان اصناف میں مکمل قدرت رکھتا ہو تو پھر اس کے لیے دوسروں کو انھی اصناف میں پرکھنا اور آسان ہو جاتا ہے اور ان کے تحت الشعور تک رسائی بھی ہو جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کب اور کس زاویے سے تخلیق کار بات کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے مانک ٹالا کی تنقیدی نظر پر قدرتِ کاملہ کے ساتھ تحقیقی کاموں پر بھی بڑی گرفت ہے۔ مانک ٹالا نے پریم چند پر تنقیدی نظر تو ڈالی ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی پریم چند کو جانچنے اور پرکھنے کی بھرپور کوشش کی اس سلسلے میں پریم چند کے تعلق سے کچھ غلط باتیں راہ پا رہی تھیں جس کے لیے مانک ٹالا نے انہیں تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کو ہی بہتر جانا۔ اس کی وجہ ایک یہ تھی کہ کچھ تحریریں جو اصل میں پریم چند کی نہیں تھیں ان کو پریم چند کی تصنیف قرار دیا جا رہا تھا۔ مانک ٹالا نے ان کو اپنے تحقیقی زاویے پر پرکھ کر غلطی کی نشاندہی کی اور صحیح حقائق پیش کیے۔ یہ تحقیقی کام ہے لیکن یہاں تحقیقی کام کے ذریعے مانک ٹالا نے بہت سی چیزوں کا اظہار کیا ہے جو پریم چند کی شخصیت اور کارنامے کے لئے ضروری بھی ہیں۔ منشی پریم چند پر بہت سے اعتراض بھی کیے گیے اور غلط الزامات بھی عائد کیے گیے اور ان کو تعصب پرستی کا حامی بھی قرار دیا گیا یہ سب صرف پریم چند اور اردو کو بدنام کرنے کیلئے کیا گیا تھا۔ لیکن پریم چند پر جتنے بھی الزامات عائد کیے گیے ان کا جواب مانک ٹالا نے اپنی اسی کتاب ''پریم چند اور تصنیف پریم چند۔ کچھ نئے

تحقیقی گوشے‘‘ میں بڑی سمجھ بوجھ کے ساتھ دیا ہے پریم چند کے وقت سے لیکران کی وفات کے بعد تک کچھ فرقہ پرستوں نے پریم چند پر اپنے اعتبار سے کیچڑ اچھالنے اور پریم چند کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی کبھی پریم چند کو ہندی کا ادیب کہہ کر کبھی مذہبی تعصب کا لبادہ ڈال کر بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی حتیٰ کہ پریم چند پر یہ بھی الزام لگایا کہ ان کے اپنی سوتیلی ماں سے ناجائز تعلقات تھے۔ اور یہ آواز بھی اٹھنے لگی کہ پریم چند فرقہ پرست اور اردو کے دشمن تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے بھی دشمن تھے یہاں تک کہ پریم چند کو ماضی حال اور مستقبل میں ہونے والے سبھی فسادات کا ذمہ دار ٹھہرا دیا گیا۔ ان ساری چیزوں نے مانک ٹالا کو پریم چند پر تحقیقی کام کرنے پر مجبور کیا۔ اور اس کام پر مانک ٹالا کمر بستہ ہوکر ساری چیزوں کو چھان پھٹک کر ان کی اصلیت پیش کرنے میں بڑی محنت سے کام لیتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ غلط اور بے ہودہ افواہوں کو خارج کرتے رہے۔ اپنے تحقیقی کام کے تعلق سے ’’پریم چند اور تصانیفِ پریم چند کچھ نئے تحقیقی گوشے‘‘ میں رقم طراز ہیں:

> ’’جوں جوں پریم چند کی تخلیقات کو پڑھتا گیا ایک نیا افق میرے سامنے ابھرتا چلا گیا۔ جن جن تخلیقات کی نشاندہی کی گئی تھی اور ان کے اقتباسات سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیے گیے تھے۔ وہی تحریریں جب پورے تناظر میں پڑھی گئیں تو پتہ چلا کہ پریم چند ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور بہت سی اعلیٰ وارفع انسانی اقدار کے علمبردار تھے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ زندگی کے آخری لمحے تک کمر کسے رہے‘‘ ۱۰؎

پریم چند اپنے ملک اور قوم کے سچے ہمدرد اور انسانیت کے درد سے واقفیت رکھنے والے انسان تھے۔ ان کے اندر بھید بھاؤ نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس طرح پریم چند ہندو برادری سے تعلق رکھتے تھے بالکل اسی طرح مسلم سے بھی بہتر تعلقات تھے اور دونوں کو بھید بھاؤ کے آئینے سے پریم چند نے کبھی نہیں دیکھا جو ان کی انفرادیت ہے۔ اگر کہیں سے یہ خبر آتی کہ فلاں جگہ ہندو مسلم آپس میں لڑ گیے ہیں تو پریم چند کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ اور اس معاملے کو لیکر بہت رنجیدہ ہوجاتے تھے۔ یہ پریم چند کی رواداری تھی۔ پریم چند

پر مانک ٹالا کے قلم اٹھانے کا ایک سبب یہ بھی کہ جس طرح پریم چند ملک کے اندر سماجی مساوات کے حامی تھے مانک ٹالا کی ذہنیت بھی بالکل اسی طرح تھی۔ جس طرح انسانی زندگی اوراس کے مسائل کو مانک ٹالا نے پیش کیا بالکل یہی زاویہ نظر پریم چند کا بھی تھا گویا دونوں ایک ہی صفات کے مالک تھے۔ مانک ٹالا کا موقف یہ ہے کہ پریم چند کو انسان اور انسانیت سے ہمدردی تھی وہ دبے کچلے اور پسماندہ طبقے کو سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ مانک ٹالا نے بڑی دور اندیشی سے کام لیکر پریم چند کی اہمیت کو اجاگر کیا جیسا کہ مانک ٹالا خود اپنے مقدمے میں کہتے ہیں کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے بلکہ پریم کی جو چیزیں ہم تک پہنچی بالکل من و عن ہم نے اسی طرح پیش کردی ہیں۔ مانک ٹالا کی تصنیف۔ پریم چنداور تصانیف پریم چند۔ کچھ نئے تحقیقی گوشے کے ذریعے پریم چند کی کچھ ایسی نادر تحریروں کو جمع کیا ہے۔ جو گمنامی کی دنیا میں چلی گئی تھیں۔ اس کے ذریعے پریم چند کی شخصیت ماحول اور کمالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان میں زیادہ تر تحریریں قومی یکجہتی کے تعلق سے ہیں اوران میں فرقہ پرستی کے خلاف باتیں ملتی ہیں۔

پریم چند کے بارے میں مانک ٹالا کو اگر کسی بات کا شک وشبہ ہوتا تو فوراً اس کی تحقیق میں لگ جاتے اوراس وقت تک کوشش کرتے جب تک حقائق سامنے نہ آجاتے۔ مانک ٹالا نے پریم چند کے بارے میں جو تحقیقی گوشے پیش کیے ہیں ان کا کینوس بہت وسیع اور کشادہ ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔

> ’’مولانا عبدالماجد دریابادی اور پریم چند، اردو ہندی اور پریم چند، سوزِ وطن کی ضبطی، سوزِ وطن پر نئی روشنی، اردو ہندی ہندوستانی اور پریم چند، سمریاترا کی ضبطی، ہاتھی اوراندھے، یوپی گزٹ کا گمراہ کن آئینہ، چوگانِ ہستی سے گئو دان تک، پریم چند کی تحقیق پر محققین کی لغزشیں، قومی یکجہتی اور پریم چند، میدانِ عمل اور واردات کی پہلی اشاعتوں کا سالِ طباعت، کیا پلشم کے نام سے کہانیاں پریم چند کی تحقیق، پریم چند کی نایاب کہانیاں، پریم چند کی گم شدہ تخلیقات کی بازیافت(روحِ حیات

افسانہ) ٹالسٹائی (سوانحی مضمون) بہاری سَت سی (تبصرہ)''[11]

درج بالا اقتباس کے ذریعے مانک ٹالا نے پریم چند پر اپنی تحقیقی کاوشوں کے حوالے سے گمنام چیزوں کا انکشاف کیا جو پریم چند کی اہمیت کو دوبالا کرتے ہیں۔ مانک ٹالا کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگر انہیں موجود مواد کے ذریعے پرانے فیصلوں میں کچھ ترمیم اور حشو وزائد سے کام لینے کی ضررت پڑی تو اس میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے فوراً اس میں تبدیلی کر دیتے تھے۔ یہ نہیں کہ جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہوگئی۔ اس لئے کہ مانک ٹالا پریم چند پر تنقید کے ساتھ تحقیق بھی کر رہے تھے اور تحقیق میں کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جو کہہ دیتے اسی پر جمے رہتے تحقیق کا اصول بھی یہی ہے کہ باتوں کو ہمیشہ پرکھا جائے اور جب بھی جہاں کوئی حق وصداقت نظر آئے اس کو تسلیم کر لیا جائے۔ پریم چند کے تعلق سے غلط باتیں راہ پانے کے ساتھ ان کی تحریکوں میں غلط اثرات نمایاں کر رہی تھیں کہ پریم چند گاندھی واد اور اشتراکیت دونوں سے متاثر رہے لیکن بعد میں پریم چند گاندھی واد سے منحرف ہوگیے تھے۔ اس کی تحقیق کر کے مانک ٹالا نے اس کی وضاحت اپنے پیش لفظ میں یوں پیش کی ہے کہ ساری حقیقت منکشف ہوگئی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''پریم چند ایک روشن ضمیر انسان تھے انسان اور انسانیت کی ترقی و خوشحالی ان کا مطمحِ نظر تھا۔ اس کے لئے انھوں نے گاندھی واد اور اشتراکیت دونوں نظریات کی صالح اقدار کو قبول کیا جن خیالات یا نظریات سے وہ متفق نہیں تھے انہیں رد بھی کرتے چلے گیے۔ لیکن ہمارے کچھ فاضل محققین اس بات پر مُصر ہیں کہ پریم چند اپنی زندگی کے آخری حصے میں گاندھی واد سے منحرف ہو کر مارکس واد ہی کو انسان اور انسانیت کا ملجا و ماوا سمجھنے لگ گیے تھے۔ میں نے پریم چند کی تحریروں سے یہ دکھایا ہے کہ اگر چہ انھوں نے دونوں نظریوں کی اچھی باتوں کو قبول کرنے میں کسی تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا تاہم جس نظریے یا اس کے کسی حصے سے انھیں ذرا سا اختلاف ہوا وہ اس سے قطعی متاثر نہیں

ہوئے۔''۱۲؎

مانک ٹالا کے اس اقتباس سے پریم چند کے تعلق سے ساری باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں اور اسی طرح مانک ٹالا نے پریم چند کی ایسی تحریروں کو''زمانہ'' کانپور اور دیگر رسائل و جرائد سے تلاش کر کے نکالا اور پھر ان تحریروں کو اپنی کتابوں میں شائع کیا جن میں پریم چند کی مسلم نوازی اور اردو پرستی کا بہتر طریقے سے ذکر ملتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے حوالے سے پریم چند کی ایک تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اسلام کی بنیاد انصاف پر رکھی گئی ہے۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں، کسی کی طرفداری نہیں۔ ایسی سینکڑوں روایتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جب بیکسوں نے بڑے بڑے طاقتور عہدیداران کے مقابلے میں انصاف کے بل پر فتح پائی ہے۔ ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں جہاں بادشاہوں نے اپنے شاہزادوں، اپنی بیگمات یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو انصاف کے آگے قربان کردیا''۱۳؎

منشی پریم چند نے جس طرح اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے دل میں کوئی غلط فہمی نہیں رکھتے تھے اسی طرح سے انھوں نے اردو کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ پرچار سبھا کا چوتھا اجلاس جنوبی ہند میں 29 نومبر 1934 کو مدراس میں منعقد ہوا تھا اس اجلاس میں پریم چند کی تقریر کو مانک ٹالا نے قلمبند کیا ہے۔ اور اس کے ذریعے پریم چند پر الزامات لگانے والے لوگوں کو ایک تھپڑ مارا ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے:

''نہ میں نے ہندی ادب پڑھا ہے اور نہ اس کا اتہاس نہ اس کی رفتارِ ترقی کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ میری ساری زندگی اردو کی خدمت کرتے گزری ہے اور آج بھی میں جتنی اردو لکھتا ہوں اتنی ہندی نہیں لکھتا اور کائستھ ہونے اور بچپن سے فارسی کی مشق کرنے کے باعث اردو میرے لئے جتنی فطری ہے اتنی ہندی نہیں''۱۴؎

مانک ٹالا اپنے تحقیقی نظریے کے ذریعے اردو دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں اور پریم چند

پر گرانقدر تصنیفات پیش کر کے پریم چندیات میں قابلِ قدر اضافہ بھی کر چکے ہیں۔ پریم چند پر فاضل مصنف کی جن تحقیقات کے ذریعے پوری اردو دنیا میں پذیرائی ہوئی ہے ان میں ''پریم چند حیات نو'' پریم چند کی سوانحی تحقیق میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

پریم چند کا سیکولر کردار اور 'پریم چند اور تحریکِ آزادی' یہ دو ایسے تحقیقی مقالے ہیں جن میں مانک ٹالا نے بڑی گہرائی اور تہہ داری کے ساتھ پریم چند کے خالص سیکولر کردار اور تحریک آزادی میں مثبت رول کا خلاصہ کیا ہے۔ پریم چند پر مانک ٹالا کی کتاب پریم چند اور تصانیف پریم چند کچھ نئے تحقیقی گوشے بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہے اگر اس کتاب کو مانک ٹالا پریم چند پر ایک تاریخی کتاب کا نام دیتے تو کوئی ہرج نہیں تھا اس لیے کہ مانک ٹالا نے اپنی کتاب میں پریم چند کی زندگی کے ساتھ ان کی تقریباً سبھی کتابوں افسانوں اور ناولوں کا جائزہ تاریخی حوالے سے لیا ہے۔ جس کے ذریعے مانک ٹالا کی اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے کتابوں کے علاوہ مانک ٹالا نے پریم چند کے ان تاریخی حوالوں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں جہاں پریم چند اپنی ملازمت کے دوران مقیم رہے۔ اور یہی نہیں پریم چند کے ناولوں کے صفحات تک کے حوالے بھی دیے ہیں جن کے ذریعے مانک ٹالا کی تاریخی گرفت پر بھی ایک تفصیلی گفتگو بھی کی جا سکتی ہے۔

مانک ٹالا اپنے تحقیقی اور تاریخی کارنامے کی وجہ سے ایک نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے تحقیقی نظریے کی روشنی میں سوزِ وطن کے تعلق سے وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریم چند اپنی سب سے پہلی کہانی ''دنیا کا انمول رتن'' بتاتے ہیں اور اس کی اشاعت 1907ء بتاتے ہیں لیکن اس نام کی کوئی کہانی کسی بھی رسالے اخبار وغیرہ میں شائع نہیں ہوئی۔ اور نہ اس کے کوئی شواہد موجود ہیں۔ مانک ٹالا اپنی تحقیق کے ذریعے پریم چند کی سب سے پہلی کہانی ''عشقِ دنیا اور حُبِ وطن'' کو بتاتے ہیں۔ اور یہ کہانی 1908ء کے ''زمانہ'' میں شائع ہوئی نہ کہ 1907ء میں۔ کہتے ہیں کہ پریم چند کی کوئی بھی کہانی 1908ء سے پہلے کہیں سے شائع ہوئی ہی نہیں اسی طرح ''جیون سار'' میں پریم چند کا سوزِ وطن شائع ہونے کا جو سنہ 1909ء لکھتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہے لیکن چتر ویدی کے نام اپنے خط میں اس کی اشاعت کا سنہ 1907ء بتاتے ہیں۔ حقیقت کو مانک ٹالا نے یوں بیان کیا ہے کہ ''زمانہ'' کے اپریل 1908ء کے شمارے میں ان کی پہلی

کہانی عشقِ دنیا اور حب وطن کی اشاعت کے دو تین ماہ کے اندر اندر ان کی پانچ کہانیوں کا مجموعہ (جس میں مندرجہ بالا کہانی بھی شامل ہے) جون یا جولائی 1908ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا اسلئے کہ جولائی 1908ء کے ''زمانہ'' کے شمارے میں اس کے چھپنے کی اطلاع درج ہے۔اس عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پریم چند خود اپنے حوالوں میں نسیان کا شکار ہو گیے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ حالات کے وجہ سے ذہن تھوڑا Disterb رہا ہو۔لیکن مانک ٹالا نے اس کی پوری تفصیل اپنی تحقیقی کاوش کے ذریعے بیان کردی ہے اسی طرح انھوں نے مشہور پریم چند شناس قمر رئیس اور جعفر رضا جیسے اہم نقادوں کے تاریخی حوالوں کو بھی اپنے تحقیقی نظریے پر غلط ثابت کیا ہے۔

مانک ٹالا کی کتابوں اور مضامین پر بہت سے ادبا نے اپنی آراء پیش کی ہیں ان میں ایک نام ارتضیٰ کریم کا بھی ہے انھوں نے بھی مانک ٹالا کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس سے نتائج اخذ کیے ہیں کہتے ہیں کہ اردو میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جن کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اب اس پر بہت کام ہو گیا اور اب مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے غالبؔ، اقبالؔ، میرؔ، پریم چند وغیرہ جن پر بے شمار کتابیں اور مضامین تحریر کیے جا چکے ہیں۔لیکن بعض اہلِ قلم اور اہلِ فکر ایسے ہیں جنھوں نے تحقیق کر کے نئے نئے گوشوں پر بہت زیادہ کام کیا ہے اور اس طرح کام کرنے والوں میں مانک ٹالا بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔''پریم چند کچھ نئے مباحث'' مانک ٹالا کی تازہ ترین تصنیف ہے جو ان کی دراصل اکیس مضامین اور پریم چند کی پانچ گم شدہ اور کمیاب تحریروں پر مشتمل ہے۔ مانک ٹالا نے بڑی عرق ریزی اور دقت طلبی کے ذریعے تمام مواد کو یکجا کر کے ان پر مثبت اور مدلل گفتگو کی ہے۔لیکن تحقیق اور تنقید ایسی چیزیں ہیں جن میں اختلافات کی راہیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں اور تحقیق کے کاموں میں اپنی رائے پیش کی جاسکتی ہے۔اسی طرح ارتضیٰ کریم نے مانک ٹالا کے خیال کو اپنے لفظوں میں یوں پیش کیا ہے۔اقتباس

> ''مثلاً ''کفن'' اور پوس کی رات کا تجزیاتی مطالعہ'' مضمون میں انھوں
> نے کفن کو پریم چند کی کمزور کہانی کہا ہے اور ''پوس کی رات'' کو زیادہ
> کامیاب جواز ہے کرداروں کی ایک مخصوص حالت میں ''ذہنیت یا ذہنی

ساخت''، جس کے تحت گھیسو اور مادھو نہایت سطحی انسان ہیں اور ہلکو عزتِ نفس کا حامل غریب انسان۔ ان کے خیال سے پریم چند کو اتنے گھٹیا کردار پیش کرتے ہوئے غور کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ ''یہ کردار مثبت نہیں ہیں''۔ مانک ٹالا صاحب کے پیش کردہ صرف اس نکتہ پر کفن اور پوس کی رات کی کمتری اور برتری کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس بھری پُری دنیا میں بہت سارے گھیسو اور مادھو حیوانوں کی سطح پر جی رہے ہیں۔ پریم چند نے تو سچی سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے گھیسو اور مادھو کو پیش کیا ہے۔''۱۵؎

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مانک ٹالا نے پریم چند کے افسانہ کفن کو کمزور افسانہ بتایا ہے اور گھیسو مادھو کو نہایت گھٹیا قسم کا کردار بتایا ہے یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پریم چند بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ اور حالات کے تحت کرداروں کا استعمال کرتے ہیں۔ چاہے وہ افسانہ کے کردار ہوں یا ناول کے حالانکہ پریم چند نے بہت سے کرداروں کو استعمال کر کے اپنے ناول اور افسانہ کو شان بخشی ہے لیکن یہاں گھیسو اور مادھو کردار گھٹیا نہیں ہیں بلکہ پریم چند نے ان کے ذریعے سماج اور معاشرے کی ترجمانی اور سرمایہ داروں کے ظلم وستم کے شکار ہونے والے معاشرے کی عکاسی کی ہے تاکہ اس دور کے حالات اور غریبوں کے ساتھ سرمایہ داروں کے استحصال کا پتہ چل سکے۔ اپنے اسی مضمون میں ارتضیٰ کریم نے پریم چند کے تعلق سے کچھ تنقیدی اور تحقیقی امور کا ذکر کیا ہے جو پریم چند کی ایک شناخت ہیں اور جن کے ذریعے پریم چند کی انسان دوستی اور دیگر مذاہب سے بہتر تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اقتباس

''پریم چند اور تشدد، یہ اندازِ تحقیق کیا ہے؟ پریم چند کا ایک اہم اداریہ، قرآن میں فرقہ وارانہ اتحاد کے عناصر'' پریم چند کی ہندی کہانی نبی کا نیتی نرواہ قومی یکجہتی اور پریم چند اسلام کا وش ورکش کے پس منظر میں پریم چند اور آریہ سماج ''پریم چند کا آریہ سماجی شعور''، ''پریم چند اور ان کی

سوتیلی ماں''،''تومشق ناز کر''،''پریم چند کی کہانی''دو بھائی، پریم چند کی
ایک کہانی شدھی''پنچایت''، آہ بے کس اور بوڑھی کا کی ایک تقابلی
مطالعہ''، پریم چند کے ادب اور زندگی میں مہاجنی کردار کی جھلکیاں
پریم چند نگم اور زمانہ'وغیرہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں''۱۶

پریم چند کا نظریہ بالکل سماجی اور عوامی تھا مانک ٹالا نے پریم چند کے تعلق سے ساری باتیں بالکل وضاحت سے بیان کردی ہیں جس طرح کہ پریم چند کے بارے میں کافی غلط باتیں راہ پا گئی تھیں مانک ٹالا نے اپنی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی کاوشوں کے ذریعے ان سب غلطیوں کی اصلاح کی۔جن کی وجہ سے مانک ٹالا اردو ادب کی دنیا میں ہمیشہ روشن رہیں گےاور ان کا نام پریم چند کے ساتھ ہمیشہ لیا جائے گا۔

مدن گوپال:

مدن گوپال پریم چند شناسوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے ابتدائی زمانے میں سب سے پہلے اپنے قلم کے ذریعے پریم چند کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور سارے پیچ وخم کی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے اردو دنیا کے علاوہ انگریزی جہاں میں بھی پریم چند کی اہمیت واضح کی ہے۔اور سب سے پہلے انگریزی اخباروں کے ذریعہ تقریباً سو صفحے کا کتابچہ تیار کر کے 1944ء میں شائع کرایا جو بعد میں پریم چند کی آپ بیتی کے نام سے شائع ہوا۔ان کی ایک کتاب ''قلم کا مزدور'' ہے ان کا سب سے اہم اور محنت طلب کام کلیاتِ پریم چند ہے۔جسے NCPUL نے 24 جلدوں میں شائع کیا۔اس میں پریم چند کی بعض مختلف گمشدہ چیزیں ادب کے حوالے سے شامل کی ہیں۔اس کے علاوہ انگریزی میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی اور اس میں مدن گوپال نے پریم چند کے مشہور کہانیوں اور ناولوں کا خلاصہ بھی پیش کیا تاکہ انگریزی داں طبقہ پریم چند کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچان سکیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی ملکوں میں مدن گوپال کے تجزیے کو بے حد پسند کیا گیا پریم چند کی زندگی کے رموز واسرار اور دیگر سبھی پہلوؤں پر گوپال جی نے روشنی ڈالی جو ان کا ایک بہت ہی جامع کارنامہ ہے۔

مدن گوپال کے اندر تنقیدی صلاحیتیں تو موجود تھیں ہی لیکن ان کی تحقیقی کاوشوں نے ان کی تحریروں کو

زندہ کردیا ہے۔اوراسی تحقیق میں ایک لمبا وقت پریم چند کے خطوط، ناولیں، افسانے، اورڈرامے وغیرہ جمع کرنے میں صرف کردیا تب جاکر پریم چند کی حیات کو درخشاں کرنے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ حالانکہ بہت سے ادیبوں اور محققوں نے پریم چند پر تبصرے اور مضامین کے ساتھ تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے اور سبھی نے بہتر سے بہتر اور صداقت کے ساتھ گفتگو کی ہے لیکن سبھی ادیبوں کے آگے مدن گوپال کو فوقیت حاصل ہے اسلئے کہ انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ پریم چند کی تحریروں کو جانچا اور پرکھا ہے اور ایک ایک تاریخ کو صحیح اور درست کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں پریم چند کی زندگی کی سچائیوں اور صداقتوں سے محروم نہ رہیں اسلئے کہ پریم چند ایک ایسے ادیب تھے جن کو عرصہ دراز ہوا اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے لیکن آج بھی پریم چند کے نئے نئے گوشوں پر اور نئے نئے پہلوؤں پر کوئی نہ کوئی تبصرہ ہوتا رہتا ہے۔جس کے ذریعے پریم چند کی شخصیت کو ایک نئی روشنی ملتی رہی ہے۔اور فرسودہ بیانات تاریکیوں میں تبدیل ہوکر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ مدن گوپال نے تو پوری طرح سے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کیا ہے اور ان میں انھوں نے سب سے زیادہ محنت پریم چند کے خطوط کو جمع کرنے میں کی ہے۔ مدن گوپال نے جہاں جہاں سے اطلاعات فراہم کیں۔اس کی تفصیل وہ خود بیان کرتے ہیں:

> ’’بمبئی، کانپور، لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، بستی، مدراس، حیدرآباد اور لاہور وغیرہ کی سیاحت کی۔ بہت سے خطوط یا ان کی نقلیں ان کے دوستوں سے حاصل کیں۔’’ہنس‘‘ اور’’زمانہ‘‘ کے شماروں اور شیورانی دیوی جی کی کتاب’’پریم چند گھر میں‘‘ سے اطلاعات فراہم کیں‘‘ ۷؎

یہ خطوط جمع کرنا تو ایک نہایت محنت طلب کام ہے مدن گوپال نے اس کو بخوشی قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں پر تحقیقی نظر ڈال کر بھی اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مدن گوپال کی کتاب ’’قلم کا مزدور‘‘ پریم چند کی پوری زندگی کو محیط ہے اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے اپنے حاصل کردہ ذخیرے سے بہت استفادہ کیا ہے اور اپنے رسائل و جرائد سے بھی کام لیا ہے اور اس کے ساتھ پریم چند پر جو تنقیدی مضامین شائع ہوئے ان سب کا مدن گوپال تجزیہ کرکے اس پر اپنی تحقیقی نظر ڈال کر جانچتے اور پرکھتے ہیں جو باتیں ان

کو صحیح معلوم ہوتی ہیں اور جن میں صداقت ہوتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور جو تحقیقی پیمانے پر صحیح نہیں اتر تیں ان کی تردید بھی کرتے ہیں اور ایک سچے اور نامور محقق کیلئے ضروری ہے کہ ہر جگہ اور ہر تحریر میں اس کی شخصیت کے متعلق غور وخوص کر کے اپنی رائے کا اظہار کرے اسلئے کہ تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے اور اس میں سبھی محققین کے لئے ضروری ہے کہ جانچ پرکھ کر صدق دلی سے کام لینے کی کوشش کریں جو کہ تحقیق کا حق اور اس کے اصول میں شامل ہے۔ اسی طرح مدن گوپال نے ہر تحریر اور واقعے کی ترتیب اور تاریخ کے ساتھ چھان بین کی اور اس کو صحیح طریقے سے ترتیب دینے کی کوشش کی جو کہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے اس طرح کی تاریخی ترتیب میں مدن گوپال نے برسوں محنت کی تب جا کے کہیں ایسے بیش قیمتی سرمائے منظر عام پر آئے ہیں سب سے زیادہ مشکل اس وقت درپیش ہوتی ہے جب خطوط یا مضامین یا واقعات یا کہانی وغیرہ پر تاریخ نہیں پڑی ہوتی ہے۔ مدن گوپال کہتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے بعض خطوط اور تحریروں میں تاریخوں کی تفصیل صحیح نہیں پیش کی ہے۔ کسی میں کچھ ہے تو کسی میں کچھ اور بہت سے خطوط تو ایسے تھے جن پر تاریخ ہی نہیں تھی اس کی ترتیب تو بہت مشکل تھی لیکن مدن گوپال نے اپنی محنت اور سعی کے ذریعے ساری چیزوں کی تفصیل صحیح پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے جو ہر کسی کے بس کا نہیں۔ مذکورہ وسائل سے مدن گوپال نے خطوط حاصل کیے یا اس کا عکس لیکر خطوط کی ترتیب دی اور اس کے علاوہ مدن گوپال کہتے ہیں کہ کچھ خطوط دیا نرائن نگم کے پاس تھے جن کو میں حاصل نہیں کر پایا اور ان کا انتقال ہو گیا انتقال سے پہلے حالانکہ دیا نرائن نگم نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انتقال کے بعد مدن گوپال نے نگم کے صاحبزادے سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ مدن گوپال کہتے ہیں کہ 42-1941ء میں امتیاز علی تاج نے 44 خطوط کی نقل حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ان کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک نے 4 خطوط اور دلی میں جتیندر نے 42 خطوط کی فائل دی۔ کیشو رام سبھر وال بنارسی داس چترویدی کے علاوہ شیورانی دیوی، ونود شنکر ویاس، رام چندر ٹنڈن، اندر ناتھ مدان، آنند رائے جوش اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جن کے ذریعے ملے ہوئے خطوط سے مدن گوپال نے استفادہ کیا ہے۔

مدن گوپال نے قلم کے مزدور میں خطوط کا ذکر بہت اعتماد سے کیا ہے اور ان کے حصول میں جن جن

حضرات سے ملے ان کا ذکر بھی نمایاں کیا ہے۔خطوط کے علاوہ مدن گوپال نے پریم چند کے بچپن سے لیکر نزع کے وقت تک کے سبھی حالات بیان کیے ہیں۔بچپن کے وہی پورے حالات بیان کیے ہیں جو تقریباً ہر مصنف نے بیان کیے ہیں۔وہی اسکولی ماحول اور شرارت وہی بری خصلتیں جو عام بچوں میں ہوتی ہیں۔گلی ڈنڈا،کھیل کود میں دن بھر منہمک رہنا یہ سبھی خصوصیت بچپن میں سبھی بچوں میں ہوتی ہیں اور ان ساری خوبیوں کے مالک پریم چند بھی تھے کچھ دنوں کے بعد ماں کا انتقال پھر باپ کا دوسری شادی کرنا اور کچھ دنوں کے بعد پریم چند کی شادی ہونا شادی کے بعد بیوی کا پریم چند کو چھوڑ کر چلی جانا اور پھر پریم چند کا دوسری شادی کرنا یہ بنیادی باتیں ہر کسی نے بیان کی ہے گویا ہر ادیب نے پریم چند کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ان میں مدن گوپال بھی ہیں لیکن ان کی باتیں بہت مدلل اس لئے ہیں کہ یہ بہت قریبی آدمی تھے۔اور انھوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت سوچ سمجھ کر کہی ہیں کہ کہیں لچک نہ پیدا ہو جائے۔اب آگے چل کر مدن گوپال نے پریم چند کی ادبی زندگی کے احوال بیان کیے ہیں جب پریم چند نے قلم کو حرکت دینی شروع کی انھوں نے خود پریم چند کا ایک اقتباس تحریر کیا ہے جس میں پریم چند کہتے ہیں:

''میری ادبی زندگی کی شروعات 1900ء میں ہوئی۔اردو ہفتہ وار اخبارات میں لکھنا شروع کیا تھا۔اس وقت ماہوار شائع نہ ہوا کرتے تھے۔مضمون نویسی کا مجھے شوق تھا۔میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ میں مصنف بنوں گا۔میں سرکاری ملازم تھا اور فرصت کے وقت کچھ نہ کچھ لکھ لیتا تھا۔ناول پڑھنے کا مجھے ایسا خبط تھا کہ طبیعت نہ بھرتی تھی۔بغیر سوچے سمجھے اور انتخاب کے جو بھی ناول ہاتھ لگ جاتا اسے پڑھ ڈالتا۔میرا پہلا مضمون 1901ء میں شائع ہوا اور پہلی کتاب 1903ء میں۔اپنے ذوق کی سیری کے علاوہ مضمون نویسی سے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔شروع میں میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔پھر ماضی اور حال کی سرکردہ ہستیوں کے خاکے لکھنے لگا''[۱۸]

پریم چند کی زبانی ان کے ادبی زندگی کی شروعات 1900ء میں ہوگئی تھی اور ان کا پہلا ناول 1900ء میں لکھا گیا ''اسرار معابد'' جو کہ ان کا پہلا ناول ہے۔ یہ آوازِ خلق میں قسط وار شائع ہوا۔ پریم چند نے اپنے اس ناول کے بعد قلم کو راحت نہیں دی اور مسلسل قلم کو رفتار عطا کرتے رہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے بہت سے ناولوں، کہانیوں اور افسانوں نے تحریری شکل اختیار کی ان کے ابتدائی ناولوں اور افسانوں میں اصلاحی عناصر زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ملک کے سماجی مسائل اور انگریزی حکومت کی سختی اور بے بس لوگوں پر ظلم وستم کو اپنی ناولوں اور افسانوں میں پیش کیا اور جو بھی حالات آتے گیے پریم چند اپنے سماج کے کرداروں کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں پروتے گیے۔

دوسری بات تاریخی اعتبار سے مدن گوپال نے یوں پیش کی ہے کہ پریم چند نے ناولوں کو ابتدائی تصنیف بتایا ہے لیکن اپنی کہانیوں کے تعلق سے کہتے ہیں کہ میں نے کہانیاں 1907ء میں لکھنا شروع کیں۔ مدن گوپال کہتے ہیں پریم چند کی پہلی کہانی کا نام ہے ''انمول رتن'' جس کے بارے میں خود پریم چند نے اعتراف کیا ہے۔ مدن گوپال نے پریم چند کے حوالے سے لکھا کہ پریم چند کی پہلی تصنیف تھی ''ایک ماموں کا رومان'' اور یہ تصنیف پریم چند نے اپنے ایک رشتہ کے ماموں کے حالات سے متاثر ہوکر لکھا۔ اسلئے کہ ان کے ماموں کو ذات کی چمارن سے عشق ہوگیا تھا لیکن صرف ایک طرفہ عشق ہوا تھا وہ چمارن عورت ان کو نہیں چاہتی تھی لیکن یہ ان پر جان چھڑک رہے تھے اسی طرح اس کے چکر میں ایک دن ماموں کی خوب پٹائی ہوئی۔ اس کا ذکر پریم چند نے بہت بہتر طریقے سے اپنی اس پہلی کہانی میں لطف لے لے کر کیا ہے۔ مدن گوپال نے اپنی کتاب ''قلم کا مزدور'' میں پہلی تصنیف جو ماموں کا رومان بتایا ہے تو یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ کہانی ہے یا افسانہ یا ناول، یا کوئی واقعہ۔ اس کی وضاحت پریم چند نے کی ہے کہ وہ ڈرامائی شکل میں اس قصے کو پیش کیا۔ پہلی تصنیف کے بارے میں پریم چند خود رقم طراز ہیں

> ''اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال کی رہی ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا شوق تھا مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی والے اس وقت کے ہر دلعزیز

ناول نگار تھے ان کی کتابیں جہاں کہیں مل جاتی تھیں اسکول کی یاد بھول جاتی تھی اور کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانہ میں رینالڈ کے ناولوں کی بھی دھوم تھی اردو میں ان کے ترجمے دھڑ ادھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے میں بھی ان کا عاشق تھا'' 19

مدن گوپال نے اگر پہلی تصنیف کا ذکر کیا تو اس کا سن بھی بیان کرنا چاہئے اور اگر تصنیفی زندگی کی بات کرتے ہیں تو ان کو پہلی تصنیف ''ایک ماموں کا رومان بھی دکھانا چاہئے اس لیے کہ جب انسان ایک بار قلم اٹھالیتا ہے اور کچھ تحریریں یا مضامین لکھتا ہے تو وہ سب ادبی چیزیں شمار کی جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پریم چند نے خود کہا ہے کہ میں نے 1900ء میں شروعات کی لیکن یہاں بھول بھی ہوسکتی ہے جس طرح خطوط کی تاریخوں وغیرہ میں تقدیم وتاخیر سے تاریخ بیان کی ہے۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ پریم چند اپنی پہلی تصنیف کو ذکر کرنے میں بھول گیے ہوں یا پھر اس کا سراغ نہ لگا ہو جس طرح پریم چند نے کہا کہ میں نے ماموں کی کہانی لکھ کر ان کے سرہانے رکھ دی اور میں اسکول چلا گیا جب واپس آیا تو اس کو نہیں پایا ہوسکتا ہے ماموں نے اسکو پھاڑ کر پھینک دیا ہو۔ یا ہوسکتا ہے وہ ابتدائی واقعہ تھا اسلئے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہی اختلاف مدن گوپال نے اپنی کتاب ''پریم چند شناس'' میں کیا ہے۔ اور اس کتاب میں مدن گوپال نے پریم چند کی ناولوں کا تذکرہ بھی اپنے تحقیقی نظریے کے ساتھ کیا ہے۔ اسلئے کہ پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں تقدیم وتاخیر کی بحث بنی ہوئی ہے پریم چند کا پہلا ناول تو اسرار معابد ہے۔ لیکن ان کا دوسرا ناول ''کشنا'' ہے یا ''ہم خرما وہم ثواب'' ہے یہ دونوں موضوع بحث ہیں۔ مدن گوپال کہتے ہیں کہ ''ہم خرما وہم ثواب'' کے دوتین ایڈیشن شائع ہوئے مگر کسی پر اس کی اشاعت کی تاریخ نہیں تھی اس لئے ان کا صحیح پتا نہیں ہے کہ دوسری کون اور تیسری کون ہے۔ لیکن مدن گوپال اپنے تحقیقی نقطۂ نظر سے کہتے ہیں کہ ''کشنا'' دوسرا اور ''ہم خرما وہم ثواب'' تیسرا ناول ہے۔ یہ بات اس لئے مدلل ہے کہ ''ہم خرما وہم ثواب'' کے ٹائٹل کور پر مصنف کے نام کے ساتھ لکھا تھا کہ ''منشی نواب رائے صاحب'' مصنف ''کشنا'' وغیرہ

مدن گوپال کا کہنا ہے کہ وغیرہ کا اشارہ اسرارِ معابد کی طرف ہوسکتا ہے بہر حال کشنا پہلے شائع ہو چکا

تھا۔حالانکہ مدن گوپال کے اس بیان میں بھی شبہ پایا جارہا ہے اورانھوں نے پورے اطمینان کے ساتھ اس کی تصدیق نہیں کی ہے۔لیکن اتنا بھی کیا کم ہے کہ اس کی وضاحت کیلئے کئی شمارے اوراشتہار کا سہارالیا ہے۔اور ساتھ ساتھ ان کے ریویو کا بھی جائزہ لیا ہے جو نومبر 1907ء اور دسمبر 1907ء میں شائع ہوتے تھے۔ مدن گوپال نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا جائزہ اپنی کتاب ''پریم چند شناس'' میں الگ الگ مضامین کے ذریعے لیا ہے۔ اگر ناول کی بات کرتے ہیں تو ناول کے مضامین میں پریم چند کے ناول کا احاطہ کر کے ان کے نشیب وفراز اور حالات وکردار کا مکمل جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پریم چند اپنے ناول بازارِحسن کے تعلق سے ایک دلچسپ بات پیش کی ہے کہ وہ اپنے دوست ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیانرائن نگم کو 24 جنوری 1917ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''میں آج کل ایک قصہ لکھتے لکھتے ناول لکھ چلا۔ یہ کوئی سو صفحے تک پہونچ چکا ہے۔اب اس ناول میں ایسا جی لگ گیا ہے کہ دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔''

آگے لکھا کہ:

''قصہ دلچسپ ہے اور مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ اب کی بار ناول نویسی میں بھی کامیاب ہوسکوں گا۔''[۲۰]

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند افسانے کے فن میں کامیابی حاصل کر چکے تھے اور اس کے بھی کردار و پلاٹ سے بخوبی واقف ہو چکے تھے لیکن ناول میں کچھ کمی نظر آرہی تھی۔لیکن ایک بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ پریم چند نے 1900ء سے ناول لکھنا شروع بھی کر دیا تھا اور ''بازارِحسن'' ان کا بہترین ناول ہے اور اتنے ناول لکھنے کے بعد بھی اس میں پلاٹ وکردار، مکالمہ وغیرہ پر مکمل گرفت نہیں تھی۔ ایسا کیوں؟ یہاں اس کے متعلق ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔

مدن گوپال نے ناول کے اس مضمون میں ناولوں کی اشاعت سے ہی سروکار رکھا ہے اور ان حضرات کا ذکر بھی کیا ہے جن کے ذریعے ناول کی ترتیب وتدوین اور تحقیق میں مدد ملی اور ان پریسوں کا بھی ذکر کیا ہے

جہاں جہاں سے پریم چند کے مضامین شائع ہوتے رہے ان کے ذریعے قاری کی پوری توجہ پریم چند پر مرکوز ہوجاتی ہے کہ پریم چند کے بہت سے ناولوں کے تراجم نے قاری کو بہت متاثر کیا ہے اور مدن گوپال نے تراجم کے تذکرے بھی کیے ہیں اسلئے کہ اس سے پتہ چل سکے کہ کونسی کتاب ہندی میں تھی اور کون اردو میں اور یہ ضروری بھی تھا۔

مدن گوپال نے ناول کے بعد دوسرے مضامین ''افسانہ نگار پریم چند'' کے ذریعے پریم چند کی افسانہ نگاری کے اصولوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ مدن گوپال نے ایک کام اور بہتر کیا ہے انھوں نے دوحصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کون سا افسانہ کب ہندی اور اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعے میں شامل ہے مدن گوپال کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مدن گوپال پریم چند کے ابتدائی دور کے حالات افسانوں میں بھی بیان کرتے ہیں اور جب پریم چند نے افسانہ نگاری شروع کی اور جس چیز کو افسانہ میں سمونا اور شامل کرنا شروع کیا اس کو بہتر انداز میں مدن گوپال نے بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ سیاسی تحریکات کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے ان سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کے ذریعے پریم چند کی ایک مسلمہ اہمیت ہے۔ مدن گوپال نے ابتدائی افسانوں میں سماجی اصلاح کا پہلو دکھایا اور دھیرے دھیرے جیسے حالات آتے گیے پریم چند اسی طرح اپنے قلم کو بھی حرکت دیتے رہے۔ ایک وقت تھا جب لکھنے والوں کی نگاہیں صرف شہروں پر مرکوز تھیں اور صرف شہروں کی چمک دمک سے ادیبوں کی آنکھیں چکا چوند تھیں ایسے حالات میں پریم چند نے دیہات میں آنکھیں کھول کر دیہات کی ایسی منظرکشی کی جس نے بڑے بڑے شہری ادیب کو حیرت میں ڈال دیا۔ خاص کر پسماندہ طبقے نے پریم چند کو بہت متاثر کیا کہ اس وقت ذات پات اور چھوا چھوت بہت تھی اور ایک طبقہ اپنے کو بہت بڑا سمجھتا تھا اور غریب طبقے پر ہمیشہ ظلم وستم ڈھاتا تھا اس چھوا چھوت کو پریم چند ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ مساوات کے حامی رہتے۔ اور اس دیہاتی زندگی سے پریم چند کا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ انھوں نے گاؤں کو گاؤں کی طرح سے دیکھا اور دیہاتی عینک لگا کر دیکھا تبھی یہ چیزیں نظر آئیں جن کو ہمارے شہری ادیب نہیں دیکھ پائے۔

مدن گوپال منشی پریم چند کو اولین افسانہ نگاروں میں شمار کرتے ہیں۔ اور یہی بات صحیح بھی ہے۔ حالانکہ پریم چند سے پہلے بہت سے لوگوں نے قصے کہانیاں لکھیں ناولوں اور افسانوں پر بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کے یہاں پلاٹ کردار، مکالمہ میں وہ اصول نہیں برتے گیے ہیں جو پریم چند نے برتے ہیں اور خاص کر پریم چند سے پہلے ادیبوں نے اپنے قصے کہانیوں میں جن، دیو، پری، شہزادہ اور شہزادیوں کا ذکر بہت کیا ہے سارے قصے طلسمی واقعات پر مبنی رہتے تھے۔ لیکن پریم چند نے ان مافوق الفطرت کہانیوں کو خیر باد کہا اور اپنے ہی ماحول اور سماج کے کرداروں کو ناولوں اور افسانے میں شامل کیا یہاں تک کہ پریم چند نے اپنے گھر کے نجی کردار جیسے اپنے سوتیلی ماں کا کردار اور اپنے باپ کی دوسری شادی بھی پیش کی جن میں گرچہ کرداروں کی تبدیلی ہے لیکن ہیں وہ گھر کے ہی۔ اس طرح نئے نئے کرداروں میں نئی روح پریم چند پیدا کر کے سماج کی اصلاح کرتے ہیں اور لوگوں کو بیدار کرتے ہیں۔ مدن گوپال خود اپنی کتاب پریم چند شناس میں لکھتے ہیں۔

> ''منشی پریم چند کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان سے پہلے پریوں کے قصے اور طلسمی واقعات پر مبنی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ہریجنوں اور کسانوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی، بے جوڑ شادیاں، اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات جو سماج کو گھُن کی طرح سے کھائے جا رہے تھے، ان کا ذکر ادب میں اس لیئے نہیں ہوتا تھا کیونکہ ادیبوں کا کام سماجی اصلاح نہیں بلکہ ادبی تفریح اور ادب کو اعلیٰ معیاروں پر پیش کرنا تھا۔ سماجی واقعات کے بارے میں صرف اخبارات لکھتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف انسان کا دخل ممکن نہیں۔'' ۲۱

لیکن پریم چند ایک حساس دل لے کر پیدا ہوئے تھے جس میں ان کو ساری انسانیت کا درد محسوس ہوتا تھا وہ دوسروں کا درد بھی اپنا ہی درد محسوس کرتے تھے۔ اسلئے کہ سماج میں چھوٹے بڑے کئی طبقے تھے اور کچھ طبقے امیر سرمایہ دار اور طاقتور تھے اور یہ طبقے اپنی طاقت اور سرمایہ داری کی بدولت نچلے طبقے کے لوگوں کو غلام بنائے

ہوئے تھے ان سے محنت مزدوری کرواتے لیکن مزدوری نہیں دیتے سرمایہ دار غریبوں کا خون چوستا لیکن پیٹ بھر روٹی نہیں دیتا۔کسانوں مزدوروں،اور پچھڑے طبقوں جیسے دھوبی، کرمی، نائی، چمار وغیرہ کی پریشانیوں پر گہرائی سے پریم چند نے غور کیا اور انہیں بہت قریب سے جانچا پرکھا اور محسوس کیا کہ ایک طرف تو ان کی نیکی سچائی اور صداقت کی زندگی ہے اور دوسری طرف مہاجنوں اور مذہب کے ٹھیکیداروں، زمینداروں اہلکاروں اور سرکاری حکاموں کی زبردستی مکاری اور بے ایمانی ہے۔کسان کی زندگی بہت زیادہ محنت کش اور فاقہ کش ہے کسانوں اور مزدوروں کے یہاں ہمیشہ جدوجہد ہی رہتی ہے ان سب چیزوں کو پریم چند نے اپنے دیہاتی منظر سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کر کے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور سماج کا سچا نقشہ نمایاں کیا ہے مدن گوپال کہتے ہیں کہ مصنف کا فرض ہے کہ غربت اور امیری کے درمیان فرق کو دور کیا جائے ادب کو زندگی اور اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے اور یہی کام پریم چند نے کیا ہے انھوں نے ہمارے معاشرے کی تصویر اپنے افسانوں میں جیتی جاگتی پیش کی ہے ان کے افسانوں میں ماؤں، بیٹیوں، بہنوں کے مسائل اور دشواریوں کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔خانہ داری کے مختلف پہلوؤں اور سیاسی بیداری کی تحریک میں ان کے کرداروں نے کندھے سے کندھا ملا کر شرکت کی ہے اور پریم چند گھر اور سماج کی کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے گھاس والی، مالکن، سبھاگی، سہاگ کی ساڑی، بڑے گھر کی بیٹی، آشیاں برباد، قاتل کی ماں، بستی، علاحدگی، سمریاترا، اجلاس، ان افسانوں میں کتنی ہی مثالیں ہیں جہاں عورتوں کو دشواریوں کا سامنا رہتا ہے ان سبھی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔پریم چند نے گاؤں اور دیہات کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور بڑی جزئیات نگاری سے کام لے کر ساری چیزوں کو ابھارا ہے اور مدن گوپال نے سبھی چیزوں کو حوالے کے ساتھ پیش کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

جعفر رضا:

منشی پریم چند اردو دنیا کا جس طرح ایک بڑا نام ہے اسی طرح ان پر بڑے کام بھی ہوئے ہیں شاید ہی کوئی ایسا نقاد یا ادیب ہو جس نے منشی پریم چند پر خامہ فرسائی نہ کی ہو۔اور یہی نہیں پریم چند کی عظمت اور شان وشوکت کی چمک سے صرف ہندوستانی اردو دنیا روشن نہیں ہوئی بلکہ بیرون ممالک میں بھی پریم چند کے

علمی آفتاب سے روشنی ہوئی اور ہر جگہ پریم چند کو ان کے اعتبار سے نوازا گیا ہے۔ اسی طرح ایک نام اردو ادب کی دنیا میں بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کا نام ہے، جعفر رضا۔ ''جعفر رضا نے اپنی ژرف نگاہی اور دور اندیشی کے ذریعے پریم چند پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب سے جعفر رضا نے ہوش سنبھالا تب سے پریم چند کے علاوہ کسی دوسرے ادیب پر قلم نہیں اٹھایا لیکن ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے سنِ بلوغت تک پہونچنے کے بعد سب سے پہلے قلم پریم چند پر ہی اٹھایا اور نہایت عمدگی سے پریم چند پر روشنی ڈالی۔ پریم چند پر ان کی کتابوں کے نام ہیں۔ (۱) پریم چند کہانی کا رہنما (۲) پریم چند فن اور تعمیر فن، تعمیر فن میں جعفر رضا نے اردو اور ہندی کے تعلق سے بہتر گفتگو کرنے کے ساتھ زبانوں پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اس لئے کہ پریم چند کے بہت سے افسانے اور ناول ایسے ہیں جن کے ترجے اردو اور کبھی ہندی میں شائع ہوتے رہے۔ ''پریم چند فن اور تعمیرِ فن'' میں بہت لمبی بحث اس سلسلے میں کی گئی ہے۔ اور یہی نہیں پریم چند کے پہلے ناول کے بارے میں بھی بہت سے لوگوں کی آراء موضوع بحث ہیں جن میں بڑے اختلافات سامنے آئے ہیں اور کسی نے اپنی الگ الگ رائے سے پریم چند کی اہمیت کو بڑھاوا دیا ہے۔ اپنی اس کتاب میں جعفر رضا نے منشی پریم چند کے ساری کہانیوں کا احاطہ تو کیا ہے اور ان کی تعداد بھی گنائی ہے۔ جن کے اندر اختلافات نے بھی جگہ بنائی ہے لیکن اس کے ساتھ ناولوں کو بہتر طریقے سے تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ان کا کمال ہے۔ پریم چند کی تحریروں کی خوشبو ان کے رگ و ریشے میں رچی بسی ہوئی ہے اس لئے اتنی بصیرت آموز باتیں کہنے کے لیے قلم کو جنبش دی ہے۔ اگر قمر رئیس اور جعفر رضا کا مقابلہ کیا جائے تو قمر رئیس کی اہمیت یہاں گھٹتی ہوئی نظر آتی ہے کیونکہ جعفر رضا نے ابتدائی دور سے پریم چند کو لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا جبکہ قمر رئیس نے پریم چند پر اپنا تحقیقی کام پی ایچ ڈی کے مقالے میں کیا تھا۔ لیکن قمر رئیس نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے اس تک دوسرے ادیبوں کی پہونچ اور رسائی کافی مشکل نظر آتی ہے۔ جعفر رضا کی یہ کتاب ''پریم چند فن اور تعمیر فن'' اردو ہندی کے ناولوں اور کہانیوں کے تقابلی مطالعے پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے ذریعے بھی بہت اہم گوشے نکل کر سامنے آتے ہیں۔ جیسے پریم چند کے پہلے ناول کے بارے میں عام خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ''اسرارِ معابد'' ان کا پہلا ناول ہے لیکن دوسرے ادیبوں اور نقادوں نے مختلف رائے دی ہیں۔ جیسے ایک ماہر نقاد اور

ادیب منشی جگیشورناتھ ورما بیتابؔ کے خیال میں ''ہندی کا پہلا ناول ''پریما'' ہے اور اردو میں ''پرتاپ چندر'' جودھنپت رائے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔اسی طرح محمد عمر خان نے بھی پرتاپ چندکو پریم چند کا پہلا ناول مانا ہے۔ پریم چند کے ایک رفیق کارمنشی پیارے لال شاکرؔ نے آخرالذکر بیان کی تائید کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''میرے کان پور آنے سے ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول ''ہم خرما وہم ثواب'' شائع ہوا۔۔۔۔انھیں خود بھی یہ ناول پسند تھا اس کے بعد انھوں نے اس کا ہندی ترجمہ کیا اوراس کا نام ''پریما'' رکھا''۲۲؎

اسی طرح پریم چند کے اولین ناول کے تعلق سے کچھ اور نام بھی لئے جاسکتے ہیں (۱) ہم خرما وہم ثواب'' پریم چند کے دور رفقاء کے مطابق سے ان کا پہلا ناول ہے۔(۲) ''کشنا جو نایاب ہے اس کے تعلق سے ان کی بیوی شیورانی دیوی کا قول ہے کہ یہ پریم چند کا پہلا ناول ہے۔(۳) اسرارِ محبت کو بھی دو مستند محققوں نے بھی پریم چند کا پہلا ناول کہا ہے۔اسی طرح جعفر رضا نے اپنے اس کتاب کے حوالے سے بڑی قیمتی باتیں کہی ہیں اور ناولوں کے وہ نام بھی گنوائے ہیں جن کو ہمارے کانوں نے شاید ابھی تک سنا نہیں ہے۔اس کتاب کے تقابلی مطالعے نے جعفر رضا کی اہمیت کو ہمالیہ کی چوٹی کی طرح اونچا کردیا ہے اور یہی نہیں جعفر رضا کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو کے بہت سے ادیبوں نے اس کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔اوراس کے اوپر اپنے خیالات کا اظہار تبصروں کے ذریعے سے بھی کرتے رہے ہیں ان میں متعدد نام ہیں جن کو شمار کرانا یہاں بہتر معلوم ہوتا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ جعفر رضا کی اس کتاب کی اہمیت اوراس کا مقام کیا ہے۔اس کتاب کو جن نامور ادیبوں نے سراہا ہے ان کے نام اس طرح ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر مسعود حسین خان، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مدن گوپال، امرت رائے شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر شمیم حنفی وغیرہ۔ان حضرات نے اپنے ذاتی معلومات کی بنیاد پر اپنی قیمتی مہر ثبت کردی ہے۔اس کے ذریعے جعفر رضا اوران کی ذہانت ومتانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کے ناولوں کے ساتھ سبھی گوشوں

پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔اور اردو اور ہندی کے لسانی پہلو پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے ان کے تصانیف بڑی اہمیت کی حامل ہوگئی ہیں اور پریم چند کی نگارشات کے تعلق سے بنیادی حقائق اور مسائل پر بھی جعفر رضا نے بہتر گفتگو کی ہے۔ مستزاد یہ ہے کہ پریم چند نے ذولسانی مصنف ہونے کا شرف بھی حاصل کرلیا ہے جو ان کی انفرادیت ہے۔ اگر پریم چند کی تحریری تصانیف کا تجزیہ کیا جائے تو پریم چند تیرہ سال کی عمر سے ڈرامے اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے نظر آتے ہیں آپ نے تیرہ سال کی عمر میں ایک سچے عشقیہ قصے کو ڈرامے کی شکل میں لکھا لیکن بدقسمتی سے وہ شائع نہ ہوسکا۔لیکن باقاعدہ طورر پریم چند نے خود لکھا ہے:

''1901ء سے لٹریری زندگی شروع ہوئی'' ۲۳

لیکن جعفر رضا کہتے ہیں کہ بہت تلاش وطلب کے باوجود 1901ء کی افسانوی تخلیق میسر نہ ہو پائی مگر 1903ء میں بنارس کے اردو اخبار ''آوازِ خلق'' کے شمارہ میں 24 ستمبر 1903 میں پریم چند کا پہلا اردو مضمون ''اولی ورکام دل'' ملتا ہے۔ اسی طرح جعفر رضا نے مختلف مضامین پر بحث کر کے پریم چند کی بہت سی تصانیف کا ذکر کیا ہے جو ہمارے لئے بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ جعفر رضا نے جو لسانی رشتہ پریم چند کے تعلق سے دکھایا ہے وہ بہت اہم ہیں۔ یہ تحریر بہت ہی قابل غور ہے جس کو جعفر رضا نے صرف اس لیے پیش کیا ہے تاکہ پریم چند کی ذولسانی اہمیت سبھی پر واضح ہو جائے۔ کہتے ہیں:

''پریم چند نے لسانی مسئلے کو سیاسی نظر سے دیکھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ مجوزہ حل مہاتما گاندھی یا دیگر قومی رہنماؤں کے لسانی حل سے مختلف نہیں تھا۔ انھوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے درمیان ایک تیسری زبان ''ہندوستانی'' کی حمایت کی تھی۔ اب وقت نے واضح کر دیا ہے کہ ''ہندوستانی'' کو قومی زبان کا منصب نہ مل سکتا تھا نہ ملا۔ وہ پہلے بھی بول چال کی سطح پر مروج ومقبول تھی اور آج بھی ہے لیکن ادب میں اس کا وجود منفی تھا۔ ہندی اور اردو جس طرح پہلے موجود تھیں، اسی طرح عصرِ حاضر میں بھی ترقی کی اعلا

جہتوں کی طرف گامزن ہیں۔''۲۴

جعفر رضا نے پریم چند پر لسانیات کے دروازے کھول کر پریم چند کی اہمیت میں چار چاند لگا دیا ہے ابھی تک ناچیز نے جن ادیبوں یا نقادوں کو پڑھا اور ان کی تحریریں دیکھیں تو صرف پریم چند کی انفرادیت، غریب، مزدور، کسان وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے لیکن لسانیات کے تعلق سے شاید جعفر رضا کے علاوہ اور کسی نے روشنی ڈالی ہو۔ اور یہ بھی نہیں کہ بس تھوڑی بہت گفتگو لسانیات پر جعفر رضا نے کی ہو بلکہ پورا ایک باب لسانیات پر قائم کیا ہے۔

پریم چند پر گفتگو کرتے ہوئے جعفر رضا پریم چند کے قصے کہانیوں اور ناول کو ادوار میں بانٹتے ہیں جس کے ذریعے ناولوں کی اہمیت حالات کے مطابق ڈھال کر پریم چند پیش کرتے ہیں اور زمانے کی ترجمانی بھی اس کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ابتدائی دور کے ناولوں میں اصلاحی اور مذہبی پہلو کو پیش کیا ہے اور پھر جب سامراجی حکومت کا ظلم شروع ہوتا ہے تو اس سے متاثر ہو کر اس وقت کے حالات و جذبات کی ترجمانی اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے کی ہے اس لئے کہ پریم چند کی ناولوں میں جو موڑ آیا ہے اس میں انگریزی حکومت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ انگریزی حاکموں کے ہاتھوں ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اس سے پریم چند دلبرداشتہ تھے لیکن کھلی زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اسلئے کہ یہ انگریزی حکومت میں سرکاری ملازمت میں تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کو پریم چند نہیں دیکھ پاتے تو ملازمت سے مستعفی ہو کر انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں شامل ہو گیے۔ اس سلسلے میں انہیں جیل بھی جانا پڑا۔

> جعفر رضا پریم چند کی زبان و بیان کے تعلق سے کہتے ہیں کہ پریم چند کے ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے زبان و بیان میں رتن ناتھ سرشار کا عکس نمایاں ہے۔ اور اس کو جعفر رضا پریم چند کے گذشتہ ناولوں پر ترجیح بھی دیتے ہیں اس لئے کہ اس میں حب الوطنی کا جذبہ بہتر طریقے سے نکھر کر سامنے آیا ہے۔ جعفر رضا کہتے ہیں ''ہم خرما و ہم ثواب، پر رتن

ناتھ سرشارؔ کے زبان و بیان کا عکس ہے جس میں فارسی و عربی کے الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کی چاشنی متوجہ کرتی ہے۔'' ۲۵ے

''ہم خرما و ہم ثواب'' کو جعفر رضا پسندیدگی کی نگاہ سے اس لیے دیکھتے ہیں کہ اس دور کے پریم چند کے اندر جذباتی ہیجان کے آثار ملتے ہیں اور پریم چند کے ذہنی ارتقا کی عمدہ مثالیں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ جعفر رضا نے اپنی دوسری کتاب ''پریم چند کہانی کا رہنما'' میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور ہر اعتبار سے پریم چند کی پوری زندگی کو اپنے قلم کے ذریعے محیط کر لیا ہے اور ہر طرح سے پریم چند پر روشنی ڈالتے چلے گیے ہیں۔ اور ان کی طرز تحریر پر عمدگی سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ جیسے مکالمہ نگاری، مکالمہ نگاری میں کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کیا نہیں انہوں نے سب پر اظہار خیال کیا ہے۔ مکالمہ نگاری، ماحول، اسلوب، بیانیہ اسلوب، سوانحی اسلوب یادداشتی اسلوب، مراسلاتی اسلوب، مخلوط اسلوب وغیرہ ان سبھی گوشوں پر تفصیلی تحریریں پیش کی ہیں جو شاید ان سے پہلے نظر نہیں آتیں۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں پریم چند کے فنی نظریے پر گفتگو کی گئی ہے جو کہ بہت کار آمد ہے۔ گرچہ قمر رئیس اور دیگر نقاد حضرات پریم چند کے بعض ناولوں کو فنی اعتبار سے بہت کمزور مانتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مصنف ہر جگہ اپنی تحریروں میں یہی کوشش کرتا ہے کہ ہر بات کو سلیقے سے ادا کرے لیکن اس کی ادائیگی میں کچھ غلطیاں آجاتی ہیں تو اس کی بنا پر ناول نگار کی ناول نگاری سے انکار کر دینا مناسب نہیں ہے۔ یہاں جعفر رضا پریم چند کے تخلیقی و فنی نظریات کے تعلق سے بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پریم چند کے تخلیقی و فنی نظریات ابہام و نارسائی کے شکار نہیں ہیں۔ ایک اقتباس جعفر رضا کا ملاحظہ فرمائیں:

''پریم چند کے تخلیقی و فنی نظریات ابہام و نارسائی کے شکار نہیں ہیں۔ ان کی تخلیقی و فنی بصیرت میں فکر و احساس تجربے اور مشاہدے کی جدت شامل ہے۔ ان کی فنی و ادبی تخلیقات کی زندگی ختم نہیں ہوسکی ہے۔ ان میں مضمر فنی حقائق اپنے دور کے تخلیقی عوامل کی تاریخ بن گیے ہیں۔ یہی

تصور و حقیقت تخلیقی عمل ہو کر کہانی کی عصری حسیت سے ہم آہنگی حاصل کرتے ہیں لیکن فنی نظریات کے مطالعے میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اگر فن پر اصول و نظریات کی پابندیاں حد سے تجاوز کرنے لگتی ہیں تو فن کے فطری ارتقا کے مجروح ہو جانے کے خطرات پیدا ہوتے ہیں۔''۲۶

مذکورہ بالا اقتباس کے ذریعے پتہ چلا کہ پریم چند کے یہاں فنی بصیرت کی کمی نہیں ہے لیکن تھوڑی بہت غلطیاں تو سب سے ہو جاتیہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب فن پر مقصدیت غالب ہو جاتی ہے اگر اس زاویہ سے دیکھا جائے تو پریم چند کے بعض ناولوں میں یہ کوتاہیاں در آتی ہیں کیونکہ جب وہ سماج و معاشرے میں عوام کے پسماندہ حالات اور غریبوں پر ظلم و ستم دیکھتے ہیں جذباتی طور اپنے ناولوں کے ذریعے حالات کی عکاسی کرنے میں اصول کی پابندی زیادہ نہیں کر پاتے ہیں جس کی وجہ سے فنی نقطہ کچھ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے پریم چند کے ناولوں میں کچھ اس طرح کی چیزیں ہیں لیکن پریم چند کی اہمیت ناول نگاری میں ہمیشہ صفِ اول پر قائم رہے گی۔

پریم چند کی ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ ادب کو سماج کا ترجمان سمجھتے تھے اور ایسے ہی ادب کے قائل تھے جس میں سماجی روح کی تڑپ اور کرب شامل ہو۔ اس ادب اور زبان کو پریم چند نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے جس میں عوام کی دلچسپی نہ ہو اور عوام تشنگی محسوس کرے۔ پریم چند کا مزاج بالکل سرسید کی طرح تھا کہ ادھر سے بات نکلے اور عوام فوراً سمجھ لے وہ ادب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا، جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں، کیونکہ اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔''۲۷

زبان کے حوالے سے جعفر رضا نے پریم چند پر بہترین رشنی ڈالی زبان کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور

زبان کی ضرورت کیا ہوتی ہے اس کو بھی نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پریم چند کی کہانیوں کے مطالعے میں فنی ثقافتی، تمدنی، سیاسی اور سماجی مسائل کے پہلو بہ پہلو زبان و بیان کی نوعیت اہم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے زبان کو انفرادی و ذاتی عمل و ردعمل کے اظہار سے زیادہ ملک کی قومی زندگی کی ترجمانی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ پریم چند زبان کو چند جمالیاتی تصورات کے ابلاغ تک محدود نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے ذریعہ ملکی مسائل و مباحث کا حل تلاش کرتے تھے۔ پریم چند ملک کے لیے ایک ایسی قومی زبان کا تصور کرتے تھے جسے ملک کے تمام طبقے قبول کرلیں'' ۲۸

اسی زبان کے تعلق سے جعفر رضا نے ایک اور بات مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے پیش کی ہے۔ کہتے ہیں:

''پریم چند زبان کو تہذیبی اور تمدنی ارتقاء سے متعلق کرتے تھے۔ جس کی وسعت و ترقی میں انسانی جدوجہد کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ زبان پر قدرت رکھنے کی بناء پر انسان، انسان ہے۔ زبان کی بدولت انسان نے ذہنی و مادی ترقی کی راہیں طے کیں اور اپنے تجربوں میں دوسروں کو شامل کرسکا'' ۲۹

اس طرح پریم چند کے حوالے سے جعفر رضا نے بڑی گہری اور وسعت آمیز نظر ڈالی ہے۔ جس کے ذریعے پریم چند کی پوری شخصیت اور حیات کے کارنامے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ پریم چند کے شعور تحت الشعور نفسیات، ذہنی ارتقاء زبان و بیان، جدت، سیاسی، سماجی و معاشرتی سرگرمیاں، ابتدائی ماحول، دورِ شباب میں تصورِ عورت اور آخری وقت پر گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پریم چند جن جن تحریکوں کے ساتھ وابستہ رہے مثلاً گاندھی واد، آریہ سماج، اور راجہ رام موہن رائے وغیرہ۔ ان تحریکوں سے وابستہ ہو کر انھوں

نے جو بھی کارنامے انجام دیے ان سبھی پہلوؤں کو جعفر رضا نے نظر انداز نہیں کیا اور اسکے علاوہ ایک لمبا وقت ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر گزارا گویا جعفر رضا نے پریم چند کی پوری حیات اور ان کے کارناموں کو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف کر دیا ہے۔ کہیں کوئی نکتہ چھوٹنے اور او جھل ہونے نہیں دیا ہے اس لیے جعفر رضا کی اہمیت ادبی دنیا تسلیم کرتی ہے۔

محمد حسن:

محمد حسن اردو کی ان چند عہد ساز شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ادب کی مختلف اصناف کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہے ہمارے اردو ادب میں نقادوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جن میں ایک نام محمد حسن کا بھی ہے۔ جنہوں نے بہت سے نقادوں کی طرح پریم چند کے تعلق سے ان کی تخلیقات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور پریم چند کی تحریروں کو جانچ اور پرکھ کر اپنے اعتبار سے ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ محمد حسن جدید تنقید نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نفسیاتی نقاد اور مارکسی نقاد ہونے کا بھی ان کو شرف حاصل ہے۔ محمد حسن ایک ترقی پسند نقاد ہیں ان کی تنقید نگاری کا آغاز آزادی سے پہلے ہو چکا تھا انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں کچھ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ ''ادبی تنقید' 'شعرِ نو، اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر، عرض ہنر، جدید اردو ادب، شنا سا چہرے، معاصرِ ادب کے پیش رو، ادبی سماجیات، مشرقی تنقید، مطالعہ سودا، جلال لکھنوی، ہندی ادب کی تاریخ، اور اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ اس کے علاوہ ضحاک، مورپنکھی، محل سرا، فٹ پاتھ کے شہزادے، سچ کا زہر، پیشہ اور پرچھائیں، کہرے کا چاند، موت کے بت ان کے بہتر ڈرامے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ ان کی صلاحیتا ور ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے سبھی ادبی نقادوں کی طرح پریم چند شناسوں میں اپنا نام درج کر دیا ہے۔ اور کھل کر وضاحت بھی کی ہے۔ اور ساتھ ساتھ کئی ادیبوں کے ساتھ ساتھ موازنہ کر کے پریم چند کی انفرادیت ثابت کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کے تعلق سے بہتر روشنی ڈالی ہے۔ محمد حسن نے

پریم چند پر'' پریم چند کا ورثہ'' اور'' زمانہ ذہن اور آرٹ'' کے تعلق سے پردہ اٹھایا ہے اور بہتر خیالات کی وضاحت کی ہے۔ محمد حسن نے جدید اردو ادب خاص کر پریم چند کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بدلتی ہوئی فکروں کے اعتراف کے ساتھ ان کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا۔ اپنی تنقیدوں میں انھوں نے زندگی اور سماج کی باہمی مطابقت مشترک اقدار اور گہرے ربط کا ذکر کیا۔ پریم چند سے قبل جو ادیب اپنے ناول اور افسانوں کے ذریعے قاری کی آنکھوں میں اپنی ایک تصویر بنا چکے تھے اور اپنی اہلیت منوا چکے تھے ان میں نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ تھے لیکن انھوں نے صرف شہر کی گلی کوچوں کی خاک چھانی اور شہر کے کرداروں کو ہی اپنے تصانیف میں جگہ دی۔ پریم چند نے ان حضرات کی تصانیف کا مطالعہ کیا اس کی وجہ سے ان حضرات کا رنگ پریم چند کے یہاں کہیں کہیں ضرور مل جاتا ہے۔ نذیر، سرشار، رسوا اور شرر کے تعلق سے پریم چند کے بارے میں ظہارِ خیال محمد حسن یوں کرتے ہیں جو حقیقت بھی ہے اور سچ بھی کہتے ہیں:

> ''یورپ ہندوستان کے لئے غلامی کی لعنت اور صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ تہذیبی ترقی کی نعمت دونوں ایک ساتھ لے کر آیا تھا پریم چند کے دور تک کا اردو ناول اس دوراہے سے آگے نہیں گیا تھا۔ یہاں صاف کھنک تھی تو تبدیلی کی ناگزیریت کو بدلنا مقدر ہو چکا تھا اور ماضی سے لگاؤ کے باوجود اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بار بار پلٹ کر دیکھنے کے باوجود مغرب ہماری تقدیر بن چکا تھا۔ یہ کیفیت نذیر احمد کے ناولوں میں خصوصاً ابن الوقت اور سرشار کے فسانۂ آزاد میں نمایاں تھی۔ ہاں شرر کے تاریخی ناول ماضی میں اعتماد کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے اور رسوا کی امراؤ جان گویا اس قدیم لکھنؤی تہذیب کی تمثیل تھی جو ایک معصوم مگر اغوا شدہ طوائف کی طرح بک چکی تھی اور دلاور خاں کا اب تک انجام تک پہونچنا باقی تھا۔ البتہ ''شریف زادہ'' نئے مغربی نظام کے لائے ہوئے امکانات سے سمجھوتہ کر چکا تھا''[۳۰]

اس طرح کے مغربی اثرات ہمارے متقدمین ادبا کی تحریروں پر اثر پزیر ہو چکے تھے اور یہی نہیں اس وقت کے جتنے بھی لکھنے والے تھے سبھی نے اس اثرات کو قبول کیا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد جب پریم چند کی آنکھیں سماج کے حالات دیکھتی ہیں اور اس کے ساتھ معصوم کسانوں اور مزدوروں پر ظلم اور ان کا استحصال دیکھتی ہیں تو پریم چند نے مغربی اثرات کو ذہن میں رکھا لیکن اپنی تحریروں میں صرف ایشیائی مسائل کو پیش کیا لیکن پریم چند کشمکش میں تھے انھوں نے مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور اور دیا نارائن در کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے سبھی کے خیالات ذہن میں نقش ہونے کے ساتھ پریم چند یہ نہیں طے کر پا رہے تھے کہ کس کا طرز اختیار کروں اس پس وپیش میں اور اسی دوراہے سے انہوں نے اپنا سفر شروع کیا۔ پریم چند کے سامنے ایک مرکزی سوال نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسؔوا سے الگ تھا۔ اسی مرحلے میں پریم چند دیا نرائن نگم کو 1914ء میں لکھتے ہیں:

''مجھے ابھی تک اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرزِ تحریر اختیار کروں کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں آج کل کاونٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں تب سے کچھ اس رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے۔''[۳۱]

اس طرح کے خیالات پریم چند نے پیش کیے لیکن اگر دیکھا جائے تو بنکم چٹرجی اور سرت چند کب کا اس راستے سے گزر چکے تھے لیکن ایک عصری حسیت کی گونج باقی تھی جس کو پریم چند نے محسوس کیا اور اس کے ساتھ جذباتیت سے بھرا ہوا اسلوب بھی تھا جس کے سلسلے میں پریم چند نے جتیندر کمار کو لکھا تھا:

''میں بنگالی نہیں ہوں وہ لوگ بھاوک (جذباتی) ہیں بھاوکتا (جذباتیت) سے جہاں پہنچ سکتے ہیں وہاں میری پہنچ نہیں۔ مجھ میں اتنی دین کہاں۔ گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی (بھاونا) جذبے سے پہونچا جاتا ہے۔ لیکن ''جتیندر'' میں سوچتا ہوں کاٹھنیہ (دشواری) بھی چاہئے... رابندر اور شرت دونوں مہمان ہیں پر ہندی کے لئے کیا

وہی راستہ ہے شاید نہیں'' ۳۲ے

پریم چند کے سامنے ان کا جو بنیادی سوال تھا کہ وہ انسان کو آسودہ اور خوش دیکھیں۔اس لئے انھوں نے اپنی ناولوں میں ایسے چیزوں کا ذکر بہتر طریقے سے کیا ہے جو نذیر سرشار، اور شرر وغیرہ کے یہاں نہیں۔ محمد حسن نے پریم چند کا تعارف بہت بہتر انداز میں کرایا ہے اور ان کے بہت سے افسانوں اور ناولوں کے تجزیے بھی پیش کیے ہیں اور ان کے کرداروں کے تعلق سے نمایاں بحث کی ہے۔محمد حسن کہتے ہیں کہ پریم چند کو اپنے کرداروں پر پورا بھروسہ تھا اور جن کرداروں سے جو بات کہلوانا چاہتے اس سے کہلوا بھی دیتے تھے۔ پریم چند کے یہاں تیز اور فعال کردار بھی ہیں اور سست کردار بھی۔ان کرداروں میں فعال اور سست کردار کا ہونا ضروری بھی ہے اسلئے کہ جب کوئی اپنے موجودہ سماج کی عکاسی پیش کرتا ہے تو اس میں سکھدا، سلیم، امر کانت جیسے فعال کردار بھی ہوتے ہیں اور گھیسو مادھو جیسے سست اور کاہل کردار بھی نظر آتے ہیں۔اس لیے پریم چند نے ناول یا افسانہ لکھتے وقت جہاں جس چیز کی ضرورت سمجھی فوراً اس کو استعمال میں لے آئے۔محمد حسن نے اپنی تنقیدی بصیرت کے ذریعے پریم چند اور اقبال وغیرہ کی مماثلت بھی پیش کی ہے اور سماج کے ہم آہنگ ہونے کی تکمیل کی نقل بھی نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور دونوں میں مقصدیت نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ علامہ اقبال عوام، سماج کو بیدار کرنے کا کام کرتے ہیں اور پریم چند بھی سماج و معاشرے کی جذبات کو اپنے قلم سے بیان کر کے ایک پسماندہ طبقے کو ہمواری اور مساوات کا سبق دینا چاہتے ہیں۔یہی نہیں یہ دونوں بڑے قلم کار مغرب کی صنعت زدہ تہذیب میں روح انسان کو گم ہوتے دیکھ رہے تھے اس لئے یہ دونوں حضرات کبیدہ خاطر ہوئے اور انسانی زندگی کو مغربی اثرات سے دور رکھنے کی کوشش کی دونوں کے یہاں اصلاحی پہلو موجود ہیں۔بس فرق اتنا ہے کہ علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش اور پریم چند نے اپنی موثر نثر کے ذریعے سماج میں ایک صور پھونکا تا کہ عوام اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکیں اور کسی کی بھیک میں دی ہوئی زندگی کو الوداع کہیں۔اگر دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی شاعری کا ترجمہ پریم چند ہیں۔محمد حسن نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے۔جس کے ذریعے اقبال اور پریم چند کی تحریکات کا پتہ چلتا ہے وہ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''اقبال رومی کے ذریعے اور پریم چند کچھ دنوں آریہ سماجی اثر اور کچھ
دن بعد گاندھی جی کے اثر کے ذریعے دونوں آرزو کے قائل اور ربط
ملت کے حامی ہیں اور دونوں اشترا کی نظام کو تقریباً یکساں طور پر لبیک
کہتے ہیں۔''۳۳؎

محمد حسن نے اس مضمون میں آگے چل کر فرد اور شخص کی تکمیل کے جائزے سے روشنی ڈالتے ہیں اور سماج کے عناصر کو بیان کرتے ہیں اور سماج کے موجودہ نظام کو سامنے رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''فرد سماجی تبدیلی کے قانون پر نظر رکھے بغیر سادہ دلی اور خلوص کے
ساتھ ان سماجی شکنجوں سے ٹکرا جائے تو فانی کی قنوطیت ابھرتی ہے جس
میں درد کی دل دوز نغمگی ہے مگر کائنات آفرینی کی قوت نہیں پریم چند
اس ہفت خوان میں مختلف منزلوں سے گزرے ہیں نرملا فانی ہی کی طرح
سماج سے ٹکرائی اور ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی شروع کے ناولوں کے کردار
سماجی اصلاح کے دائرے سے گزرتے ہیں اور فرد کی باطنی اور روحانی
تطہیر کے ذریعے تکمیل کی تلاش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں آہستہ
آہستہ یہ آسان اور آدرش وادی حل اپنی کشش کھونے لگتے ہیں''۳۴؎

اس سلسلے میں پریم چند کے بہت سے ناولوں کے اختتام اور ان کے موضوعات پر غور کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے جس کے ذریعے مذکورہ بالا خیالات کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے اور قاری کے سامنے ساری چیزیں کھل کر پیش ہوجاتی ہیں جس سے قاری یا سامعین کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

''ہم خرما و ہم ثواب'' جو 1905ء کا ناول ہے اس کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

''امرت رائے ایک بیوہ پورنا سے شادی کرلیتا ہے مگر اس کی پہلی محبوبہ
پریما کا شوہر دان ناتھ جب امرت رائے کو قتل کرنے آتا ہے تو اسے
بچانے میں پورنا جان دیدیتی ہے اور پریما اور امرت رائے کی شادی

ہو جاتی ہے۔

ا۔''جلوۂ ایثار'' 1906۔1902 برجن شاعری اور بھگتی میں کھو جاتی ہے۔

۲۔''بیوہ'' پورنا بیوہ ہو جاتی ہے اور بدری پرشاد کا آوارہ مزاج لڑکا اس کی عصمت پر حملہ کرتا ہے امرت رائے کے ودھوا آشرم میں اسے عزت کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔''بازارِحسن'' 1916 پدم سنگھ سمن کو گھر سے نکالنے پر پچھتاتے ہیں اور سمن کے لئے جو بیسوا ہوگئی ہے گجادھر جو سادھو ہو گیا تھا بیسواؤں کے لئے سیوا سدن قائم کرتا ہے اور سمن اس کی نگراں مقرر ہوتی ہے۔

۴۔گوشئہ عافیت'' 1922 گیان شنکر مکاری سے گایتری کی ساری دیہی جائیداد پر اپنے بیٹے مایا کے لئے قبضہ کر لیتا ہے اور مایا اسے کسانوں میں بانٹ دیتا ہے۳۵

ان چیزوں کے حتمی مطالعے سے منشی پریم چند کے فکر وفن کے تاریخ وارتقا کا تجزیہ بھی ممکن ہے۔ پریم چندان چیزوں کے ذریعے پورے سماجی نظام کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اسلئے کہ پریم چند جو اصلاح کرنا چاہتے ہیں وہ نہ فرد کی قلبِ ماہیت میں پنہاں ہے اور نہ تو سماجی اصلاح کے عارضی اقدامات میں بلکہ پریم چند اس نظام ہی کو اکھاڑ کر پھینکنے کی کوشش میں ہیں جہاں انسانوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جارہا ہو۔ جہاں انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر انسانی بھیڑئے انسانوں کا خون چوس رہے ہوں وہاں نہ زندگی کو سکون ملتا ہے اور نہ کوئی قانون پنپ سکتا ہے۔اس طرح کے نظام کو ختم کر کے ایک بہترین نظام کے خواہاں پریم چند نظر آتے ہیں۔اسی سلسلے میں پریم چند نے اپنی بہت سی کہانیاں پیش کی ہیں۔ وہ کہانی نہیں بلکہ ایک سماجی حقیقت ہے جس کو ناولوں اور فسانوں میں پریم چند نے بیان کیا ہے جس کے ذریعے پریم چند کے ذہنی ارتقا اور آرٹ کا پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے کس کس طرح کے احساسات سے اپنے ناولوں کو آراستہ کیا ہے۔

پریم چند پر محمد حسن کا ایک دوسرا مضمون بھی ہے جو ''پریم چند کا ورثہ'' کے نام سے ہے اس میں محمد حسن نے پریم جیسے ایک عظیم فنکار کی شخصیت پر بڑے والہانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اور پریم چند سے قبل سے لیکر پریم چند کی آخری سانس تک کی خدمات کو پیش کیا ہے۔محمد حسن نے پریم چند کے حالات کا بھی جائزہ لیکر اور پریم چند کے بعد کا بھی تجزیہ کر کے نئے ادیبوں اور فنکاروں کو نئے اور بہتر مشوروں سے نوازا ہے۔محمد حسن کہتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب لوگ صرف خیالی دنیا کے کرداروں سے اپنی حیات کو مزین کرتے تھے لیکن یہ خیالی چیز صرف خیالی رہی اور ان خیالی چیزوں سے سروکار رکھ کر نہ تو کوئی کسی کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ تو ان میں زندگی کے حقائق بیان کی قوت ہے لیکن جب افقِ اردو پر پریم چند نمودار ہوئے تو انھوں نے ان طلسماتی اور خیالی کرداروں کو الوداع کہہ کر ایک نئی روشنی قائم کی اور اردو کو ایک حقیقت نگاری کی طرف للکارا اور خو پریم چند نے بھی اپنے قلم کے ذریعے سماجی اصلاح کا کام لیا لیکن جب ملک پر انگریزی فوج کا تسلط ہو گیا اور انھوں نے ہندوستانی کمزور غریبوں اور مزدوروں پر ظلم ڈھانا شروع کیا تو پریم چند نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے افسانوں، ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے سماج کے درد کو اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی کردار کے حوالے سے بیان کیا اور لوگوں کو بلند حوصلے پر آمادہ کرتے رہے۔پریم چند نے خاص طور پر پسماندہ اور نچلے طبقے کی کسمپرسی کو اپنے افسانے میں پیش کیا ہے اور اگر دیکھا جائے تو حقیقت نگاری کو اپنی کہانیوں وغیرہ کے ذریعے بنیادی حیثیت پریم چند نے ہی عطا کی اور دنیا کو خیالستان کی لغویاتی حیات سے نکال کر ان میں صداقت کی روح پھونکی محمد حسن اسی سلسلے میں کہتے ہیں:

> ''پریم چند سے پہلے کے افسانوی ادب کا خیال آتے ہی طلسم ہوش ربا کے عمر وعیار اور ان کی زنبیل ذہن میں آتی ہے۔اس کے بعد چہار درویش ہیں جو نگر نگر گھومتے ہیں پھر سرور کے جانِ عالم کا ذکر آتا ہے جو طوطے کو رفاقت میں لے کر حسین شہزادیوں کی چاہ میں در بدر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔شہزادوں اور درویشوں سے قدم بڑھا کر زمانے نے متوسط طبقے کا وہ کردار پیدا کیا تھا جو پرانے تمدن کا پروردہ ہے لیکن نئی

تہذیب سے ناک، بھوں نہیں چڑھاتا کہیں وہ ابن الوقت ہے تو کہیں کلیم، کہیں میاں آزاد ہے تو کہیں امراؤ جان آدا پریم چند کے کردار ہمارے طبقاتی نظام کے سب سے نچلے طبقے سے آتے ہیں وہ میر داستان کا تاج کسانوں کے سر پر رکھتے ہیں، اس عام انسان کے سر پر رکھتے ہیں جس کی کہانیاں ہمارے ادب کیلئے ابھی تک اجنبی تھیں۔''۳۶

اس اقتباس کے حوالے سے محمد حسن کہتے ہیں کہ عوام کا مفہوم جو آج عام طور پر سمجھا جاتا ہے یہ افسانوی ادب میں ہم کو پریم چند کے یہاں پہلے پہل ملتا ہے۔ حالانکہ مذکورہ بالا اقتباس میں بھی بہت سے اعلیٰ کردار بیان ہوئے ہیں وہ سب کوئی شاہ کے گھرانے کا ہے تو شہزادہ ہے تو کوئی بہت رئیس ہے جس کا تعلق محل اور درباروں سے ہے لیکن پریم چند نے ان سب شہزادوں اور رئیسوں کو محل اور دربار سے نکال کر ایک دیہات میں بھیجا اور حالات کا تجزیہ کر کے ان کی اپنی اہمیت واضح کی ہے۔ جو آج ہمارے سامنے نچلے طبقے سے آتے ہیں۔ اور پھر ان کو پریم چند جدوجہد سکھا کر ایک نمایاں مقام حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں جہاں ہر طرح کے لوگوں سے ان کرداروں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کشمکش میں پریم چند ایک بہتر نظام بنا کر نچلے طبقے کے لوگوں کو مساوات کا درس دینا چاہتے ہیں جن میں امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں کسان اور مزدور بھی ہیں سرمایہ دار اور ساہوکار بھی ہیں ان کے علاوہ ذات برادری کا معاملہ بھی واضح ہوتا ہے۔ ان میں ٹھاکر، پنڈت، مولوی، پولیس، چمار وغیرہ گویا ہر ذات اور برادری کے لوگ ہوتے ہیں جہاں چھوا چھوت کا رواج بھی ہے اور نچلے لوگوں سے ملنے میں کسرِ شان بھی ہے۔ اس طرح کے نظام کا خاتمہ کر کے ایک سوشل نظام کے پریم چند متمنی تھے۔ اس لئے کہ جب پریم چند نے آنکھیں کھولیں تو ان ساری چیزیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان حالات کا مشاہدہ بھی بڑے بہتر طریقے سے کیا اس لئے پریم چند کا حساس دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے سماج کی گندگی کو اپنے قلم کے ذریعے پاک کرنے کی کوشش کی۔ کچھ اس طرح کی تحریکات گاندھی جی نے قائم کر رکھی تھیں اس لیے جس کا اثر صاف طور پر پریم چند کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ پریم چند ایک متوسط

ذہن کے مالک تھے جو مغربی آورش اور تعلیمات سے واقف تھے اور اسی وجہ سے پریم چند قومی آزادی، نیشنلزم اور گاندھی جی کی تحریکوں سے زیادہ متاثر ہوئے اس لئے جب سامراجی حکومتیں ہندوستان کی تہذیبی جڑیں اکھاڑنے میں کوشاں تھیں اور کافی حد تک اس کی تہذیبی وراثت کو نقصان بھی پہونچا چکی تھیں تب ایسے حالات میں ان تحریکوں سے متاثر ہونا اور ان تحریکوں میں شامل ہو کر ملک کی حفاظت کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اور پریم چند کے ضمیر میں ایک زندہ دل انسان کا خون تھا اس لئے انھوں نے اس تحریک میں بڑھ کر حصہ لیا جو کہ ایک دیہاتی تھے لیکن آج بڑے بڑے شہروں میں ان کی شہرت اور بلندی کے گیت گائے جارہے ہیں۔ پریم چند کے دیہاتی سلسلے کے تعلق سے محمد حسن کہتے ہیں:

> ''دیہاتی زندگی کے جس پس منظر میں پریم چند کی ذہنی نشو ونما ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ قدیم تہذیبی روایات ان کے مزاج میں قوی تر ہوں ایسے حالات میں جب ہندوستان میں قومی آزادی، مساوات اور سامراج دشمنی کے نعرے بلند ہو چکے تھے۔ کسانوں کی تحریکیں شروع ہورہی تھیں اور گاندھی جی کی تعلیمات اہنسا اور ترکِ موالات کی شکل میں ذہنوں کو متاثر کررہی تھیں۔ پریم چند کا ان سے متاثر ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔'' ۳۷

اس اقتباس کے ذریعے پریم چند کے متعلق یہ باتیں معلوم ہوئیں کہ ان کے ذہین پر نہ صرف مختلف تحریکوں کے اثرات مرتب ہوئے بلکہ ان سے پریم چند کے تخیل میں اضافہ بھی ہوا ہے اور انھوں نے گاندھی کی تحریک سے متاثر ہو کر ملک کیلئے بڑی قربانی دی ہے۔ ایک چیز اور ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی نچلے متوسط طبقے کے فرد کے لئے دو راستے کھلے ہوئے تھے یا تو وہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کی طرف قدم بڑھائے یا اپنی ہمدردیاں ان دبے کچلے مگر آگے بڑھتے ہوئے انسانوں سے وابستہ کردے جن کے بیچ میں وہ سانس لے رہا ہے۔ گرچہ پریم چند نے مغربی تعلیمات حاصل کیں اور ان سے استفادہ بھی کیا لیکن ان کے اندر مغربیت نے جگہ نہیں بنائی بلکہ پورا کا پورا ایشیائی رنگ پریم چند کے یہاں نظر آتا ہے۔ فکری اعتبار سے جس زاویے تک

پریم چند(جس انسان دوستی تک) پہونچے ان میں رومانی انداز کارفرما تھا اور رومانیت سے مراد عشق ومحبت نہیں ہے بلکہ رومانیت پریم چند کے یہاں وہ چیز ہے جو عقل سے زیادہ جذباتیت پر منحصر ہو۔ اپنے اس مقالے میں محمد حسن نے پریم چند کی حقیقت نگاری اور ورثے پر اظہار خیال کیا اور پوری زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ساتھ نئے ادیبوں کو بھی اس چیز پر آمادہ کیا ہے کہ پریم چند نے ادیبوں کیلئے ایک بہت بڑا ورثہ چھوڑا ہے جس سے استفادہ کر کے ہمارے ادیب افسانوں اور ناولوں میں بھی ایک نئی فکر پیدا کر سکتے ہیں اور پریم چند کی بنائی ہوئی مشعل سے اپنے چراغ کو روشن کر سکتے ہیں اقتباس دیکھیں:

> ''آج پریم چند کے ورثے کا اہم ترین جزء یہی ہے کہ زندگی سے ہمارے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا واسطہ زیادہ گہرا زیادہ قریبی اور زیادہ دیرپا ہو وہ عوام سے ذہنی طور پر ہی محبت کرنا نہ سیکھیں بلکہ ان میں جا کر ان کے شانہ بہ شانہ دکھ سکھ بھوگیں ان کی زندگی کا مطالعہ کتب خانوں کے میناروں یا کتابوں کے دریچوں سے نہیں بلکہ ان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں ان کے گھروں اور آنگنوں میں جا کر کریں ۔تبھی ان کے کردار زیادہ حقیقی ہوں گے اور صرف ان کے اپنے خیالات کے بھدّے پرچارک بننے کے بجائے زندگی کے مظہر بنیں گے۔اور تبھی ہمارا ادب صرف کچے نعروں اور میکانکی یکسانیت کا ادب بننے کے بجائے تنوع، رنگارنگی اور حقیقی حسن سے آشنا ہوگا''۳۸

اس اقتباس سے محمد حسن نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آج کل کے ادیب پریم چند بننے کیلئے اپنا گھر بار چھوڑ کر دیہات کی گلیوں اور کوچوں میں جا کر پھریں لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ ادب کو نئی وسعت اور فن کو فکری بالیدگی سے روشناس کرانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہمارا فنکار پریم چند کے ورثے کی روشنی میں نئی منزلیں طے کر لے۔

محمد حسن نے پریم چند پر روشنی اپنی تنقیدی بصیرت سے ڈالی اور انھوں نے پریم چند کے کرداروں،

ان کی حقیقت نگاری، سیاسی موڑ، طبقاتی نظام کی تبدیلی وغیرہ کے تعلق سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ پریم چند کے ذہنی ارتقااور آرٹ پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس کے ذریعے پریم چند کی شخصیت کو ابھارنے میں یہ چیزیں کافی مددگار ہونگی اور نئے محققین کیلیئے صداقت وسچائی کا باب کھلا رہے گا۔

پروفیسر قمر رئیس:

قمر رئیس اردو دنیا کا ایک اہم نام ہے۔ ان کی تنقید سے اردو دنیا کو ایک خاص قسم کی روشنی سے آگہی ملی۔ قمر رئیس کو بیک وقت مختلف اصناف پر مکمل دسترس تھی۔ ابتدا میں شاعری سے شغف رکھتے تھے لیکن بعد میں فکشن اور ڈرامے پر فوقیت کے ساتھ تنقیدی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ اردو کے گلستان میں صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ہندوستان کے باہر از بکستان کے ذرات کو بھی انھوں نے اپنے رشحاتِ قلم سے سرفرازی عطا کی ہے۔ کئی ایک شعرا کے شعری ترجمے کر کے اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔ وہ ایک بڑے نقاد بھی ہیں بعض اہم ناقدوں کے ساتھ قمر رئیس پریم چند کے اہم نقاد تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مضامینِ پریم چند کو بھی مرتب کیا اور اپنا اختصاص پریم چند کے مطالعہ کو بنایا۔

خاص کر انھوں نے تحقیق وتنقید میں اپنی ایک ان مٹ شناخت قائم کی اور آگے چل کر ایک بڑے نقاد کی حیثیت سے پہچانے گیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی اہم جگہوں سے بیش قیمتی انعامات بھی حاصل کیا۔ اسی طرح آگے چل کر ایک بہت بڑے افسانہ اور ناول نگار منشی پریم چند کی تحریروں کو تنقیدی نظریے سے جانچا اور پرکھا اور کئی کتابیں تصنیف کیں جیسے تلاش وتوازن، 1965ء، تنقیدی تناظر اور تعبیر وتحلیل، اردو افسانوی ادب بیسویں صدی میں اہم ہیں۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر قمر رئیس کی اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ اور نیا افسانہ مسائل ومیلانات، ترجمہ کا فن اور روایت بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔ قمر رئیس بنیادی طور پر فکشن تنقید کے ماہر خاص طور پر پریم چند کی فکشن پر ان کی گہری نظر ہے فکشن تنقید کو انھوں نے خصوصی طور پر اپنی علمی کاوش کا میدان بنایا لیکن پریم چند پر انھوں نے کافی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں جیسے پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، پریم چند شخصیت اور کارنامے، پریم چند فکر و فن، جو پریم چند صد سالہ تقریب اور جشن 1980 کے موقعے پر ڈاکٹر قمر رئیس نے جو مقالہ پیش کیا تھا وہ بعد

میں کتابی شکل میں 1980ء میں منظر عام پر آیا۔ پریم چند شناسی کے حوالے سے ان کے مثبت اور مدلل مضامین سامنے آئے جس سے پریم چند شناس کی کئی نئے راہیں کھلیں۔ ترقی پسند تحریک سے بھی قمر رئیس کا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ادب کی تفہیم وتوضیح میں شروع ہی سے ترقی پسندانہ رہا۔شعر وادب کی قدر و قیمت کے تعین میں مارکسی تنقید کوانھوں نے سب سے زیادہ کارآمد قرار دیا جس کے نتیجے میں پریم چند کوقمر رئیس نے بہت بہتر انداز میں سمجھا اور جانا ہے۔قمر رئیس سے پہلے بہت سے ادیبوں نے پریم چند پر اپنی چشمِ بصیرت ڈالی اور بہت کچھ لکھا لیکن جس تہہ داری اور گہرائی سے پروفیسر قمر رئیس کی رسائی ہوئی ہے سارے ادیب اس سے کوسوں دور رہ گیے ہیں۔اس لئے قمر رئیس ایک بڑا نام ہے۔انھوں نے منشی پریم چند پر ہر طرح سے نظر ڈالی اور اپنی ژرف بینی اور دور اندیشی سے کام لے کر پریم چند کے ہزاروں باب روشن کر دیئے ہیں۔جس کے ذریعے پریم چند کی اہمیت پھر سے ایک بار مسلم ہوگئی ہے

قمر رئیس نے اپنے تحقیقی مقالے میں پریم چند کے ناولوں کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر بڑی مہارت کے ساتھ روشنی ڈالی اور کسی بھی گوشے کو مبہم نہیں ہونے دیا۔علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کا جو موضوع تھا۔''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار''اس میں انھوں نے پریم چند کی ناول نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس کے سارے اصول وضوابط سے بحث کی ہے اور ساتھ ساتھ ناولوں کی قدر و قیمت کی تعیین بھی کی ہے۔ساتھ ساتھ پریم چند کی زندگی اور ادب پر بہتر گفتگو کی ہے۔قمر رئیس نے پریم چند پر باتیں کرتے ہوئے ان کے جذبات کے بجائے علمی تحقیق وتجزیہ پر اپنے مقالے کی بنیاد رکھی ہے اور اس میں پریم چند کی زندگی کے محرکات،تاریخی،سماجی اور سیاسی حالات پریم چند کے اسلوب وہئیت وغیرہ پر خوبصورت طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔قمر رئیس نے اپنے تحقیقی مقالے کو تین ادوار پر تقسیم کیا ہے اور تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔پہلے باب میں منشی پریم چند کی زندگی (بچپن تا آخر عمر) کا مطالعہ کیا ہے۔اور اس مطالعے میں پیش آنے والی سبھی چیزوں کو قلمبند کیا ہے جیسے بچپن کی محرومی، ناکامی کم عمر میں شادی،نوکری اور مستعفی ہونے کے وجوہات،فلم کمپنی سے وابستگی اور معدے کی بیماری جیسے مہلک امراض کا ذکر بہتر طریقے سے کیا ہے۔قمر رئیس کہتے ہیں کہ پریم چند کی زندگی کے نشیب وفراز محرومیوں اور ناکامیوں نے ان کو ایک ایسا قالب

دیا جس نے پریم چند کو گاؤں اور مظلوم طبقے کی بے ریا زندگی کو سمجھنے کا موقع فراہم کردیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند پر تبصرہ کرتے ہوئے اس زمانے کے سبھی حالات کو پیش کیا ہے اور دیہاتی منظر کشی کر کے ایک ایسا نمایاں وصف بیان کرتے ہیں جس کے ذریعے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اس طرح پریم چند کو سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب میں قمر رئیس نے منشی پریم چند کے ذہنی اور فکری پسِ منظر کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح پریم چند اپنے عہد کی زندگی اور معاشرے سے اپنے فن کی خاطر مواد اخذ کر لیتے ہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے قمر رئیس نے اس دور کے پیچ و خم کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس وقت جو حالات تھے انگریزوں کا تسلط۔ سماج اور معاشرے کی بدحالی اور پھر رویندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو، راجہ رام موہن رائے، کشیپ چندر سین، سوامی دیا نند سرسوتی، مہاتما گاندھی وغیرہ کی بڑھتی ہوئی قومیت اور آزادی کی تحریک وغیرہ۔ ان سے متاثر ہو کر پریم چند نے ملکی و قومی خدمات انجام دیں۔ ادب چونکہ سماج اور زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے زمانے کے اتار چڑھاؤ نے ادب کو متاثر کیا اور اس ضمن میں پریم چند کے قلم نے بڑی زود نویسی کی راہ اختیار کی اور حالات کے مدنظر انھوں نے حقیقت بیانی سے کام لیکر اردو ادب کو ایک پلیٹ فارم عطا کیا۔ اور اس کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔ ترقی پسند تحریک میں منشی پریم چند نے قلم کے علاوہ عملی شرکت بھی کی۔

تیسرے باب میں مغربی علوم سے استفادہ کرنے والے ادیبوں نے ملک کی نوتعمیر کی بابت جو رویے اختیار کیے ان کا خصوصی ذکر ہے۔ مولوی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہاتھوں جس ناول نگاری کا دور شروع ہوا وہ مغرب کے اثرات کی دین تھا۔ حالانکہ اس کے بعد کچھ ملکی مسائل پر بھی اصلاحی ناول لکھے گیے لیکن ان میں تاثر کی کمی تھی۔ اس لیے کہ ہندوستانی معاشرہ مغرب سے تعلق نہیں رکھتا۔ سیاسی اور سماجی حالات اور جنگِ عظیم نے ہندوستانیوں کو بیحد متاثر کیا تھا اور ان ناول نگاروں نے جب اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا تو ان کی کوشش محض خواص تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے کہ ان شخصیتوں میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق شہر سے تھا اس لئے ان کی تحریروں سے ہر آدمی کو متاثر ہونا ضروری نہیں۔ ایسے میں ایک آواز پریم چند

کی آئی اور انھوں نے پورے حالات کو متاثر کیا اور لوگوں کو عیش پرستانہ زندگی سے نکالنے کی کوشش کی اس وقت ہندوستان کے عوام وخواص ہندوستان کی اصل ترقی ونوتعمیر کی ڈور کو سلجھانے لگے۔قمر رئیس کہتے ہیں کہ پریم چند کی ذہنی وفکری بالیدگی نے اس پورے سماج اور سیاسی پسِ منظر کو کھول کر پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں مصنف نے پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں کا جائزہ لیا ہے اس ضمن میں پریم چند کے تین ناول۔''ہم خرما وہم ثواب'' جلوۂ ایثار'' اور''بیوہ'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔مصنف نے اپنی تحقیق و تاریخی اعتبار سے یہ بات واضح کی ہے کہ ہم خرما وہم ثواب ہی پریم چند کا باقاعدہ پہلا ناول ہے جو چھپ کر شائع ہوا ساتھ ساتھ مصنف نے پریم چند پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے جس کے ذریعے کئی خامیاں بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ظاہری بات ہے کہ جب کسی چیز پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے گی تو اس میں کچھ اچھائی یا برائی ضرور نظر آئے گی اور یہ ساری چیزیں فطری بھی ہوتی ہیں۔ڈاکٹر قمر رئیس کی تحقیق کے مطابق

''پریم چند کا پہلا ناول اسرارِ معابد تھا جو مکمل نہ ہوسکا اور جس کی قسطیں بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار''آوازِ خلق'' میں اکتوبر 1903ء سے فروری 1905ء تک شائع ہوئیں۔''۳۹

قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں پر اپنی گہری نگاہ ڈال کر اس کی وضاحت میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اور ان کے سبھی ناولوں کی اہمیت، حالات کے اعتبار سے پیش کر کے ایک بڑا کام کیا ہے جس ناول کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے جو بھی سیاسی یا سماجی محرکات درپیش تھے اس کا خلاصہ اور اس کی اہمیت مکمل طریقے سے بیان کی ہے۔جیسے''جلوۂ ایثار'' ہم خرما وہم ثواب'' وغیرہ کے ذکر حالات کے مطابق پیش کیے ہیں۔قمر رئیس ہم خرما وہم ثواب کو کردار نگاری کے اعتبار سے ناول کی صفِ میں جگہ نہیں دیتے۔یہ بات مصنف کی بجا ہے کہ اس میں کرداروں کی کمزوری ہے لیکن اگر اس کو ناول نہیں کہیں گے تو کہیں گے کیا؟ جو خامیاں تھی ان کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں پریم چند کی توجہ قصہ بیانی پر ہے نہ کہ ناول کی فنی تکمیل پر۔اس لئے مصنف پریم چند کی اس ناول کو ناول ماننے پر تیار نہیں ہیں۔مگر ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے اگر کوئی دس ناول لکھتا ہے تو دسوں میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور نظر آئیں گی یہ فطری تقاضا ہے کہ انسان کبھی کبھی اپنے راستے سے دانستہ

طور پر بھی بھٹک جاتا ہے لیکن بھٹکنے کے بعد احساس بھی ہوتا ہے۔ اس غلطی کو اتنی بڑی بھی نہیں ماننا چاہیے کہ انسان دوبارہ اپنی منزل کا نام تک بھول جائے۔

اس طرح مصنف نے اپنے مقالے کے پانچویں باب میں پریم چند کے دوسرے دور کے ناولوں مثلاً ''بازارحسن''، ''گوشہ عافیت''، ''نرملا'' اور ''غبن'' کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ بازارِحسن پریم چند کا ضخیم ناول ہے۔ اس ناول کے بارے میں قمر رئیس کا کہنا ہے کہ اس ناول سے متعلق پریم چند کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ انھوں نے اس میں بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس ناول کے ذریعے ہندوستانی عورت کی مظلومی و مجبوری کو دکھایا ہے جو ہمیشہ سے مرد کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوتی رہی پریم چند کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس قصہ میں میں نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے''۔[۴۰]

گوشہ عافیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اس ناول کے ذریعے پریم چند نے پہلی بار مظلوم کی آواز اوران کی دردناک زندگی سے اپنے ناول کی تکمیل کی ہے۔ اس ناول میں کسان، غریب، مزدور اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے حالات کے ذریعے ہندوستان کے سیاسی، وسماجی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کی ہے اس کے ذریعے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک پریم چند کا سیاسی وسماجی شعور کتنا بلند اور پختہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے اس تجزیاتی ومعروضی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ارتضٰی کریم لکھتے ہیں۔

> ''پریم چند کی جانب وہ صرف ''ہمدردانہ'' نہیں بلکہ ناقدانہ، نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید معیاری ہو جاتی ہے۔ انھوں نے گوشۂ عافیت کا بڑا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور فنی تکمیل، تکنیک، موضوع اور مقصد کے لحاظ سے پریم چند کے اچھے ناولوں میں اسے شمار کرتے ہیں۔''[۴۱]

اس کے بعد منشی پریم چند کے دو ناول نرملا (1923) اور غبن (1930) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قمر رئیس اس کو فنی اعتبار سے کامیاب ناول بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس ناول میں پریم چند نے ایک سماجی

برائی جہیز کا پہلو اٹھایا ہے اور پھر قاری کے سامنے اس لعنت کو موثر انداز میں بیان کر کے اس کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہیز کا مسئلہ تو آج پورے ہندوستان کا موضوع گفتگو بنا ہوا ہے اسی کو پریم چند نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہیز کے لیے خاطر خواہ رقم نہ ہونے کی وجہ سے ایک لڑکی بے میل شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شوہر اور بیوی کی عمر میں اس بڑے فرق نے آخر کار نرملا کی جان لے لی۔ نرملا ناول کے متعلق قمر رئیس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> اس طرح پریم چند کلیانی اور نرملا کو نئے حالات سے دو چار کر کے قاری کے لیے کہانی میں تجسس اور دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ کلیانی کی منتوں کے باوجود اب بابو بہال چند اور ان کا لڑکا، نرملا سے شادی کرنے کے لیے رضا مند نہیں ہوتے۔ اسلیے کہ وکیل صاحب کی اچانک موت کی وجہ سے انھیں جہیز میں زیادہ رقم ملنے کی توقع نہیں رہتی۔ مجبور ہو کر کلیانی نرملا کے لیے دوسرے بر تلاش کرتی ہے لیکن ہر نوجوان لڑکا اپنی خاندانی حیثیت استعداد اور کاروبار کی مناسبت سے جہیز کا طالب ہوتا ہے۔ صرف چالیس سال کی عمر کے طوطا رام بغیر جہیز کے شادی کرنے پر رضا مند ہیں۔ کلیانی جہیز نہیں دے سکتی۔ اس لے نرملا کی شادی طوطا رام سے ہو جاتی ہے۔''۴۲

''ناول ''غبن'' بھی اسی طرح ایک گھریلو اور سماجی ناول ہے جس میں سماج میں پیش آنے والے مسائل پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ قمر رئیس اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہے کہ اس ناول میں متوسط گھرانے کا ایک شخص اپنی کھوکھلی نمائش پرستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دفتر میں غبن کر کے فرار ہو جاتا ہے اس عمل کے پیچھے سماج کا وہ فرسودہ شوق ہے جو زیور کو عورت کی کمزوری بنا دیتا ہے اور اسے سماجی عزت و وقار کا باعث سمجھا جاتا ہے بیوی کی چندن ہار حاصل کرنے کی خواہش شوہر کو غبن کے عمل تک پہونچا دیتی ہے۔ آخر کار ہیروئن زیور سے محبت ختم کر کے اپنے گھر کی خوشیاں دوبارہ حاصل کرتی ہے۔ اسی سلسلے میں ان کا یہ اقتباس دیکھئے۔

''اس ناول میں متوسط طبقہ کی امارت پسندی اور اس کی کھوکھلی نمائش کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ مطالعہ سماجی بھی ہے، انفرادی اور نفسیاتی بھی۔ یہ کہنا کہ زیورات کا شوق ناول کے پلاٹ کی اساس ہے، صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جالپا شادی کے روز اُن بیش قیمت زیورات کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی جو سسرال کی طرف سے اُسے ملتے ہیں۔ ناول کا اصل سرچشمہ ایک ایسی معصوم خواہش کی نا آسودگی ہے جسے جالپا سات سال سے اپنے دل میں پروان چڑھا رہی تھی یعنی ایک چندن ہار۔ جسے نہ پا کر اس کا دل چاہتا ہے کہ ہزاروں روپے کے وہ زیورات پھینک دے جو سسرال سے آئے ہیں۔۔۔۔

لیکن اس کے فرار ہونے کے بعد جالپا کو جب اس کی اصل کیفیت معلوم ہوتی ہے تو وہ اپنے زیور فروخت کر کے غبن کی رقم دفتر میں جمع کر دیتی ہے۔ پھر وہ کلکتہ پہنچ کر رما کو پولیس کے جال سے نکالنے کی جدوجہد کرتی ہے آخر کار دیبی دین اور زہرہ کی مدد سے اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے۔''۴۳

مصنف نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پریم چند کے ناول کی ایک خوددار عورت سماجی وقار کے ڈھونگ کو ختم کر کے اپنے شوہر کو پولیس کی ظالمانہ حرکت سے آزاد کرا لیتی ہے۔ اس طرح مصنف نے قاری کے سامنے اس حقیقت کو باور کرا دیا کہ ہندوستان میں سیاسی و سماجی وقار نے رفتہ رفتہ کسان، غریب، مزدور اور پسماندہ طبقے میں اہمیت حاصل کر لی۔

قمر رئیس لکھتے ہیں کہ جب ہندوستان میں عہدِ غلامی اور سرمایہ داری کا شور و غوغہ تھا اس وقت پریم چند نے 1924ء میں اپنا ایک ضخیم ناول ''چوگانِ ہستی'' لکھ کر اپنے عہد کے دو اہم مسائل پر گفتگو کی تھی۔ ایک سرمایہ داری کی لعنت اور دوسری صنعتی عہد کی برائیاں۔ قمر رئیس کہتے ہیں کہ یہ پریم چند کا سب سے ضخیم ناول

ہے جوتقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اس ناول کو پریم چند اپنا سب سے کامیاب ناول کہتے ہیں۔اس ناول کے ضمن میں مصنف نے جو تجزیہ کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند لامذہب ہوتے ہوئے بھی مذہب کے بنیادی اصول یعنی ''سب کچھ اوپر والے کی مرضی سے ہونے'' کی بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس ناول کے تعلق سے مصنف نے یہ کہا ہے کہ اس ناول کو لکھتے وقت پریم چند تاریخ، سماج، سیاست، ملک وقوم کی بدحالی، قوموں کا حال اور مستقبل سب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

پردۂ مجاز کے حوالے سے قمر رئیس کہتے ہیں کہ یہ فوق الفطرت عناصر کی وجہ سے پریم چند کا سب سے متنازعہ ناول ہے اور اسے پریم چند کے سرسوتی پریس میں سب سے پہلے شائع ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ناول ''میدانِ عمل'' میں ہندوستان کا سیاسی نشیب وفراز دکھایا گیا ہے۔محنت کشوں غریبوں ومزدوروں پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جاتے ہیں ان کو اور چھوا چھوت کی بیماری کو بھی قمر رئیس نے بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول ''گئودان'' جو پریم چند کا آخری اردو ناول ہے اسے پریم چند کا سب سے کامیاب ناول ہونے کا اعجاز حاصل ہے ڈاکٹر قمر رئیس نے ''گئودان'' کو پریم چند کی پوری زندگی کی کمائی بتایا ہے اور اس ناول میں پریم چند کا فن درجہ کمال کو پہونچا ہوا ہے۔اس میں ہوری، دھنیا، گوبر، اور ہیرا جیسے کردار موجود ہیں لیکن اس میں ہیرا اپنے بھائی کی گائے کو زہر دیکر مار دیتا ہے اور ہوری جو کہ ایک نہایت غریب مزدور ہے اور قرضوں سے پٹا ہوا ہے اور غربت کی وجہ سے وہ کام بھی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کو سن کر آدمی شرم سار ہو جائے۔اور ہوری ان چیزوں کے ساتھ اپنی گائے کے ذریعے خوشحالی کی توقع تو کرتا ہے مگر یہ توقع وفا نہیں ہوتی اور یہ خواہش لیے ہوری مر جاتا ہے۔اس میں بھی امیر غریبوں کا خون چوستے اور آرام سے رہتے ہیں۔قمر رئیس نے منشی پریم چند پر بہتر طریقے سے نظر ڈالی ہے اور ہر اعتبار سے جانچنے پرکھنے اور پریم چند کے نفسیاتی شعور کی تہہ تک پہونچ کر ان کے ذاتی خیالات کی نقاب کشائی کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔یہاں قمر رئیس تمام غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہونچتے ہیں: اقتباس

''پریم چند کی زندگی میں کچھ ایسے حادثات کا سراغ بھی ملا ہے جن کو

انھوں نے ہمیشہ راز بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے بے تکلف دوستوں پر بھی کبھی ظاہر نہ ہونے دیا اور اگر کسی نے اصرار یا استفسار کیا تو اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا اس لئے کہ ان کا انکشاف زندگی کے اس آورش اور زندگی گزارنے کی اس اخلاقی تصور کے منافی تھا جس کی وہ تبلیغ کر رہے تھے اور جسے وہ عملی زندگی بنا کر دیکھنا چاہتے تھے۔''۴۴

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قمر رئیس نے پریم چند کی تحریروں پر بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ورنہ اور بہت سے ادبا نے پریم چند پر قلم اٹھایا لیکن اس تہہ تک نہ پہنچ سکے جس تہہ تک قمر رئیس کی رسائی ہوگئی ہے اسی لیے تمام نقادوں میں قمر رئیس سرِ فہرست ہیں۔ اور یہی نہیں قمر رئیس نے اپنے اعتبار سے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جس پر گفتگو نہ کی ہو۔

ناولوں کے مکمل تجزیے کے بعد زبان و بیان اور فن پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور پریم چند پر ایک بڑا کام کر کے پریم چند کو ہمیشہ کیلیے زندہ و جاوید کر دیا ہے اور ایسی شمع روشن کی جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔ قمر رئیس نے ناولوں کے ذریعے سے ان کے ادوار کو تقسیم کر کے ناولوں کے ساتھ پریم چند کی اہمیت بھی مسلم کر دی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناولوں کے ادوار کے حساب سے حالات کی عکاسی بھی پیش کی ہے۔ منشی پریم چند کی زبان و بیان پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پریم چند کی تصانیف نے ایک ایسی ادبی اور معیاری زبان کو رواج دینے کی کوشش کی ہے جو بول چال کی زبان سے قریب تر ہو اور زبان کے نئے تقاضوں کو پورا کرتی ہو''۴۵

ان کی ایک اور کتاب ''پریم چند فکر و فن'' پریم چند کے صد سالہ تقریب اور جشن 1980ء کے موقع پر ''جشن پریم چند کمیٹی'' کے سکریٹری کے حیثیت سے ڈاکٹر قمر رئیس نے جو مقالہ پیش کیا تھا وہ کتابی شکل میں دسمبر 1980ء میں پریم چند فکر و فن کے نام سے منظر عام پر آیا انھوں نے یہ کتاب پانچ ابواب پر تقسیم کی تھی

جس میں پریم چند کی پوری زندگی پیدائش سے لیکر آخری وقت تک تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔لیکن ان کے ابواب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پہلا باب سفر کی منزلیں، دوسرا باب گاندھی واد سے سماج واد تک، تیسرا فرقہ وارانہ ہم آہنگی، چوتھا تصورِ حیات اور پانچواں پریم چند کی روایت ہے۔اس میں پریم چند کی ابتدائی زندگی سے لیکر دیہاتی، سیاسی، معاشی حالات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے اوران سبھی ابواب پر قمر رئیس نے مکمل تبصرہ کیا ہے۔سب سے پہلے انھوں نے پریم چند کی تصانیف اور تحریروں کا تعارف پیش کیا ہے۔ جو نواب رائے کے نام سے شائع ہوئیں ان میں ''سوزِ وطن''، ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''کشنا'' اور ''روٹھی رانی'' وغیرہ شامل ہیں۔ اور اس بارے میں پریم چند کی تحریریں فن بدلتی ہوئی زندگی ملازمت گھریلو حالات سرکاری ملازمت سے آزادی اور پریم چند کے فکری، سماجی اور قومی شعور پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ایک جگہ پریم چند کے فکر وفن پر تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرکاری ملازمت سے آزادی کے وقت پریم چند کا فکری سماجی اور قومی شعور اس قدر بالیدہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے برطانوی حکومت سے انحراف ہو کر اپنی نوکری سے استعفیٰ دیدیا تھا۔اور ملک کی ترقی اور فلاح میں لگ گیے جس کے پاداش میں پریم چند کو جیل کی بھی ہوا کھانی پڑی۔قمر رئیس پریم چند کی فکری ارتقا کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند کس طرح اپنے ہم عصروں میں انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ایک جگہ پریم چند کو گاندھی جی کے قلب ماہیت میں دکھایا گیا ہے۔مگر اس کی تفصیل سے وضاحت نہیں کی ہے۔تبدیلی قلب کے حوالے سے اگر ایک دو اقتباس پریم چند کی تصانیف سے حوالے کے ساتھ دیتے تو قاری کے سامنے ساری باتیں بہتر طریقے سے آجاتی جیسے پریم چند اس تاثر کو اپنی تخلیق میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''برا شخص بالکل ہی برا نہیں ہوتا اس میں کہیں فرشتہ ضرور چھپا ہوتا ہے
> یہ نفسیاتی حقیقت ہے۔اس پوشیدہ یا خوابیدہ شے کو ابھارنے اور اس کو
> سامنے لانا ایک کامیاب افسانہ نگار کا شیوہ ہے۔''[۴۶]

اس اقتباس کے ذریعے پریم چند کے افکار و خیالات پر گاندھی جی کی اثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ پریم چند گاندھی جی کے کچھ خیالات سے متفق نہیں تھے۔ جیسے مذہبی عقائد، اہنسا پر بہت زیادہ زور اور

سرمایہ داری سے بیزاری وغیرہ۔اور دوسرے یہ کہ پریم چند فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پریم چند ہندو اور مسلم دونوں کی نکتہ چینی سے نہیں گھبراتے تھے اس لیے کہ وہ سماج میں مساوات کے حامی تھے اور سماج کو بہتر اور پُر امن دیکھنا چاہتے تھے اگر کہیں کوئی فرقہ وارانہ سانحہ پیش آتا تو پریم چند دلبرداشتہ ہو جاتے تھے اور ان کو بہت تکلیف پہونچتی تھی۔اسی لیے انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے حِج اکبر،، فاتحہ، مندر، مسجد ادیب کی عزت اور اہنسا وغیرہ پر بہترین موضوعات تحریر کیے جن کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثالیں ملتی ہیں۔

قمر رئیس کے تعلق سے یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ وہ مارکسی تنقید سے متاثر تھے اور اس کے چلتے ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گیے۔اس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ تحریر کیے جانے والے ناول اور افسانوں پر ان کی گہری نظر تھی لیکن ان کی دلچسپی پریم چند کی تخلیقات میں زیادہ تھی۔اس لیے انھوں نے پریم چند پر بڑی دیانت داری اور ایمانداری سے کام کیا ہے۔اور پریم چند پر بہت سے مضامین لکھتے رہے جس سے پریم چند کی خدمات کا ایک مرکز قائم ہو گیا 1962ء میں ''پریم چند شخصیت اور کارنامے'' جو کہ قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ہے شائع ہوئی اور اس میں مقدمے کے علاوہ تین اور مضامین شامل ہیں یہ مضامین ''پریم چند کی فلمی زندگی'' ان کے ابتدائی ناول اور پریم چند کی زندگی میں رومان کی اہمیت سے متعلق ہیں۔

اس کتاب کے مقدمے میں اردو ہندی دونوں پر پریم چند کی مقبولیت وافادیت خاص کر افسانوی ادب میں ان کی اولیت وافادیت پر غیر جانبدارانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور دھنپت رائے کے تخلیق کردہ افسانوں وناولوں کے موضوعات اور ملک کے محنت کش طبقہ کے بارے میں پریم چند کے افکار وعمل پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے موجودہ دور میں ان کی اہمیت وافادیت کے ساتھ پریم چند کی معنویت پر بھی روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔جس کا لُب لباب پریم چند کی اردو زبان وادب سے متعلق والہانہ محبت اور اردو کے حوالے سے پریم چند پر مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے۔ادب اور زندگی سے متعلق پریم چند کے خیالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔آخر میں انھوں نے پریم چند پر لکھے ہوئے مضامین، کتابوں اور تبصروں پر مختصر روشنی

ڈالی ہے۔

فراق گورکھپوری، ممتاز حسین، سید احتشام حسین، وقار عظیم، اور دیانارائن نگم جیسے اکابرین ادب کے مضامین کے علاوہ اس کتاب میں روسی نقاد وی، ایس بیسکروفنی کے بہترین مضامین کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ان میں سے اکثر و بیشتر مضامین میں پریم چند کے افسانوی ادب کی قدر و قیمت کا محاکمہ کیا گیا ہے۔آگے چل کر اس کتاب کا ہندی میں ترجمہ پریم چند کی وچار یاترا کے نام سے شائع ہوا۔

ان تین مضامین کے علاوہ قمر رئیس نے اور بھی کئی اہم مضامین تحریر کیے ہیں جو پریم چند شناسی کے میدان میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔جن میں سے کچھ کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

۱۔ پریم چند کی شخصیت اور ہندوستانی فلم

۲۔ پریم چند کا پہلا ناول

۳۔ پریم چند کی زندگی میں رومان

۴۔ پریم چند کے افسانے ایک جائزہ

۵۔ پریم چند کی روایت اور معاصر افسانوی ادب

۶۔ پریم چند کے ہیرو ایک سماجیاتی مطالعہ

پہلے مضمون میں پریم چند کی فلمی دنیا کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور فلمی دنیا میں اس کی مقبولیت اور اس کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔اور اس میں مل مزدور بازارِ حسن، شیرِ دل، نوجیون وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے۔

''پریم چند کا پہلا ناول'' یہ مضمون قمر رئیس کے ابتدائی مضامین میں سے ایک ہے۔اس میں قمر رئیس نے پریم چند کے پہلے ناول اسرارِ معابد سے متعلق تلاش وتحقیق کو پیش کیا ہے۔اسی طرح اپنے ہر مضمون میں اسکی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

آخر میں پریم چند کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند ایک کامیاب اور بہتر ناول نگار تھے اور پریم چند کو ناول نگاری پر پوری گرفت تھی کہیں کہیں کوئی ناول یا کردار اگر ڈھیلا ڈھالا ہے تو

اس کی وضاحت بھی کی ہے کسی کمی یا غلطی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے پورے غیر جانبدارانہ رویے سے کام لیا ہے۔اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے پریم چند کی رومان پسندی کا سراغ بھی لگایا اوران کی تخلیق ''ہم خرما وہم ثواب'' سے اخذ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔قمر رئیس اپنے تیز رفتار قلم کے ذریعے تخلیق کار کی ذہنیت اور نفسیات کی تہہ میں اتر کر اس کی اصلیت کو واضح کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔

چوتھا مضمون ''پریم چند کے افسانے ایک جائزہ'' جس میں پریم چند کے افسانوں پر تحقیقی زاویہ سے بحث کی گئی ہے۔اردو میں یہ ایک اہم مضمون ہے قمر رئیس نے اس مضمون کو ادب میں روشناس کرانے کے لیے دقتوں کا سامنا کیا پہلی بار انھوں نے مستند طور پر پریم چند کے افسانوں کی مجموعی تعداد پر اظہار خیال کیا۔ اردو اور ہندی کے افسانوں میں جس طرح سے فرق واضح ہوا ان پر روشنی ڈالی۔مصنف نے اس مضمون میں اپنی لیاقت سے یہ بھی پیش کیا ہے کہ پریم چند کی وفات کے بعد ان کے نام سے اٹھارہ ایسی کتابیں اردو افسانوی مجموعے کی شکل میں شائع ہوئیں جو اصل میں ان سے منسوب تھیں اسکو اپنی جانفشانی سے کسی فرضی پریم چند نے شائع کیا تھا۔مصنف نے ان کتابوں کی فہرست بھی دی ہے ان کے اس تحقیقی کام سے جو 1962ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد کی نسل جعفر رضا دوسرے پریم چند شناسوں نے اس مضمون سے گراں قدر فائدہ ضرور اٹھایا۔

اسی طرح ان کا ایک اہم مضمون ''پریم چند کی روایت اور معاصر افسانوی ادب'' ایک تنقیدی مطالعہ ہے۔پہلی بار قمر رئیس نے اس مضمون میں پریم چند کے افسانوی ادب کے حوالے سے فن وفکر کے بنیادی پہلوؤں کا سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جسے پریم چند کی روایت یا ادبی ورثہ کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعد کے اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے حوالے سے ان اثرات کا جائزہ لیا گیا جو پریم چند کی روایت کا ایک رکن تھے انھوں نے رشید جہاں، احمد علی، سہیل اعظیم آبادی، سدرشن، اعظم کریوی، اوپندر ناتھ اشک اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں پریم چند کی روایت کی نشاندہی کی۔

پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون ''پریم چند کے ہیرو ایک سماجی مطالعہ'' میں ان اہم کرداروں کا سماجی مطالعہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ان کرداروں کی تشکیل وتعمیر میں سماج اور اس دور کی سماجی کشمکش نے کیا اہم رول ادا

کیا ہے اس پہلو پر بھی تذکرہ کیا ہے جو داستانوی اثر ورسوخ سے متاثر ہو کر وجود میں آئے تھے۔البتہ اس دور کے ہیرو محلوں کی آرام وآسائش کے عادی تھے بعدازیں حکومتِ برطانیہ کے ہیرو کے کرداروں کو آئینہ کی طرح نکھارنے میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے تحقیقی زاویہ وتنقیدی صلاحیتوں سے پریم چند کے کرداروں میں حقیقی ادراک حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔جو سماج و معاشرت کی اصل پہچان تھے۔البتہ ڈاکٹر قمر رئیس کا نقطہ نظر مارکسی اور سائنٹفک تھا۔اسی نظریہ کے تحت انھوں نے پریم چند کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔اور ایسے نقاد کے نزدیک ادیب کی داخلی اور خارجی دونوں زندگیاں اس کے تخلیقی عمل کے محرک ہوئی ہیں۔قمر رئیس نے اس وقت کے سماج کے سیاسی وتہذیبی و معاشرتی اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ پریم چند کے ذہن و وقار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جہاں تک دیگر ناقد اور محقق رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ پریم چند کی حقیقت پسندی واقعیت نگاری اور فکری رویوں کے پردے کے آڑ میں ناقد ڈاکٹر قمر رئیس ان محرکات کا پتہ لگاتے ہیں۔ جہاں پریم چند کے ذہن میں نچلے طبقے سے ہمدردی، حب الوطنی دیہاتوں کی بدحالی کولیکر اس میں سدھار لانے کے خواب کی جڑیں تعمیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔البتہ یہی کسان، مزدور اور سماج کے پسماندہ لوگ پریم چند کی اصل جولان گاہ تھے اسی زمینی سطح سے انھوں نے ایسے ایسے کرداروں اور ہیرو کی تخلیقات دریافت کیں کہ کردار کے ہیروں نے ادب میں اپنا مقام بنالیا اور اس میں متوسط طبقہ سے اٹھ کر ہیرو کا کردار پورے اردو ادب میں سایہ فگن ہوئے اور یہ ہیرو کے کردار ہندوستان کے دل کی دھڑکن ثابت ہوئے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی حالات کا تاثر پریم چند نے بھی لیا۔انھوں نے عوام کے درد کو عوام ہی کی طرح محسوس کیا کیونکہ وہ خود عوام میں سے تھے۔صرف ایک آواز، بے غرض محسن، اور خون سفید کو مصنف نے اس عہد کے سماجی و سیاسی حالات کا عکس بتایا۔علاوہ ازیں چوگان ہستی، میدان عمل، گوشہ عافیت، گئودان وغیرہ کے ہیرو کو گاؤں اور عام زندگی کا آئینہ بنا کر پریم چند نے خوبی سے پیش کیا۔مصنف مطالعہ کے بعد اس نقطہ پر پہنچتے ہیں کہ پریم چند کے ہیرو صرف سماج وسیاست کے نمائندہ کردار ہی نہیں بلکہ عموماً وہ زندگی کا لطف لیتے ہوئے بہترین طریقے سے زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔قمر رئیس پریم چند کے ہیرو کے خدوخال پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''پریم چند کے اصل ہیرو سور داس یا ہوری نہیں بلکہ ہندوستان کے وہ کروڑوں کسان اور محنت کش عوام ہیں جو ظلم و استحصال کے اس نظام میں حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ جو بھوک، افلاس اور جہالت کے ہاتھوں اپنی انسانیت اور انسانی وقار سے محروم ہوتے جارہے تھے۔ تباہی اور موت کی گھاٹیوں کی طرف بڑھتے ہوئے یہ شکستہ حال ہیرو، روشنی کے ایسے دیے ہیں جو اردگرد کے بھیانک اندھیروں کا احساس شدید کرتے ہیں۔''[۴۷]

پریم چند شناسی کے لحاظ سے اس مضمون کی اہمیت مسلم ہے جس زاویہ نظر سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہے قمر رئیس سے پہلے کسی اور نقاد نے پریم چند کی تخلیقات کا اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے۔

پریم چند کے کرداروں کے ذریعہ اس عہد کے حالات کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس جہاں پریم چند کی ان نایاب تخلیقات سے متعلق کچھ باتوں کو جھٹلاتے ہیں تو وہیں دوسری جانب بہت سی فکری و فنی گھتیوں کو سلجھانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے تجزیاتی نقطہ نظر نے پریم چند کے تصورِ آزادی میں ان لوگوں کی آزادی کی گونج سنی ہے۔ جو ہندوستان کے آزادی کے ستر سال بعد بھی آزاد اور سرخرو نہیں تھے دور حاضر میں بھی پریم چند کی شناخت اور ان کی معنویت نئی نسل تک پہچانے کی ان کی سعی قابل تعریف ہے۔ چونکہ پریم چند کی شخصیت اتنی تہہ دار ہے کہ ہر دور میں ان کی شخصیت کے پرچھائیں کی پرتیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ قمر رئیس جیسے نقاد کا نام پریم چند کے باب میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

مسعود حسین خاں:

مسعود حسین خاں اردو ادب کے ایک بڑے محقق اور تنقید نگار اور لسانیات کی دنیا کے ایک بڑے ماہر لسانیات بھی ہیں۔ مسعود حسین خاں کا جب نام آتا ہے تو لسانیات کی دنیا ہماری نگاہوں میں نمایاں ہوجاتی ہے۔ اور یہی نہیں ماہر لسانیات میں مسعود حسین کا نام سرِ فہرست ہے انھوں نے متعدد کتابین لکھ کر اپنی اہلیت

کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی کتابوں میں مشہور کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' ہے جو آج ہمارے درسی نصابوں میں شامل ہے۔ انھوں نے پوری ہندوستان کی سبھی بولیوں کے نام گنائے ہیں اور سبھی زبانوں پر جو بھی اثرات رہے ہیں ان کی وضاحت بھی پیش کی ہے۔ اس طرح انھوں نے پریم چند کے ناول ''گودان'' کا لسانی مطالعہ کیا ہے اور ایک جو لمبی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ناول ''گئودان'' اردو میں لکھا گیا یا ہندی میں اس لیے کہ ہندی میں ''گودان'' کہتے ہیں اور اردو میں ''گئودان'' اس پر بہت سے بڑے بڑے ادیب اپنی اپنی رائیں اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے اور یہ ایک لمبی بحث کافی دنوں تک ادیبوں کا موضوع بنی رہی آخر کار مسعود حسین خاں نے اپنی تنقیدی اور تحقیقی بصارت و بصیرت سے کام لیکر تحقیق کی اس حد تک پہونچے کہ یہ ناول اردو نہیں بلکہ ہندی کا ترجمہ ہے جو آج ہمارے سامنے ''گئودان'' کی شکل میں ہے اس پر ڈاکٹر مسعود حسین ایک سیمنار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدھیہ پردیش کی اردو اکادمی میں اردو کے تقریباً سبھی لوگ موجود تھے اور جتنے حضرات وہاں تھے وہ سب کے سب پریم چند شناس تھے جو کہ اپنے اپنے قلم کے ذریعے پریم چند کی زندگی اور ان کے مختلف گوشوں پر ہر اعتبار سے روشنی ڈال چکے تھے۔ آفاق صاحب کہتے ہیں اقتباس:

> ''ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر سعید عارفی، ڈاکٹر سید حامد حسین، پروفیسر فضل تابش، پروفیسر اظہر راہی اور ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنے مقالات کے ذریعہ پریم چند کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اس سمینار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ مقالات میں جن باتوں کا اظہار کیا گیا تھا ان پر بھرپور مباحث تھے جن میں اختر سعید خاں، اقبال مجید، شاہمیر راہی، یوسف کمال بخاری اور دیگر دانشوروں کے علاوہ خود مقالہ نگاروں نے حصہ لیا'' ۴۸؎

ان سبھی حضرات کی موجودگی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی اپنا مقالہ ''گئودان گودان سے کس

قدر مختلف ہے'' تھا۔اس بات پر کہ گئودان طبع زاد ہے یا ترجمہ؟اس پر امرت رائے سے بھی رائے دینے کو کہا گیا لیکن انھوں نے کہا کہ اس پر وہ کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن ایک ہلکی سی یاد ہے کہ سحر ہتگامی سے اس سلسلے میں پریم چند نے کچھ رابطہ ضرور قائم کر رکھا تھا۔اسی سلسلے میں مسعود حسین خاں نے کہا تھا گئودان ہندی ناول ہے جس کو سحر ہتگامی نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا لیکن جعفر رضا کا کہنا تھا کہ وہ ناول ''گئودان'' اردو میں تھا۔ بعد میں یہ بحث موضوع بحث بنی اور اس تحقیقی سلسلے میں مختلف مثبت قدم اٹھائے گیے اور اس پر ایک بار پھر ایک نئی تحقیق شروع ہوگئی۔

مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ پریم چند کے ایک مخلص دوست اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی تھے۔ان دونوں حضرات کے درمیان کاروباری تعلقات تھے۔مسعود حسین خاں نے پریم چند کے 11 ستمبر کے ایک خط کا حوالہ دیا جو پریم چند نے زمانہ کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم کو ارسال کیا تھا اس کے ذریعے گئودان سحر ہتگامی کے ترجمے کا انکشاف ہوتا ہے پریم چند اس خط میں نگم کو یوں لکھتے ہیں۔

''حضرت سحر کو میں نے 200 دینا طے کیا ہے۔وہ راضی بھی ہو گیے ۔۔

؛راضی ہوں تو گوشۂ عافیت بھی ان سے پورا کرا لوں''۴۹؎

یہاں خود سحر ہتگامی کے حوالے سے پوری بات کی توضیح بھی ہو جاتی ہے کہ گئودان کا ترجمہ انھوں نے خود ہندی سے اردو میں کیا تھا۔لیکن 1977ء میں ڈاکٹر جعفر رضا نے اپنے مقالہ ''پریم چند فن اور تعمیرِ فن'' کے نام سے پہلی بار شائع ہوا مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ پریم چند کے اس عقیدت مند نے میرے علاوہ نارائن نگم اور سحر ہتگامی کے بیانات سے اختلاف کیا۔لیکن اس کے علاوہ سحر ہتگامی کا ایک اقتباس دیکھیے جس میں خود انھوں نے صداقت سے کام لیا اور سچ بات پیش کی ہے۔

''منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصے اور کئی ناول مثلاً رنگ بھوم، کرم بھوم، پریم آشرم، نرملا وغیرہ ہندی سے اردو میں لکھے جو چھپ چکے ہیں۔ابھی ان کا آخری ناول گئودان بھی مکتبہ جامعہ سے شائع ہو چکا ہے جس کا اردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔''۵۰؎

مسعود حسین خاں نے پریم چند کے مشیرِ خاص اور ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم کا حوالہ بھی پیش کیا ہے تاکہ گئودان کے ہندی ہونے کا حوالہ مستند ہو جائے اور سارے ادیبوں اور نقادوں پر اس کی وضاحت بھی ہو جائے مسعود حسین کہتے ہیں کہ پریم چند کا انتقال 8/اکتوبر 1936ء کو ہوا اور ان کے انتقال کے بعد دیا نرائن نگم ''زمانہ'' کے پریم چند نمبر میں گئودان کے بارے میں پہلی بار یہ اطلاع دی ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

> ''1936ء میں آپ کا آخری ناول ''گئودان'' بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا، اس کی دو ہزار جلدیں بِک چکی ہیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا۔''۵۱

اس اقتباس کے باوجود جعفر رضا گئودان کو ترجمہ ماننے سے انکار ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ اپریل 1980ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پریم چند پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا مسعود حسین کہتے ہیں کہ مجھے اس کے ایک جلسے کی صدارت سونپی گئی اور وہاں پریم چند کو چاہنے اور ماننے اور ان پر کام کرنے والوں کی کثیر تعداد تھی جن میں جعفر رضا اور قمر رئیس بھی موجود تھے۔ اس جلسے کے صدارتی خطبے میں گئودان اور گودان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گئودان اردو ناول نہیں بلکہ گودان کا اردو ترجمہ ہے جس کو سحر ہتگامی نے پریم چند کے انتقال کے بعد ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس پر جعفر رضا بہت غصہ ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے سحر ہتگامی کی کردار کشی کرتے ہوئے ان کو چور تک کہا۔ جب اتنی شہادتیں موجود ہیں تو ضد پر اڑے رہنا یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔ جب کہ اس کی وضاحت منشی پریم چند نے کی۔ اور پھر دیا نرائن نگم نے بھی کی اور امرت رائے نے اس پر اپنی خاموشی کو بہتر سمجھا لیکن ان چیزوں کے باوجود جعفر رضا نے اہلِ بھوپال کی فراہم کردہ تازہ معلومات سے اغماض کرتے ہوئے اپنی تصنیف ''پریم چند فن اور تعمیرِ فن'' کے لیے نئے ایڈیشن 1980ء میں اپنی باتوں کو دہراتے ہوئے اور اسی بحث پر قائم رہتے ہوئے پرانی ڈگر قائم رکھی اور اسی پر اڑے رہے۔ اس بار ان کی زد پر زمانہ کے موقر ایڈیٹر اور پریم چند کے جگری دوست

دیانرائن نگم تھے۔

''پریم چند ادبیات کے بعض دیگر مباحث کی طرح گئو دان کے متعلق
غلط فہمیوں کی ابتدا منشی دیانرائن نگم کے بیانات سے ہوتی ہے۔'' ۵۲؎

مسعود حسین کہتے ہیں کہ جعفر رضا کے خیال میں ''زمانہ'' کی خبر بھی اسی قسم کا بیان ہے۔ حالانکہ جعفر رضا اردو گئو دان کی پریم چند کے انتقال سے پہلے موجودگی کی شہادت بھی انھیں کے بیانات سے فراہم کرتے ہیں۔ اور مترجم کی تلاش اور سحر صاحب کی امداد کو اردو ترجمہ شائع ہونے سے تضاد رکھتے ہیں۔ لیکن جو نہ مانے اس کو کہاں تک منایا جا سکتا ہے۔ جعفر رضا نے کئی شواہد اور کئی بنیادی باتوں کے باوجود گئو دان کو اردو ہی مانا حالانکہ ان کے سامنے مذکورہ سبھی چیزیں آئی ہیں لیکن جعفر رضا اپنے خیال میں گم ہیں۔ اور یہی نہیں ایک اور نامور ادیب عبدالستار دلوی بھی مسعود حسین کی باتوں کو استقامت دیتے ہیں عبدالستار دلوی 8 اگست 1981ء کی ''ہماری زبان'' میں لکھتے ہیں۔

''پریم چند کا مشہور ناول ''گئو دان'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی
تحقیق کے مطابق تصنیف نہیں بلکہ اردو ترجمہ ہے۔'' ۵۳؎

مسعود حسین کہتے ہیں کہ بات صرف گئو دان پر ہی ختم نہیں ہوتی سحر ہتگامی کا یہ دعویٰ ہے کہ گئو دان کے علاوہ چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت اور نرملا ان سبھی ناولوں کو سحر ہتگامی نے اردو ترجمہ کیا ہے اور معتبر بات یہ ہے کہ پریم چند خود گوشۂ عافیت کے تعلق سے دیانرائن نگم کو 1931ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں

''حضرت سحر کو میں نے ۲۰۰ دینا طے کیا ہے۔ وہ راضی بھی ہو گئے راضی
ہوں تو گوشۂ عافیت بھی کرا لوں'' ۵۴؎

اب اس بات سے سارے نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ گوشہ عافیت، چوگانِ ہستی اور گئو دان اردو میں سحر ہتگامی کے کیے ہوئے ترجمے ہیں۔ مسعود حسین نے ساری باتوں کو واضح کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گئو دان جس کو جعفر رضا اردو کہنے پر بضد ہیں وہ اردو نہیں بلکہ ہندی سے اس کا اردو ترجمہ ہے۔ مسعود حسین خاں ماہرینِ لسانیات ہیں اور بہترین محقق بھی۔ جس کے ذریعے انہوں نے سارے نتیجوں کو بہتر طریقے سے

نمایاں کیا ہے اور پریم چند شناسوں میں اپنا نام بھی درج کرایا ہے اس کام کے لیے مسعود حسین کو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔

شیورانی دیوی:

پریم چند پر اردو اور ہندی کے بہت سے ادیبوں نے روشنی ڈالی اور اپنے اپنے اعتبار سے ہر کسی نے ان کی شخصیت کو جانچنے کی کوشش کی۔ کسی نے ان کی خدمات کا جائزہ لیا کسی نے ان کے حالات پر تبصرہ کیا، کسی نے ان کو ناول اور افسانہ کے دائرہ میں رکھ کر ان کا تجزیہ کیا، کسی نے ان کو سیاسی طریقے سے سمجھا اور کسی نے ان کو ہندی کا ادیب جانا۔ کسی نے اردو کا عالم کسی نے ان کی خدمات کو قلمبند کیا تو کسی نے ان کو فنی طور طریقے سے نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ جس کے چلتے پریم چند کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑی اور طرح طرح کے خیالات سے پریم چند کی ساری حرکات وسکنات کا خلاصہ ہمارے سامنے پیش ہوا۔ پریم چند پر آج تک تقریباً سیکڑوں ہزاروں کتابیں مضامین وغیرہ شائع ہو چکے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جس طرح شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا مرتبہ تھا اور ان پر نہ جانے کتنے عالموں ادیبوں اور پی ایچ ڈی اسکالرس اپنے مقالے اور مضامین کے ذریعے کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہے ہیں اس طرح پریم چند کا مرتبہ بھی اردو نثر میں ہے اس لیے پریم چند پر ان کے زمانے سے لے کر آج تک مصنفین کا قلم برابر اپنی رفتار کے ساتھ رواں دواں ہے اور آج بھی پریم چند کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی پہلو نکال کر اس کو موضوع بحث بنایا جا رہا ہے اور پریم چند کی عظمت کو اور بلند و بالا کیا جا رہا ہے اور آگے بھی توقع ہے کہ پریم چند پر تحقیق وتنقید کے ابواب کھلتے رہیں گے اور ان کی تحریروں کو تحقیق کی عینک لگا کر جانچا اور پرکھا جائے گا۔

پریم چند پر تو بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کے اعتبار سے سمجھا ہے لیکن تھوڑا سا یعنی دروازے کے باہر سے صحن کے اندر سے نہیں۔ اسکو صرف وہی کر سکتی ہیں جو پریم چند کے ساتھ قدم بہ قدم رہیں یعنی شیورانی دیوی جو پریم چند کی شریکِ حیات تھیں اور پریم چند ان کو حد سے زیادہ پیار بھی کرتے تھے۔

پریم چند کی پہلی بیوی جو پریم چند کے مزاج کے مطابق نہیں تھیں اور پریم چند سے لڑتی جھگڑتی تھیں اور پریم چند کو روزانہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا جس سے پریم چند کی اپنی ذاتی زندگی بھی الجھنوں میں

گزرتی تھی۔اور پریم چند پراس کے غلط اثرات بھی یوں پڑتے تھے کہ ان کو لکھنے پڑھنے میں پریشانیوں کا سامانا کرنا پڑتا۔آخرکار پریم چند کی زندگی میں ایک خوشگوار لمحہ تب آیا جب پہلی بیوی پریم چند کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے میکے چلی گئی اور 1906ء میں پریم چند نے دوسری شادی شیورانی دیوی سے کر لی۔ حالانکہ شیورانی کی شادی بھی پریم چند سے دوسری تھی اس لیے کہ شیورانی کی جس سے ہوئی تھی وہ شادی کے تین چار مہینے کے بعد انتقال کر گیے نتیجہ کے طور پر پریم چند کی شیورانی دیوی سے شادی ہوگئی۔شیورانی بہت سمجھ بوجھ فہم وفراست کی مالک اور ایک عقلمند بیوی تھیں جنھوں نے پریم چند سے پیار کر کے پریم چند کی زندگی کو ایک حسین جنت بنادیا جس کے ذریعے پریم چند ہمیشہ خوش رہتے اور شیورانی بھی اتنے بڑے ادیب اور دانشور کو پاکر مسرت کا اظہار کرتی رہتی تھی۔شیورانی جس دن سے پریم چند کے گھر میں آئی تھیں اس دن سے جیسے گھر میں کوئی دیوی آگئی ہو شیورانی دیوی بھی کسی دیوی سے کم نہیں تھیں۔انھوں نے پریم چند کی زندگی کو سجایا اور سنوارا اور اپنے تئیں کبھی پریم چند کو تکلیف نہیں پہونچنے دی۔ پریم چند کے ساتھ شیورانی دیوی تقریباً تیس سال تک رہیں اس لیے انھوں نے پریم چند کو بہت اچھے طریقے سے جانا اور سمجھا۔شیورانی پریم چند کے ساتھ سکھ میں بھی رہیں اور دکھ میں بھی۔رات میں بھی رہیں اور دن میں بھی اس لیے پریم چند کی وفات کے بعد شیورانی نے یہ سوچا کہ جو لمحات پریم چند کے ساتھ گزارے ہیں ان کو قلمبند کر کے پریم چند کی زندگی کے واقعات امر کردئے جائیں تاکہ آئندہ لوگ ان پر جب کام کریں تو پوری وضاحت ان کے سامنے پیش رہے۔اس طرح بہت سے ادیبوں کی طرح شیورانی نے بھی قلم اٹھایا اور پریم چند کی زندگی کو تحریری شکل دینے لگیں حالانکہ یہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں اور نہ تو یہ کسی اصول وضابطے سے تعلق رکھتی تھی، نہ تو فنی اعتبار سے کچھ معلومات تھی۔مگر پھر بھی انھوں نے جو کام کیا ہے اس سے بڑی حقیقت منکشف ہوئی اس لیے گھر کے باہر کے حالات تو حقیقتاً کچھ اور ہوتے ہیں اور گھر کے باہر کچھ الگ۔اس لیے شیورانی نے جو بھی لکھا بہت خوب لکھا۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے اپنی تحریروں کو خوشگوار بنانے کی کوشش جگہ جگہ نظر آتی ہے۔شیورانی دیوی پریم چند کی سوانح لکھ رہی تھیں اس لیے کہ پریم چند نے اپنی زندگی میں کوئی سوانح حیات نہیں تحریر کی تھی جس کو ضروری سمجھ کر شیورانی نے یہ قدم اٹھایا تاکہ لوگ ان کو بھول نہ جائیں۔شیورانی کے اندر جو لکھنے کا یہ جذبہ پیدا ہوا وہ کسی

کالج یا اسکول میں پڑھ کر نہیں ہوا بلکہ پریم چند کی صحبت میں رہ کر انھوں نے سیاسی، سماجی، اور معاشی سوجھ بوجھ حاصل کی تھی اسلیے پریم چند کی سوانح عمری لکھنے کو ضروری سمجھا اور پھر سوانح عمری سمجھ کر اس انداز میں لکھی کہ پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے پریم چند ہمارے سامنے بیٹھے ہوں اور ان سے مکالماتی انداز سے گفتگو جاری ہو یہ خوبی ہے شیورانی کی کہ انھوں نے پریم چند کو مکالماتی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھنے میں دلچسپی اور لطف پیدا ہو جاتا ہے اور خاص طور سے زبان نے اس مکالمے یا اس تحریر کا حسن دوبالا کر دیا ہے جس کو شیورانی اور پریم چند بولتے تھے یا جو دیہات میں بولی جاتی تھی جس کو علاقائی زبان بھی کہتے ہیں۔ شیورانی نے پریم چند کی زندگی کو مکالماتی اندز سے پیش کیا ہے، کہ اس زندگی اور اس وقت اور حالات کا تجزیہ کر سکیں جب وہ پریم چند کے ساتھ تھیں۔ شیورانی نے اپنی کتاب ''پریم چند گھر میں'' بڑی سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے جیسا کہ اوپر کی تحریروں میں گزر چکا ہے تصنع اور بناوٹ سے ان کی زبان پاک ہے۔ بس جو کچھ بھی انھوں نے لکھا ہے وہ سب پریم چند کی صحبتوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی نثر بالکل قلم برداشتہ اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے پریم چند کے مداحوں اور خیر خواہوں کی عینک سے پریم چند کو نہیں دیکھا بس انھوں نے جو کچھ بھی لکھا یہ ان کا اپنا ذاتی مطالعہ ہے نہ اس میں جھوٹ ہے اور نہ مبالغہ بس حقیقت پسندی ہے جس طرح پریم چند ہمیشہ حقیقت نگاری کو ہی اپنی تحریروں میں جگہ دیتے تھے، بالکل اسی طرح شیورانی دیوی نے بھی کیا شیورانی نے خود ایک جگہ لکھا ہے ہم دونوں ''ایک ہی ناؤ کے یاتری'' تھے گویا انھوں نے پریم چند کے ساتھ رہ کر ہر طرح کے طوفانوں کو جھیلا تھا اس لیے طرح طرح کے مشاہدات بھی شیورانی کے یہاں موجود ہیں اور شیورانی کے قلم سے نکلی ہوئی بات قلم کی بات نہیں بلکہ دل کی بات ہوتی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اپنی تصنیف ''پریم چند گھر میں''، لکھتی ہیں:

> ''کتاب کے لکھنے میں میں نے صرف ایک بات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا ہے اور وہ ہے ایمانداری، سچائی، واقعات جیسے جیسے یاد آتے گئے میں انھیں لکھتی گئی ہوں۔ انھیں سنوارنے کا نہ مجھے وقت تھا نہ حوصلہ''۵۵؎

شیورانی اپنی یہ کتاب ''پریم چند گھر میں'' کے نام سے لکھی ہے لیکن پریم چند کے انتقال کے بعد کے واقعات اس میں تقدیم وتاخیر سے آئے ہیں وہ خود کہتی ہیں کہ کتاب لکھتے وقت مجھ کو جو واقعہ جب یاد آیا اس کو میں نے قلم بند کردیا اسلیے اس میں کچھ ابتدائی قصے بعد میں اور بعد کے قصے ابتدائی طور پر بیان ہوگیے ہیں۔ شیورانی دیوی اس کتاب کے تعلق سے کہتی ہیں کہ اس کے لکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ ایک بڑے ادیب کی شہرت دور دراز تک پھیلانا ہے بلکہ اس کے ذریعے ان کا تعارف کرانا مقصد ہے ان کے الفاظ یوں ہیں۔

> ''اس کتاب کو لکھنے کا مقصد اس مہمان آتما کی شہرت کو پھیلانا نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر سوانح عمریوں کا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو گھریلو واقعات کی جھلکیاں ملیں گی۔ لیکن ان جھلکیوں کی ادبی قیمت بھی اس لحاظ سے ہے کہ ان سے اس عظیم ادیب کی شخصیت کا تعارف ہوتا ہے۔ انسان ہونے کے زاویے سے بھی وہ شخص کتنا بڑا، کتنا عظیم تھا یہی بتلانا اس کتاب کا مقصد ہے۔ اور یہ بتانے کا حق جتنا مجھے ہے اتنا اور کسی کو نہیں کیونکہ انھیں کے لفظوں میں ہم دونوں ایک ہی ناؤ کے یاتری تھے اور ہم نے ساتھ ساتھ ہی زندگی کے سب طوفانوں کو جھیلا تھا۔ دکھ میں اور سکھ میں میں ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے پہلو میں تھی۔ آدمی کی پہچان تکلیف کے بھنور میں پڑ کر ہوتی ہے اور چونکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ان تکلیفوں سے لڑے، ساتھ ساتھ روئے اور ہنسے اسی لیے مجھے ان کی عظمت کا تھوڑا سا اندازہ لگانے کا موقع ملا۔'' ۵۶

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیورانی نے جو باتیں اور جو چیزیں پیش کی ہیں اور پریم چند کے انتقال کے بعد تحریر کی ہیں ہوسکتا ہے کہ ان میں کچھ زبان اور لفظوں کی تبدیلی ہوگئی ہو بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ آج کی کہی ہوئی بات کل یاد نہیں رہتی اور یہ تو کئی سالوں کے بعد کی بات ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خیال تو وہی ہے لیکن لفظوں کی تبدیلی مکالمات پیش کرنے لیے ہے۔ اسلیے کہ پریم چند ایک نہایت ذی علم اور دانشور

انسان تھے اس لیے گفتگو بھی اپنے حساب سے کرتے رہے ہوں گے لیکن یہ بھی خیال کیا جا رہا ہے کہ پڑھا لکھا آدمی جس ماحول میں جاتا ہے تو اسی اعتبار سے باتیں بھی کرتا ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ گھر میں پریم چند بالکل سادہ اور آسان زبان میں شیورانی سے گفتگو کرتے رہے ہوں پریم چند شیورانی کے تعلق سے ایک جگہ کہتے ہیں کہ وہ نہایت باہمت اور حوصلہ مند تھیں اور مجھ سے بہت زیادہ محبت بھی کرتی تھیں یہاں ایک اقتباس دیکھیے:

> ''وہ ایک نڈر، ہمت ور، مصلحت نا آشنا، پر خلوص خاتون ہیں۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے والی، لیکن ضرورت سے زیادہ مضطرب مزاج، وہ عدمِ تعاون تحریک میں شریک ہوئیں اور جیل گئیں۔ میں ان کے ساتھ خوش ہوں۔ اس کی تمنا نہیں کرتا جو وہ نہیں دے سکتی ہیں۔ انھیں لچکا نہیں جاسکتا ہے چاہے وہ اس میں ٹوٹ ہی جائیں۔''۵۷

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت جو سیاسی حالات تھے اس نے نہ صرف پریم چند کو متاثر کیا تھا بلکہ اس کا اثر شیورانی کے دل پر بھی ہوا اس سلسلے میں وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت انگریزی حکومت کا بول بالا تھا اور جو اس کی مخالفت کرتا تھا وہ سیدھا جیل جاتا تھا۔ اور اس کی مخالفت کرنا بزدلوں کا کام نہیں ہے جس کے دل کے اندر ضمیر زندہ ہو جس کے جذبات میں گرمی ہو وہی انگریزی فوج یا کسی کی بھی مخالفتکر سکتا ہے اور یہ پورا جذبہ شیورانی کے اندر تھا۔ ورنہ وہ جیل کیا جب وقت پڑا تھا تبھی وہ پریم چند کو چھوڑ کر اپنے میکے جاسکتی تھیں۔ شیورانی نے پریم چند کے سفر کا احاطہ بھی اپنی اس کتاب ''پریم چند گھر میں'' میں کیا ہے۔ اس کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ شیورانی نے یہ کتاب بڑی دلچسپی اور دل جمعی کے ساتھ تصنیف کی ہے اور جہاں بھی جو واقعہ پیش آیا اس کو بھی بہتر طریقے سے موتیوں کی لڑی کی طرح پرو دیا ہے۔ جو زندگی بھر ساتھ رہے اور اس کو اپنے خاوند سے اس قدر محبت ہو تو وہ اس کے ہر عمل سے واقف ہوتا ہے۔ اس طرح شیورانی تھیں۔ اس لیے جہاں جہاں بھی پریم چند کا قیام رہا ان سبھی چیزوں کی تفصیل مکمل طریقے سے اس میں نمایاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شیورانی دیوی پریم چند کی زندگی میں شادی کے بعد آئیں اور شادی کا مطلب یہ ہے 15 یا 17 سال بعد وہ پریم چند کی خدمت میں آئیں لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں پریم چند

کی پوری زندگی کو اجاگر کیا ہے بچپن کے واقعات سے لیکر موت کی آخری سانس تک کے سارے واقعات نشیب وفراز کے ساتھ قلمبند ہیں۔ بچپن کے واقعات میں ایک چھوٹے سے واقعے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے جہاں پریم چند بچوں کے ساتھ حجامت والا کھیل کھلتے ہوئے ایک لڑکے کا کان کاٹ لیتے ہیں۔ اس پر وہ لڑکا روتا ہوا اپنے ماں کے پاس گیا تو اس کی ماں پریم چند کے گھر شکایت لے کر آئی تو اس وقت پریم چند اپنے گھر کی کھڑکی میں جا کر چھپ گیے تھے۔ اس پر پریم چند کی ماں نے پریم چند کو چار جھانپڑ مارے تھے دیکھئے اقتباس:

''اس لڑکے کے کان تو نے کیوں کاٹے؟ ماں نے کہاں۔

''میں نے اس کے کان نہیں کاٹے بلکہ بال بنائے ہیں۔''

''اس کے کان سے تو خون بہہ رہا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ میں نے بال بنائے''

''سب ہی تو اسی طرح کھیل رہے تھے۔''

''اب ایسے نہ کھیلنا''

''اب کبھی نہیں کھیلوں گا''۵۸

ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے شیورانی دیوی لکھتی ہیں ایک مرتبہ پریم چند کے چچا نے سَن بیچا اور وہ روپیہ لاکر طاق پر رکھ دیا۔ پھر انھوں نے اپنے چچیرے بھائی سے صلاح کی وہ روپیہ اٹھالائے اور جا کر بارہ آنے مولوی صاحب کی فیس دے دی اور چار آنے کے امرود ریوڑی وغیرہ خرید کر کھائی۔ چچا کو جب ضرورت ہوئی تو وہ روپیہ ڈھونڈنے لگے مگر نہیں ملا تو انھوں نے ہم دونوں سے پوچھا کہ روپیہ چرا کر لائے ہو توان لوگوں نے کہا۔ کہ ہاں، اس پر پوچھا کہ روپیہ کہاں خرچ کیے تو انھوں نے بتایا کہ مولوی صاحب کی فیس دی ہے اس پر وہ (چچا) ان دونوں کو پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس آئے اور مولوی صاحب سے پوچھا کہ ان لڑکوں نے آپ کو فیس دی ہے تو کہا کہ ہاں بارہ آنے دیا ہے۔ تو پھر ان سے پوچھا کہ چار آنے اور کہاں ہیں تو انھوں نے کہا کہ امرود ریوڑی وغیرہ لیکر کھالیا ہے۔ اس پر چچا نے اپنے لڑکے کو مارا اور جب اس کا علم میری

ماں کو گھر پر ہوا تو میری ماں نے مجھ کو مارا۔تب میری چچی نے دوڑ کر مجھ کو بچایا۔اور پریم چند نے شیورانی کو یہ بھی بتایا کہ میرے چچا نے مجھ کو کیوں نہیں مارا اس کا علم مجھے نہیں ہے۔شیورانی دیوی نے ''پریم چند گھر میں'' میں پریم چند کی زندگی کے سارے مضامین شامل کیے ہیں جو ان کی نظر سے گزرے اور جو پریم چند نے شیورانی دیوی سے بیان کیے سبھی کو بڑی تفصیل سے پریم چند کی شریکِ حیات نے قلمبند کیا ہے یہاں تک کہ پہلی شادی کا حال بھی بیان کیا ہے جس کو پریم چند شیورانی سے پہلے بیاہ کر لائے تھے۔اور پریم چند کی جہاں جہاں تقرری ہوتی ساری چیزیں تفصیل سے اس میں درج ہیں۔اگر کوئی بھی پریم چند کے تعلق سے جاننا چاہے تو اس کو ضروری ہے کہ شیورانی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' پڑھ لے پوری پریم چند کی زندگی نکھر کر سامنے آجائے گی اور اس میں جو بھی باتیں ہیں وہ سب بغیر کس مبالغے اور غلو کے بیان کی گئی ہیں۔مکالماتی انداز میں شیورانی نے لکھا اور خوب لکھا حالانکہ یہ سب باتیں پریم چند کے بعد کی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے مکالمے شیورانی نے ریکارڈ کر لیے تھے مثال کے طور پر ایک حوالہ دیکھئے جو شیورانی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔شیورانی کہتی ہیں کہ کنوار کا مہینہ تھا اور انگریزی حساب سے (ستمبر، اکتوبر) اس وقت آپ کو پیچش ہوگئی اور اس پیچش کی بیماری میں دو تین مہینے گزر گیے لیکن صحت ٹھیک ہونے کی نام نہیں لے رہی تھی اور شیورانی کہتی ہیں کہ جو پیسے میں انھیں دوا لانے کے لیے دیتی وہ اسے پریس کے کام میں خرچ کر دیتے اور دوا ادھر ادھر کے غیر ذمہ دار ڈاکٹروں سے لیتے جس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔اس طرح دوا کھاتے ڈھائی تین مہینے گزر گیے آخر کار شیورانی کہتی ہیں کہ جب میں نے یہ جان لیا کہ طبیعت اچھی نہیں ہو رہی ہے تب میں ان سے کہا کہ ''چلئے دیہات'' آپ بولے ''پریس کا کام کون دیکھے گا؟''

''یہاں جب طبعیت اچھی نہیں ہوری ہے تو کیا کیجئے؟ میں نے کہا۔

آپ بولے ''مگر کام بھی مجھے بہت کرنا ہے۔''

میں نے جھونجھل کر کہا ''کام جائے بھاڑ میں، ایک نہ ایک تو سدا لگا ہی رہے گا۔''

''کیا بھاڑ میں کام چلا جائے گا؟'' آپ نے کہا ''چھٹی تو اسے پورا کرنے سے ہی ہوگی۔''

جب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے تو میں نے کہا

’’آپ رہیئے، میں خود دیہات جا رہی ہوں۔‘‘

بولے، ’’میرے لیے سامان رکھ کر جا سکتی ہو۔‘‘

بچے میرے ساتھ جائیں گے سامان تو سب پڑا رہے گا۔‘‘۵۹؎

شیورانی کہتی ہیں کہ باہر میرے جیٹھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بیٹی سے کہا ’’جا کر بڑے بابو سے کہو مجھے بھی شام کو گھر لیتے چلیں۔‘‘ اور جب بیٹی نے ان کا پیغام پہونچا دیا تو وہ شام کو آنے کا کہہ گیے۔

شیورانی کہتی ہیں کہ جب پریم چند پریس جانے لگے تو بولے

’’سامان سب لیتی چلنا۔ میں بھی چلوں گا۔

آپ رہئے میں نے کہا آپ کیوں جانے لگے‘‘

آپ بولے میں سمجھتا تھا، میرے ایسا کہنے پر تم نہیں جاؤ گی،‘‘

میں نے کہا’’ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ میرے بنا یہاں نہیں رہ سکتے‘‘ ۶۰؎

اس طرح کے مکالماتی گفتگو سے پوری کتاب شیورانی نے آراستہ کر رکھی ہے۔ اگر مکالماتی انداز شیورانی نہ اپناتی تو کتاب کو پڑھنے میں لذت نہ محسوس ہوتی اس لیے کہ اس سے پریم چند کا چلتا پھرتا زمانہ سامنے گھومنے لگتا ہے اور قاری بھی پریم چند کی باتیں بڑے غور سے سننے میں مشغول ہو جاتا ہے اور خود کو پریم چند کا ہمراز محسوس کرنے لگتا ہے گویا شیورانی کے بڑے والہانہ اور پر تپاک طریقے سے پریم چند کا تعارف پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے مکالماتی اندز سے قاری کو لذتِ کلام سے آشنا کر دیا ہے اور اس کے ساتھ قاری کی دلچسپی کے سامان بھی مہیا کر دیئے ہیں شیورانی نے پریم چند کے تعلق سے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی صرف ایک جھلک اس مقالے میں دکھائی گئی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شریمتی شیورانی کی کتاب ’’پریم چند گھر میں‘‘ پریم چند کی زندگی اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جس سے پریم چند کی زندگی کے بہت پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ پریم چند کی بہترین سوانح عمری بھی ہے۔ بلکہ شیورانی دیوی نے ان کے کرداروں کے حوالے سے شخصیت کی لامتناہی بازیافت اور بہت سے نازک، لطیف حساس پہلوؤں کو اس فنکاری سے پیش کیا ہے کہ پریم چند کے

قارئین پر کرداروں اور موضوعات کے حوالے سے ان کی ذات اور فن کے مختلف رنگوں کے شیڈ سامنے آجاتے ہیں۔

ہندی اردو ادب کے ناقدین نے انھیں (پریم چند کو) عام طور پر حقیقت نگار، دیہاتی زندگی کے نبض شناس، کسانوں اور محنت کش طبقے کے ترجمان اور سوشل ریفارمر کے طور پر پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں اصلاح اور افادیت کے پہلوؤں کی تلاش کی گئی ہے۔ زندگی اور شخصیت کے حوالے سے بھی ان کی سادگی، خلوص، دیانت داری اور انسانی دردمندی کے نقوش اجاگر کیے ہیں۔ مگر شریمتی شیورانی دیوی نے پریم چند کو الگ زاویے سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ ہنس راج رہبر، ’’پریم چند‘‘ پیش لفظ، سید احتشام حسین، مکتبہ جامعہ دہلی، 1980ء، ص: 11,12

۲۔ ایضاً، ص: 13

۳۔ ایضاً، ص: 20

۴۔ ایضاً، ص: 20

۵۔ ایضاً، ص: 29,30

۶۔ ایضاً، ص: 61,62

۷۔ ایضاً، ص: 65

۸۔ ایضاً، ص: 83

۹۔ ایضاً، ص: 180

۱۰۔ مانک ٹالا، ’’پریم چند اور تصنیفِ پریم چند کچھ تحقیقی گوشے‘‘، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1985ء، ص: 17

۱۱۔ مانک ٹالا، ’’پریم چند حیاتِ نو‘‘ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1993ء، ص: 393

۱۲۔ مانک ٹالا، ’’پریم چند کچھ نئے مباحث‘‘، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1988ء، ص: 9

۱۳۔ مانک ٹالا، ’’آخری نغمہ‘‘، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2010ء، ص: 241

۱۴۔ مانک ٹالا، ’’پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین‘‘، مکتبہ جدید، دہلی، 2001ء، ص: 28

۱۵۔ مانک ٹالا، ’’پریم چند حیاتِ نو‘‘ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1993ء، ص: 395

۱۶۔ ایضاً، ص: 395

۱۷۔ مدن گوپال ’’قلم کا مزدور‘‘ مکتبہ جامعہ، دہلی، 2011ء، ص: 5,6

۱۸۔ مدن گوپال ''پریم چند کی آپ بیتی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015، ص:72

۱۹۔ مدن گوپال ''قلم کا مزدور'' مکتبہ جامعہ، دہلی، 2011، ص:16

۲۰۔ پریم گوپال متّل ''پریم چند شناس مدن گوپال' ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008، ص:100

۲۱۔ ایضاً، ص:140

۲۲۔ جعفر رضا ''پریم چند اور تعمیر فن''، شاہ گنج، الہ آباد، 1977، ص:71,72

۲۳۔ پریم چند ''چٹھی پتری'' ج ۲، ص:129

۲۴۔ جعفر رضا ''پریم چند فن اور تعمیر فن''، شاہ گنج، الہ آباد، 1977، ص:62

۲۵۔ ایضاً، ص:142

۲۶۔ جعفر رضا ''پریم چند کہانی کا رہنما، شاہ گنج، الہ آباد 1969، ص:69

۲۷۔ ایضاً، ص:236

۲۸۔ ایضاً، ص:237

۲۹۔ ایضاً، ص:237,238

۳۰۔ محمد حسن ''پریم چند زمانہ، ذہن اور آرٹ'' رسالہ آج کل، دہلی، جلد ۳۹، شمارہ ا، اگست 1980، ص:5

۳۱۔ ایضاً، ص:5

۳۲۔ ایضاً، ص:5

۳۳۔ ایضاً، ص:6

۳۴۔ ایضاً، ص:7

۳۵ ایضاً، ص:7

۳۶۔ ڈاکٹر محمد حسن، ''ادبی تنقید''، ''پریم چند کا ورثہ' ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، 1954، ص:143

۳۷۔ ایضاً، ص:144

۳۸۔ ایضاً، ص:151

۳۹۔ قمر رئیس، ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' دہلی، 2012، ص:115

۴۰۔ ایضاً، ص:143

۴۱۔ اردو فکشن کی تنقید اور ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم بشمول قمر رئیس: ایک زندگی مرتب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ص: 360

۴۲۔ قمر رئیس، ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' دہلی، 2012، ص:193

۴۳۔ ایضاً، ص:200

۴۴۔ قمر رئیس ''پریم چند کی زندگی میں رومان'' مشمولہ، مرتبہ قمر رئیس، شخصیت اور کارنامے، ص:431

۴۵۔ اردو فکشن کی تنقید اور ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم بشمول قمر رئیس: ایک زندگی مرتب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ص:364

۴۶۔ پروفیسر قمر رئیس، ''تعبیر و تحلیل (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، پریم چند کے افسانے ایک جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1996، ص:71

۴۷۔ پروفیسر قمر رئیس، ''تعبیر و تحلیل'' پریم چند کے ہیرو ایک سماجیاتی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1996، ص:94

۴۸۔ پروفیسر آفاق احمد، ''پریم چند شناسی، حرفِ آغاز، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، 1994 ص:12

۴۹۔ پروفیسر مسعود حسین خان، ''گودان تا گئودان پریم چند شناسی، آفاق احمد، 1994، ص:16

۵۰۔ ایضاً، ص:17

۵۱۔ ایضاً، ص:16

۵۲۔ ڈاکٹر جعفر رضا، ''پریم چند فن اور تعمیر فن، شاہ گنج، الہ آباد، 1980ء، ص:260

۵۳۔ پروفیسر مسعود حسین خان، ''گودان تا گئودان پریم چند شناسی، آفاق احمد، 1994، ص:21

۵۴۔ ایضاً، ص:22

۵۵۔ شیورانی دیوی، ’’پریم چند: گھر میں‘‘، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2007، ص:19

۵۶۔ ایضاً، ص:19

۵۷۔ ایضاً، ص:23

۵۸۔ ایضاً، ص:63

۵۹۔ ایضاً، ص:147

۶۰۔ ایضاً، ص:147

باب چہارم

پریم چند تنقید: 1980 کے بعد

پریم چند تنقید:1980 کے بعد

بلا مبالغہ اردو فکشن کا سب سے محترم نام پریم چند ہے۔جس طرح سے انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ اردو فکشن میں بیسویں صدی کے ہندوستان کی عکاسی کی ہے اور جن مسائل کو انھوں نے اٹھایا ہے، ویسی نظیر کسی اور فنکار کے یہاں نہیں ملتی خواہ اس کا تعلق کسی بھی ادب سے ہو۔ پریم چند ہندوستان کے محسن، شارح انسانیت کے پیکر اور ترجمان تھے۔جس طرح انھوں نے ناول کے وقار کو توانائی بخشی وہیں افسانے کو گلے سے لگایا جس طرح سے انھوں نے مشہور ناول ''گئودان'' لکھا تو وہیں ''کفن'' جیسا لازوال افسانہ لکھ کر اپنے فن کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ چنانچہ عالمی ادب کے سامنے اردو فکشن کا قد بلند ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی پرورش و پرداخت اردو زبان وتہذیب کے زیر سایہ ہوئی مگر ادھیڑ عمر میں جا کر ہندی زبان کو بھی گلے سے لگایا۔اس طرح اردو ہندی کے امتزاج سے ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔جو زبان وادب کے تعلق سے بیش بہا تحفہ ہے۔

ہر بڑے فنکار کی طرح پریم چند نے بھی مختلف النوع اصناف ادب میں طبع آزمائی کی اور ان کے رشحاتِ قلم سے مضامین، سوانح عمریاں ،تبصرے اور ڈرامے وغیرہ مستقل طور پر مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ پریم چند تنقید کا میدان ایک دشوار کن میدان ہے اس میدان میں گامزن ہونے والے زیادہ تر محققین کا عمل دخل رہا۔اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منشی پریم چند کی شخصیت اور فن پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اور ابھی تک لکھنا جاری ہے ان میں پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، قمر رئیس، قلم کا مزدور، مدن گوپال، قلم کا سپاہی، امرت رائے، پریم چند گھر میں، شریمتی شیورانی دیوی یہ وہ نایاب کتابیں ہیں جن کا ذکر پریم چند تنقید میں اکثر لیا جاتا ہے۔اور ان کا شمار پریم چند سے متعلق اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ان کے علاوہ پریم چند کہانی کا رہنما، پریم چند فن اور تعمیر فن از جعفر رضا، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار از شمیم نکہت، گئودان تا گودان از ڈاکٹر مسعود حسین خاں ان کے علاوہ ہندوستانی ادب

کے معمار کے سلسلے کا مونوگراف بھی پریم چند کے فن اور شخصیت پر شائع ہوا۔ان کتابوں کے علاوہ بہت سے ادبی جرائدورسائل نے پریم چند نمبر نکالا اوران پر گوشے شائع کیے۔ان رسالوں میں چار رسائل کے نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ماہنامہ زمانہ کانپور 1936ء جو پریم چند کے انتقال کے فوراً بعد ان پر شائع ہوا۔ماہنامہ سہیل (گیا) کا پریم چند فن اور شخصیت پر خاص نمبر 1980ء میں شائع ہوا۔فروغ اردو (لکھنو) جس کو سعادت علی صدیقی نے مرتب کیا۔ماہنامہ آجکل (دہلی) سے پریم چند نمبر 1980ء میں شائع کیا۔ان کے علاوہ ہنس راج رہبر کی کتاب، پریم چند،1958ء میں شائع ہوئی،ڈاکٹر قمر رئیس کی پریم چند شخصیت اور کارنامے اور بہت سے مضامین پریم چند پر شائع ہوئے۔

مذکورہ کتابیں اور رسائل کے نمبر پریم چند کے متعلق اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں جس سے پریم چند کی شخصیت اورفن پر روشنی پڑتی ہے۔اوران سے متعلق بہت سی معلومات ہو جاتی ہیں۔عظیم فنکاروں کے فن کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا ہے ان کے فکروفن کی نت نئی جہتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔البتہ ہم جب قمر رئیس کا مطالعہ کرتے ہیں تو پریم چند کی شخصیت جوصورت دکھائی دیتی ہے وہ جعفر رضا کے یہاں بدل کر دوسری صورت اختیار کرلیتی ہے۔ہنس راج رہبر اسے کسی اور شکل میں پیش کرتے ہیں۔ مدن گوپال ان کی کچھ اور تصویر بناتے ہیں یہاں تک کہ امرت رائے جو پریم چند کے صاحب زادے ہیں اسی صورت کو کسی اور رخ سے ظاہر کرتے ہیں۔چنانچہ ''قلم کے سپاہی'' سے ''قلم کے مزدور'' تک پریم چند کے متعدد رنگ روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔منشی پریم چند کی اسی عظمت کے پیش نظر متعدد صاحب فکر ونظر اور دانشوروں نے اپنے آپ کو ایک طرح سے پریم چند شناسی کے لیے وقف کر دیا ہے۔انھوں نے مختلف زاویہ نظر سے پریم چند کی زندگی اوران کے فکروفن کا جائزہ لیا ہے۔اس باب میں 1980ء کے بعد پریم چند شناسوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔جن میں یوسف سرمست، شکیل الرحمٰن، پروفیسر صغیر افراہیم،علی احمد فاطمی، گوپی چند نارنگ، عظیم الشان صدیقی،شمس الرحمٰن فاروقی،شمیم نکہت،اصغر علی انجینئر، پروفیسر عبدالسلام اور سید محمد عصیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان سبھی کا مختصراً عمومی جائزہ اس باب میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یوسف سرمست:

پریم چند کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کا تجزیہ اردو کے بہت سے ناقدین نے کیا اور اپنے اپنے خیالات کے تحت پریم چند کے درجات قائم کیے۔ انھیں میں ایک نام یوسف سرمست کا بھی ہے جنہوں نے پریم چند پر اپنی تنقیدی نگاہ ڈال کر پریم چند کی تحریروں کی قدر و قیمت کا احاطہ کیا ہے اور پریم چند کی نفسیاتی شعور کا پتہ لگانے کی حتیٰ الامکان کوشش بھی کی ہے۔ یوسف سرمست نے پریم چند پر کتابیں لکھ کر اپنی تنقیدی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ جیسے پریم چند پر ان کی اہم کتاب ''پریم چند کی ناول نگاری'' ہے۔ ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' اور اس کے علاوہ فکشن کے تعلق سے کئی مضامین انھوں نے شائع کیے۔ اسی طرح سرمست نے پریم چند کی ناول نگاری میں پریم چند کے فکر و فن پر مکمل روشنی ڈالی ہے اور پریم چند کے اہم پہلوؤں کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے لیکن انھوں نے اپنے ذاتی نظریوں کو زبردستی پریم چند پر تھوپنے کے بجائے پریم چند کے حوالے سے ہی باتیں کی ہیں۔ کچھ اپنا فلسفہ یا اپنی بڑائی نہیں پیش کی ہے اپنے حرفِ آغاز میں خود سرمست لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنی کتاب میں مختصر مگر جامع انداز میں پریم چند کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اور بجائے کسی خاص نقطہ نظر سے پریم چند کی ناول نگاری کو جانچنے کے خود پریم چند کے پاس جو نقطۂ نظر یا نقاط نظر ملتے ہیں ان کو نمایاں کر دیا ہے۔''[1]

سب سے پہلے سرمست پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں بعض باتوں میں بہت تکرار ہے اور اکثر موضوعات میں بھی ایک جیسی کئی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ پریم چند کی خوبیوں میں ہے۔ اب یہاں کچھ ناولوں کے تعلق سے سرمست کا ایک اقتباس لکھنا ضروری ہے کہ وضاحت کے ساتھ اس پر روشنی پڑ جائے اور تکرار بھی قاری کے پیشِ نظر ہو جائے۔ ملاحظہ کریں:

''اکثر جگہ موضوعات بالکل ایک ہی ہیں ''ہم خرما و ہم ثواب'' پریما''، ''پرتگیا'' اور ''بیوہ'' تو کرداروں اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک ہی ناول کے مختلف نام ہیں کیونکہ ''ہم خرما و ہم ثواب'' کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہندی میں ''پریما'' کا نام دیا گیا ہے اور اس کی بدلی ہوئی شکل ''پرتگیا'' ہے جس کا اردو ترجمہ ''بیوہ'' کے نام سے کیا گیا۔ اور خود ''ہم خرما و ہم ثواب'' اور پریم چند کا سب سے پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' میں بھی بعض باتیں مشترک ہیں۔ پوجاریوں اور پنڈتوں کی ریاکاری کا پردہ دونوں میں چاک کیا گیا ہے۔''[۲]

اس کے ذریعے تکرارِ مضمون کی ساری چیزیں سامنے آتی ہیں اور یہ پریم چند کی ہنرمندی ہے کہ ایک مضمون کے تکرار سے دوسرے مضمون کو پڑھنا اور اس کو سمجھنا کافی آسان ہو جاتا ہے اور اس میں قاری کی دلچسپی مزید بڑھ بھی جاتی ہے اور اس کے ذریعے دوسرے آنے والے مضامین کا قاری کو شدت اور بے صبری سے انتظار بھی رہتا ہے۔ اسی سلسلے میں اردو کے نامور نقاد پروفیسر قمر رئیس کہتے ہیں:

''دراصل یہ اسرارِ معابد کی رام کلی کا کردار ہے جو دوبارہ ہمارے سامنے آتا ہے''[۳]

پریم چند کے تعلق سے سرمست کا یہ خیال مذکورہ حوالے کے تعلق سے صادق بھی آتا ہے کہ پریم چند کے بیشتر ناول گذشتہ نالوں کی تقلید اور ان کو بنیاد بنا کر لکھے گیے ہیں۔ جیسا کہ پریم چند کا پہلا ناول دستیاب تو نہیں ہے مگر اس کے تعلق سے یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ''کشنا'' کی ارتقائی شکل ''غبن'' ہے۔ اسی طرح پریم چند کے بہت سے ناولوں میں ایک دوسرے کا عکس ضرور نظر آتا ہے اور یہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے جب حالات ایک طرح کے ہوں تو ضروری ہے کہ یہ چیزیں اپنا رنگ اور اپنا حلیہ بدل کر سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن جب حالات نے سیاسی کروٹ لی تو پریم چند نے بھی اپنے قلم کی سمت کو موڑا اور سیاست سے متعلق ناول اور افسانے کافی تعداد میں تحریر کیے۔ تاریخی، سماجی اور معاشی حالات کے تحت پرزور انداز میں اپنے قلم کو

حرکت دی۔ ایسے میں ایک سے ایک نئے انداز کے سیاسی ناول پریم چند کی رہینِ منت ہیں۔اس لیے کہ جب حالات بدل گیے اور انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ہو گیا تو کھلی ہوئی بغاوت کرنا کافی مشکل تھا اس لیے پریم چند نے جو کردار تحریر کیے وہ اپنے اردگرد کے ہی ہیں اور پورے ہندوستانی عوام کے درد کو محسوس کر کے اپنے قلم سے قرطاس کے حوالے کرتے رہے۔ آگے چل کر ان کے بعض ناولوں نے تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔حالانکہ ابتدائی دور میں پریم چند نے اصلاحی اور سماجی نالوں سے ہی سروکار رکھا تھا۔لیکن وقت کی تبدیلی نے پریم چند کے ذہن میں ایک نیا آہنگ دے گیا اس کی ایک چھوٹی سی مثال جو ابتدائی دور کے ناول سے متعلق ہے۔اس کے تعلق سے سرمست لکھتے ہیں:

> ''پریم چند ابتدا ہی سے اپنے ناولوں میں ہندوستان کے اس دور کے خاص حالات کو پیش کرتے رہے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' 1903ء تا 1905ء ہندوستان میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی کوششوں کو ظاہر کرتا ہے۔''اسرارِ معابد'' کا موضوع پیشواؤں کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کا پردہ چاک کرنا تھا لیکن 1904ء سے ہندوستا میں سماجی اور معاشرتی اصلاح بنیادی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔''[۱۴]

اس طرح سرمست نے اپنی تحریروں کے ذریعے پریم چند کے ابتدائی اور اصلاحی ناولوں کے نقوش ابھارے ہیں تاکہ قاری پریم چند کے ابتدائی ناولوں اور ان کے خیالات سے آگاہ ہو جائے۔

ادب اور سماج کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے اور ادب و سماج میں ادیب جو دیکھتا ہے اسے اپنے تحریروں کی زد میں لانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح پریم چند نے جو کارنامے انجام دیے اور سماج و معاشرت نے پریم چند کی خفیہ صلاحیتوں کو نکھارا اور پروان چڑھایا۔زولا کا کہنا ہے کہ ناول نگار کا کام یہی ہے کہ سماج اور فرد میں جو عمل اور ردعمل ہو رہا ہے اس کا تجزیہ کرے اور پھر اس کو دکھانے کی کوشش کرے۔اسی طرح پریم چند اپنے زمانے کے سماج اور فرد کے عمل دخل کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے ذریعے ان کے ناولوں کی

ارتقائی صورت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اور یہ کامیابی کے دہلیز تک پہونچ جاتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں اکثر یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ تاریخی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور پریم چند کے نالوں کو'' تاریخی فن'' اس لیے کہا جاسکتا ہے:

''تاریخ کے دھارے نے جو سماجی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ہندوستان میں پیدا کیں وہ ان کے ناولوں میں منعکس ہوتی رہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ''اسرارِ معابد'' سے ''گئودان تک فنی ارتقا کی ایک بہت بڑی مسافت پریم چند طے کرتے نظر آتے ہیں'' اردو ناول میں پریم چند ہی وہ منفرد ناول نگار ہیں جن کے فن کا تدریجی ارتقا واضح ترین صورت میں سامنے آتا ہے چونکہ یہ ہندوستان کے اس دور کے حالات بالکلیہ طور پر وابستہ ہے اس لیے پریم چند کی ناول نگاری کے ارتقا کے مطالعہ کے لیے ہندوستانی زندگی کے سماجی سیاسی اور معاشی حالات کو یہاں پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ پریم چند کی ناول نگاری سے ہندوستان کے ان حالات کا پتا ہی گہرا اور قوی رابطہ ہے۔''[۵]

پریم چند ایک فعال شخصیت کے مالک تھے اور ان کے جوہرِ قلم سے کب کون سا گوشہ نکل جائے کسی کو اس کا احساس نہیں اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ انسان اپنے ماضی سے نکل کر حال اور مستقبل میں زندہ رہنا چاہتا ہے مگر حالات کی تبدیلی کی بات ہے اسی وجہ سے پریم چند اپنے ابتدائی ناولوں کے حصار سے نکل آئے تھے اور سماج کے اصلاحی دائرے سے نکل کر ترقی پسندی میں شامل ہو گیے لیکن سرمست کہتے ہیں کہ پریم چند اپنے ناول ''جلوۂ ایثار'' کے بعد پریم چند نے 1916ء سے بازارِ حسن لکھنا شروع کیا اور بازارِ حسن کا موضوع ایک بار پھر اصلاحی رنگ اختیار کر گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی فضا اس وقت تک بڑی پُرسکون اور خوشگوار تھی۔

اگر بازارِ حسن کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا موضوع بظاہر طوائف کی زندگی سے ہے لیکن اس میں پریم

چندطوائف کی زندگی بیان کرنے میں ناکام ہوگیے ہیں۔ سرمست کا کہنا ہے کہ اس موضوع پر''شاہد رعنا'' اور ''امراؤ جان ادا'' ایسے ناول ہیں جن سے''بازارِ حسن'' کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ان ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پریم چند جس معیار اور مرتبے کے لائق ہیں اس مقام و مرتبہ تک بازارِ حسن میں نہیں پہونچ سکے اور یہاں وہ بالکل ناکام اور بے بس نظر آتے ہیں سرمست اسی ناول کے تعلق سے کہتے ہیں:

> ''پریم چند نے ناول کی ہیروئن کو کوٹھے پر تو بٹھا دیا ہے لیکن وہ کسی بھی اعتبار سے طوائف نہیں بن سکی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پریم چند طوائف کے ماحول اور اس کے کاروبار سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کبھی معشوقانہ عشق پیشہ سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ لیکن بازارِ حسن میں یہ جھول شاید اس لیے ہے کہ اس ناول میں طوائف کی زندگی کو پیش کرنا مقصود بالذات نہیں ہے۔''[٦]

اسی طرح شکیل الرحمٰن نے پریم چند کے ناولوں کو جانچا اور پرکھا ہے ان کی نظر میں پریم چند کے کچھ ناول فنی اعتبار سے بہت کمزور ہیں انھوں نے پریم چند کے ایک دو ناولوں کو بہتر قرار دیا ہے اور باقی کو کمزور ثابت کیا ہے شکیل الرحمٰن نے''ہم خرما و ہم ثواب'' جلوہ ایثار، بازارِ حسن'' نرملا، پردۂ مجاز، گوشہ عافیت، غبن، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، اور گئودان کا فنی اور تکنیکی تجزیہ کرتے ہوئے اپنے معاصر نقادوں کے برعکس نتائج کا استخراج کیا ہے۔ ان کی نظر میں جو ناول فنی اعتبار سے کمزور ہیں اس کی منطقی وجوہات بھی بتائی ہیں۔ بازارِ حسن کے تعلق سے کہتے ہیں۔

> ''غیر ضروری باتوں کی تفصیل سے ناول کا حسن بہت حد تک زائل ہوگیا ہے۔ آخری حصے میں چونکہ اصلاحی نظریہ حاوی ہے اس لیے اسلوب بھی جذباتی ہوگیا ہے۔ اور اکثر مقامات پر پریم چند جیسے بڑے فنکار کا

اسلوب نہیں ملتا۔اسلوب سطحی ہو کر رہ گیا ہے۔''[۷]

اور ایک ناول ''میدانِ عمل'' کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''کردار نگاری بھی کمزور ہے اور پلاٹ بھی اپنے غیر فطری پھیلاؤ سے الجھن پیدا کرتا ہے۔ داستانی رنگ آمیزی اور کرداروں کی فطرت میں اچانک غیر معمولی تبدیلی سے تاثر کم ہو گیا ہے۔ وحدتِ اثر موجود نہیں ہے۔ قصے کا ارتقا میکانکی طور پر ہوتا ہے۔ طویل غیر فطری مکالمے بھی کبھی کبھی حد درجہ بوجھل بن جاتے ہیں۔ مقصد فن پر غالب ہے۔''[۸]

پریم چند نے جس قدر ناول تحریر کیے اسی طرح ان پر اعتراض بھی نقادوں نے پیش کیے لیکن پریم چند مجموعی طور پر ناول کے فن پر جتنا عبور رکھتے ہیں اور جن وسعتوں سے انھوں نے ناول کو روشناس کرایا ہے اس کی تفصیل تو گزری ہے لیکن یہاں کچھ حضرات اپنے تنقیدی نظریے کے ذریعہ پریم چند کے ناولوں کو جانچ پرکھ کر پریم چند کی اہمیت کو ناول کے تعلق سے منفی قرار دیتے ہیں۔ کچھ ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ افسانہ نگار ہیں اور ناول نگاری کے فن اور اصول سے بھٹکے ہوئے ہیں اسی لیے ان کو ناول نگار نہیں کہا جا سکتا اسی طرح اختر حسین رائے پوری نے پریم چند کی ناول نگاری کے تعلق سے کہتے ہیں:

''وہ افسانوں کے بادشاہ تھے اور ان کے بل پر ان کی حیثیت دائم اور مسلّم، ناول ان کے لیے مکڑی کے جالے کی طرح تھا جس میں پھنس کر وہ نکل ہی نہ سکتے تھے اور اگر نکلتے تو اس کے تاروں کو توڑ کر''[۹]

اسی طرح ڈاکٹر احسن فاروقی بھی پریم چند کی ناول نگاری کے تعلق سے اظہار خیال یوں پیش کرتے ہیں:

''اس ناول میں وہی عنصر زیادہ نمایاں ہے جو مختصر افسانہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس کے سب سے زیادہ دلچسپ قصے اپنی جگہ پر مکمل ہیں اور آگے پیچھے سے بالکل الگ ہیں۔ مثلاً اختر حسین رائے پوری کے

یہاں دسہرہ کا جشن جنگل میں مہتا اور مالتی کی ایک خدمت اور ایثار کی دیوی سے ملاقات خورشید کا دیہاتیوں کو کبڈی کھلانا۔۔۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ناول سے اٹھائے جاسکتے ہیں اور اس کی ساخت میں کوئی فرق نہ ہوگا اور نہ اس کا قصہ ہی مبہم ہوجائیگا، غرض ان کو ایسا فن کار کہنا پڑتا ہے جو اپنی فطرت کے خلاف ناول لکھنے پر اتر آیا ہو۔'' [۱۰]

اسی سلسلے میں فراق گورکھپوری بھی پریم چند کی ناول نگاری کے تعلق سے یوں گویا ہوئے اور اپنا خیال بھی اس طرح پیش کرتے ہیں:

''ان کی عظمت ان کی ناولوں کے بعض ٹکڑوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالبًا ناول کی پیچیدگی اور فنی دشواریاں مختلف حصوں کا مرکزی اتحاد اور در و بست ان کا مرکزی کمال نہ تھا۔۔۔۔۔ ان (ٹکڑوں) میں سے ہر ایک گراں قدر ماہرفن کے ادھورے کارنامے معلوم ہوتے ہیں'' [۱۱]

اسی طرح اور بھی بعض نقادوں نے پریم چند کو ناول نگار ماننے سے انکار کیا ہے تو کیا ان کے انکار کرنے سے پریم چند کی عظمت گھٹ جائیگی؟ یا پریم چند کو ناول نگاری کے حدود سے خارج مانا جائیگا؟ ایسا نہیں ہے بلکہ کمی بیشی تو سبھی کے یہاں راہ پا جاتی ہیں۔ یہاں ایک بات اور میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ بعض نقادوں نے رتن ناتھ سرشار کے ناول اور مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کو فنی اعتبار سے سب سے بہتر ناول تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول نگاروں نے ناولیں لکھیں تو کیا ان کو ناول نگار نہیں مانا جائیگا؟ وہ کہاں کا انصاف ہے! کہ ایک مصنف رات دن کی محنت سے ناول کی تصنیف کرے اور جب وہ شائع ہو کر نقادوں یا سامعین کے پاس پہونچے تو اس کی قدر و قیمت کچھ یوں تعین ہو کہ اس کو ناول ماننے سے انکار ہی کر دیا جائے ایسا کیا ہے؟ حالانکہ ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق بہتر سے بہتر تحریر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ذہنی سطح کے ارتقا پر پہونچ کر ہی قلم اٹھاتا ہے۔ تو اس کا صلہ یوں دیا جاتا ہے کہ اس کا حوصلہ

ہی پست کر دیا جائے۔ یہ بھی بات یاد رکھنے کی ہے کہ سبھی لوگ پریم چند نہیں ہو سکتے اور نہ ہی مرزا ہادی رسوا لیکن اگر کوئی قلم کار قلم کو جنبش دے تو اس کو سراہا جائے اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جائے اور اس کی تحریروں میں اگر کوئی لچک اور جھول ہو تو نشاندہی بھی ضروری ہے نہ کہ اس پر ٹوٹ پڑا جائے۔ اور اگر اس ناول میں کوئی اصول چھوٹ رہا ہو تو اس میں اتنی بڑی خرابی بھی نہیں ہے کہ ناول کو سرے سے خارج ہی کر دیا جائے۔ سرمست اپنی کتاب میں اسی تعلق سے لکھتے ہیں:

''اسی طرح اور بہت سے ناقدین کے ذہن میں یہ شبہ جاگزیں ہے کہ پریم چند ناول کے فن پر عبور نہیں رکھتے۔ یا یہ کہ وہ ناول لکھتے ہوئے افسانہ لکھ جاتے ہیں جیسا کہ اوپر کی رائیوں سے صاف ظاہر ہے۔ پریم چند پر یہ اعتراض ناول کے فن کی وسعت اور لچک کو پیشِ نظر رکھے بغیر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے کئی بار ذکر آ چکا ہے کہ ناول کو دنیا کے اہم ترین ناقدین اور ناول نگاروں نے سب سے زیادہ غیر اصولی اور ناقص صنفِ ادب قرار دیا ہے۔ اس مسلمہ بات کا ذکر کرتے ہوئے ''لائنل ٹریننگ'' نے کہا ہے ''ناول جیسا کہ بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ تقریباً غیر فنی صنفِ ادب ہے۔ اس لیے ایک ناول نگار نے کہا ہے کہ ''ناول کے حدود کا تعین ناول نگار کرتا ہے نہ کہ نقاد۔ یہ حدود اسی وقت تک حدود رہتے ہیں جب تک کوئی ناول نگار انہیں عبور نہیں کر جاتا'' [۱۲]

سرمست مزید لکھتے ہیں:

''اصل میں ناول نگار زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور چونکہ زندگی کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔ اس لیے وہ جس طریقہ سے بھی زندگی کو کامیابی کے ساتھ گرفت میں لالے وہی اس کا فن بن جاتا ہے۔ ناول کی فنی تعمیر پر

اعتراض کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ زندگی کی کس درجہ
اس میں عکاسی کی گئی ہے۔ کیونکہ صرف اس بنا پر ناول کی فنی عظمت کا
تعین کیا جا سکتا ہے۔'' ۱۳؎

اب اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ناول میں انسانی زندگی کو کس حد تک ناول میں نبھایا گیا ہے اور اگر بہتر طریقے سے نہیں نبھایا گیا ہے تو ناول ناول ہی ہے مگر فنی اعتبار سے تھوڑا سا کمزور مانا جائیگا لیکن ناول کو صنفِ ناول سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں ''دی۔ یس پریچت'' ''گورکی'' کے متعلق کہا ہے اس کو سرمست اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''گورکی کی اہمیت اس کے ناولوں کی بناوٹ یا تعمیر پر منحصر نہیں ہے بلکہ
اس بات پر ہے کہ جو زندگی اس نے دیکھی اور بسر کی اسے پیش کر دیا
اس لیے اگر ناول نگار کے پاس فنی جھول ہوں یا وہ ناول کے مختلف
حصوں میں ربط پیدا نہ کر سکا ہو تو اس کے قطعی یہ معنی نہیں کہ وہ افسانہ
نگار ہے۔ ناول نگار نہیں یا یہ کہ اس کا فن افسانے کا فن ہے ناول کا فن
نہیں'' ۱۴؎

اس سے ظاہر ہو گیا کہ پریم چند ناول نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ایسا نہیں کہ پریم چند صرف افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ ناول نگاری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے کچھ کمزوری ہے۔ اور کمی تو سب کے یہاں ہو جاتی ہے اور اس دنیا میں مکمل کیا ہے۔ اگر پریم چند کے ناولوں کی کمزوری کو دیکھا جائے تو ہے، اور اس کا اظہار بھی پریم چند کرتے ہیں۔ سرمست کا خیال ہے کہ پریم چند اپنے ناولوں کو بڑی کمزور بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ اور وہ کمزوری یہ ہے کہ کہانی بیان کرنے اور پلاٹ کو آگے بڑھانے کیلئے غیر یقین آفرین واقعات کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ پریم چند اپنے ناولوں میں جدید تکنیک استعمال کرنے سے قاصر ہیں یہی پریم چند کی کمزوری ہے اس تعلق سے پریم چند کہتے ہیں:

''میں پرانا ہو گیا ہوں اور پرانے طرزِ تحریر کو نبھائے جا رہا ہوں۔ کہانی کو

درمیان سے شروع کرنا یا اس طرح شروع کرنا کہ جس سے ڈرامے کا
سا انداز پیدا ہو جائے میرے لئے مشکل ہے۔''۱۵

سرمست نے منشی پریم چند کے حوالے سے بہترین انداز میں ان کے ناولوں کو پڑھا اور سمجھا ہے اور ان پر تفصیلی نگاہ بھی ڈالی ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں سرمست نے کہا ہے کہ بجائے خود کسی خاص نقطۂ نظر سے پریم چند کی ناول نگاری کو جانچنے کے خود پریم چند کے پاس جو نقطہ نظر یا نقاط نظر ملتے ہیں ان کو نمایاں کر دیا ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن جب سرمست پریم چند کا تجزیہ کر رہے ہیں تو کچھ اپنی رائے بھی دینی چاہئے اور جس طرح قمر رئیس نے بڑی دیدہ ریزی سے مطالعہ پریم چند کا کیا ہے اور بہت سے پوشیدہ نکات کو واضح کیا ہے اور سرمست اسی طرح کرتے تو سرمست کے مضامین کی اہمیت دوبالا ہو جاتی۔

باالآخر یوسف سرمست نے اپنی تنقیدی کتاب ''پریم چند کی ناول نگاری'' میں پریم چند کے ناولوں کے متن کی روح کو سمجھ کر اس کے باطن میں اتر کر تخلیق کار کے سوز دروں اور اس کے پیش کردہ کرداروں کی جذباتی کشمکس نفسیاتی گتھیوں کو خارج میں لاکر فنی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شکیل الرحمٰن:

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا شمار عصرِ حاضر کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری میں جمالیاتی فلسفے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف جمالیات کو اپنے رگوں میں سرایت کیا ہے بلکہ اس موضوع پر کام بھی کیا ہے جمال پرستی اور جمال آرائی پر بہت وافر انداز میں لکھا ہے۔ جمالیات سے متعلق ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کو اردو کے ناقدین نے سراہا بھی ہے۔ ان کی درجہ ذیل کتابوں سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، اقبال روشنی کی جمالیات، ہندوستانی جمالیات (۳ جلدیں) امیر خسرو کی جمالیات، فیض احمد فیض المیہ کی جمالیات، قرآن حکیم کی جمالیات کا سرچشمہ، مولانا رومی کی جمالیات، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، ہنداسلامی جمالیات، جمالیات حافظ شیرازی اور ہندوستان کا نظام جمال وغیرہ، انھوں نے قدیم راگ راگنیوں کو بھی سراہا ہے۔ سفر نامے، اور سوانح بھی تحریر کیے ہیں۔ فکشن پر کئی معیاری کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوس

رہا، اورمنٹوشناسی وغیرہ۔اس کے علاوہ انھوں نے پریم چند کی تخلیقات کہانیوں اور ناولوں کا عمیق مطالعہ کرتے ہوئے تجزیاتی نقطۂ نظر سے پریم چند پر ایک مبسوط کتاب ''فکشن کے فنکار پریم چند'' لکھ کر پریم چند شناسی میں اپنا نام درج کرایا۔مغربی فکشن خاص طور پر ناول کے فن سے یہ خوب واقف تھے اس لیے وہ پریم چند کی ناولوں سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں انھوں نے مغربی ناولوں کے لاشعوری پس منظر میں جوبھی خامیاں ، پریم چند کی ناولوں میں پائی ہیں ان کے اظہار میں حق بجانب نظر آتے ہیں'' فکشن کے فنکار پریم چند'' یہ کتاب پریم چند کو سمجھنے کے لیے بے حد معاون و مددگار رہے۔ پریم چند کی شخصیت افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر مدلل جامع اور پروقار بحث کی ہے۔اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند ناول نگار اتنے بڑے نہیں ہیں جتنے بڑے افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اس باب میں صرف رائے کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں موجود کردار نگاری و ناولوں کے تجزیوں اور کرداروں کی نفسیاتی دنیا کو بھی قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ پہلا باب ناول نگاری کے عنوان سے ہے جس میں پریم چند کی ناول کا بہترین اور خوب صورتی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔اس میں انھوں نے اردو کے ناقدین کی بے توجہی کا بھی گلہ کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کی افسانہ نویسی کی طرف نقادوں کا خیال بہت ہی کم ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر افسانے کے فنکار ہیں، پریم چند کے ساتھ اگر ان کے ناولوں کے کردار سامنے آنے لگتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ابھی ان کے افسانوں کی اہمیت کا گہرا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔اردو کے نقادوں نے عموماً ناولوں کی جانب زیادہ توجہ دی ہے، ایم اے اردو کے نصاب میں پریم چند ایک ناول نگار کی حیثیت ہی سے ملتے ہیں''[۱۶]

افسانوں کے تجزیہ سے گریز کرتے ہوئے وہ پریم چند کے ناولوں اور اردو کے ناقدوں کی ان تنقیدوں سے بھی مطمئن نہیں جو پریم چند پر لکھی گئی ہیں ان کا کہنا ہے کہ جن ناولوں پر تنقید کی گئی ہے ان میں دروں بینی کی پراسرار کیفیات کو اہمیت دینے کا فقدان ہے۔انہیں کے قول کے مطابق بڑی بڑی سیاسی

تحریکوں سے ناول کے موضوع کو جوڑ کر اور اسی تناظر میں ان کے کرداروں کا مطالعہ کر کے ناولوں کو اونچا بتانے سے تنقید اور تجزیے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

شکیل الرحمان ''فکشن کے فنکار پریم چند'' میں پریم چند کے ناولوں کا تجزیہ اچھے انداز میں کیا ہے۔کرداروں کی صفات عادتوں اور علتوں کو بھی نشان زد کیا ہے۔کرداروں کے ذہنی مطالعے کا منظر نامہ قاری کے سامنے پیش کرتے ہوئے کرداروں کے تصادمات و سماجی حقائق کے ساتھ ہی ساتھ حالات و کیفیات اوران سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی زمینی سطح پر اتارا ہے اوران کا اپنے طور پر تجزیہ بھی پیش کیا ہے مختلف ناولوں پر بحث کے دوران دیگر ناقدین کے تجزیہ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔انھیں جہاں جہاں پریم چند کے ناولوں میں خوبیاں نظر آئیں ہیں انھیں بھی اجاگر کیا ہے اور جہاں جہاں کمزوریاں محسوس کی ان پر بھی استدلال کے ساتھ بحث وتمحیص سے کام لیا ہے اور تنقید کے تقاضے کوانھوں نے اپنے مقالے میں پریم چند کے تخلیقی کارکردگی کو تفصیل سے پیش کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ پریم چند کس کس کی تحریروں سے متاثر تھے۔قصہّ چہار درویش اور طلسم ہوش ربا اور دوسری داستانیں ان کے پیش نظر تھیں۔رینالڈ، رتن ناتھ سرشار کے ناولوں اور انگریزی سے ترجمہ شدہ ناولیں ان کی نظروں سے گزری ہیں۔بنکم چٹرجی، ٹیگور، طالسطائی اورسرت چندر کے موضوعات اور تکنیک کو بھی پریم چند نے اپنے ناولوں اورافسانوں میں پیش کیا۔شکیل الرحمان نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ابتدا میں ان کی تحریروں میں داستانوی اثر دکھائی دیتا ہے۔خاص طور پر خیال آرائی اوررومانیت کی اثر کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قصوں میں مافوق الفطرت کردار، غیر حقیقی واقعات، اوہام پرستی، داستان کی طرح مبالغہ آرائی، تصنع اور لمبی لمبی عبارتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔انھوں نے اس ضمن میں پریم چند کے پہلے ناول ''اسرار معابد'' کوخصوصی طور پر موضوع بحث بنایا ہے اوراس کا مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔تجزیاتی دلائل اتنے مضبوط اور حقائق پر مبنی ہیں کہ ان کے زیادہ تر خیالات سے ہم اتفاق کر سکتے ہیں۔شکیل الرحمان ''اسرار معابد'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ قصہ ہر لحاظ سے بہت کمزور ہے۔اسے ناول کہنا بھی

غالباً مناسب نہ ہوگا۔فسانہ آزاد جیسا طویل قصہ ہے،اس کی
کہانی کا کوئی معین رُخ نہیں ہے۔جیسے جیسے ذہن میں باتیں
آتی گئی ہیں لکھتے گئے ہیں۔عریاں نگاری بھی کی ہے داستان
نگار کی طرح پلاٹ کی تشکیل کے قائل نظر نہیں آتے،اگر چہ
بعض کرداروں کے جذبات میں نظر ملتی ہے لیکن کہانی میں کسی
قسم کی کوئی گہرائی یا پیچیدگی نہیں ہے۔قصے کے کردار سماجی
زندگی کے نمائندے ہیں اور لکھنے والے کی روح کسی قدر بے
چین محسوس ہوتی ہے لیکن ان کے باوجود اسے اردو قصوں میں
کوئی جگہ حاصل نہیں ہوسکتی''۱۷

مندرجہ بالا سطور میں میں نے یہ کہا ہے کہ ان کو جہاں جہاں کمیاں کوتاہیاں نظر آئیں ہیں ان کا بھر پورا اظہار کیا ہے اور جس جس ناولوں میں انھیں خوبیاں نظر آئیں ہیں ان کو فراخدلی کے ساتھ اجاگر کیا ہے چنانچہ انھوں نے ''اسرار معابد'' پر کڑی تنقید اس لیے کی کہ اس میں داستانی رومانی اور وقوعات کے چربے کے باوصف داستان کی جو اہم خوبیاں ہوتی ہیں وہ ناپید ہیں یعنی ''نقل بمطابق اصل'' بھی نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ پریم چند نے جہاں جہاں داستان کے اچھے اثرات کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے ناولوں میں شامل کیا ہے وہاں وہ بالاتر معلوم ہوتے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے پریم چند کے ناولوں کو اردو کے بڑے ناولوں میں جگہ نہیں دیتے ہیں وہ رقمطراز ہیں:

''داستان کی رومانیت سے پریم چند نے جو اچھے اثرات قبول
کیے ہیں انھیں ''ہم خرما ں و ہم ثواب''،''جلوۂ
ایثار''،''بیوہ''،''نرملا''،''پردۂ مجاز''،''بازار حسن''،''چوگان
ہستی''،میدان عمل اور غبن،میں دیکھ سکتے ہیں۔ان ناولوں
میں رومانی انداز نظر ملتا ہے۔کرداروں کو جذبات کا پیکر

بنانا، ان کی بعض انفرادی خصوصیات سے دلچسپی لینا، واقعات سے تجسس اور بے چینی کو بڑھانے کی کوشش، افراد کی جذباتی پیچیدگیوں کو بعض سطحوں پر سمجھانا، جذباتی کشمکش اور اضطراب کی تصویر کشی۔۔۔ یہ باتیں اہم ہیں، حقائق زندگی اور معاشرتی قدروں کا احساس موجود ہے، طبقاتی زندگی کے نشیب وفراز ملتے ہیں، لیکن یہ ناول بڑے نہیں، ان کی تاریخی اہمیت زیادہ ہے''۱۸

اس کے علاوہ شکیل الرحمان نے پریم چند کے دس ناولوں کا تجزیہ بہت ہی مختصر مگر مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے تجسس، لگن اور کافی محنت کے ساتھ ان تمام ناولوں کا جائزہ لیا ہے ''ہم خرماں وہم ثواب''، جلوۂ ایثار''، ''بیوہ'' اور ''بازارحسن'' پر برملا اظہار کرتے ہوئے ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان ناولوں کے کرداروں کا فطری ارتقا نہیں ہو تا، اصلاحی، نقطۂ نظر حاوی نظر آتا ہے، طویل مکالمے پریشان کن بن جاتے ہیں۔ مکالموں میں تصنع فطری کیفیتوں کو ابھر نے نہیں دیتا، سنسنی خیز واقعات سے بھی کوئی تاثر نہیں ملتا۔۔۔ عجیب بات یہ ہے کہ پریم چند جب چاہتے ہیں فطری اور داخلی تبدیلی دکھا دیتے ہیں اس کے لیے کوئی پس منظر نہیں ہوتا، فن کار اپنے خوابوں کی تعبیریں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے انھیں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پریم چند کے مطالعے میں تاریخی منزلوں کو سمجھنے کے لیے ان کا ذکر ضروری ہے''۱۹

شکیل الرحمان نے پریم چند کے ناولوں ہم خرماں وہم ثواب، جلوۂ ایثار، بازارحسن، نرملا، پردۂ

مجاز، گوشۂ عافیت، میدان عمل اور چوگان ہستی، گئودان کا فنی و تکنیکی تجزیہ کرتے ہوئے معاصر نقادوں کے بر عکس نتائج کا استخراج کیا ہے اور چند ایک ناولوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ناولوں کو فنی اعتبار سے کمزور اور اس کی منطقی وجوہات بھی پیش کی ہیں۔ بازارِ حسن کی کمزوری کی وجہ بیان کرتے ہوئے شکیل الرحمان لکھتے ہیں:

''غیر ضروری باتوں کی تفصیل سے ناول کا حسن بہت حد تک زائل ہو گیا ہے۔ آخری حصے میں چونکہ اصلاحی نظریہ حاوی ہے اس لیے اسلوب بھی جذباتی ہو گیا ہے اور اکثر مقامات پر پریم چند جیسے بڑے فنکار کا اسلوب سطحی ہو کر رہ گیا ہے۔[۲۰]

اور میدان عمل کی کمزوری بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کردار نگاری بھی کمزور ہے اور پلاٹ بھی اپنے غیر فطری پھیلاؤ سے الجھن پیدا کرتا ہے۔ داستانی رنگ آمیزی اور کرداروں کی فطرت میں اچانک غیر معمولی تبدیلی سے تاثر کم ہو گیا ہے۔ وحدتِ اثر موجود نہیں ہے۔ قصے کا ارتقا میکانکی طور پر ہوتا ہے۔ طویل غیر فطری مکالمے کبھی کبھی حد درجہ بوجھل بن جاتے ہیں۔ مقصد فن پر غالب ہے۔[۲۱]

اس قیاس پر وہ تمام ناول جن میں یہ فنی نقائص ہیں وہ انہیں کے خیال میں کمزور ہیں۔

''نرملا'' ایک اچھا ناول ہے کہ اس میں تخلیقی شعور کا عمل ملتا ہے کرداروں اور خصوصاً طوطا رام اور نرملا کے ذہنی تصادم کی کشمکش سے المیہ پیدا ہوتا ہے جو متاثر کرتا ہے۔ آئیڈیل ازم یا مثالیت پسندی حقیقت نگاری کی آمیزش ملتی ہے اور کرداروں کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس ناول کے بارے میں دیگر ناقدین کی آراء کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ جن باتوں کی کمی ناقدین نے محسوس کی ہے۔ دراصل انھیں کے فقدان ہی سے ناول ''نرملا'' اہمیت اختیار کرتا ہے۔ ''نرملا'' کو خوبصورت ناول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پریم چند نے المیہ کو، سماجی عملی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی

ہے اور یہی اس ناول کا حسن ہے۔''۲۲

صرف یہی نہیں اس ناول کی استدلالی وکالت کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس کے ان خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ جو انھوں نے ناول ''نرملا'' کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے۔ شکیل الرحمان نے ''نرملا'' کی اس حد تک حمایت اور توصیف بھی کی ہے کہ انھوں نے قمر رئیس سے یہ بھی گلہ کیا ہے کہ وہ اسے ہلکا پھلکا ناول کہہ کر رہ گئے ہیں چنانچہ شکیل الرحمان ''نرملا'' کو ہلکا پھلکا ناول نہیں گردانتے بلکہ ثقیل بھاری بھرکم اور دقیق بحث کا متقاضی تصور کرتے ہیں اس ناول کی تعریف میں ان کا آخری جملہ ملاحظہ ہو:

> ''اس مختصر ناول میں معاشرے کا تضاد فنکارانہ طور پر پیش ہوا ہے۔۲۳

ناول ''گوشۂ عافیت'' کی تجزیہ کرتے ہوئے شکیل الرحمان نے ابتدا سے آخر تک اس ناول کی تعریف کی ہے اور کچھ مشورہ بھی ناقدوں کو دیا ہے۔ کہ اس ناول کے تجزیہ کے دوران کہاں اور کس جگہ توجہ دینی چاہئے تھی۔ اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''سمجھوتہ بازاری، شخصی اصلاح اور گناہوں پر نادم ہونے کی باتیں ملتی ہیں۔ یہ پریم چند کی بنیادی کمزوریاں ہیں جو ناولوں میں فنی اقدار کو مجروح کرتی ہیں۔ جذبات نگاری میں ایسی باتوں کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔۲۴

آگے مزید کہتے ہیں کہ ''گوشۂ عافیت'' میں پریم چند کی فنکاری عروج پر ہے اسے تکنیکی اعتبار سے ایک کامیاب ناول کہہ سکتے ہیں۔ اس میں رزمیہ اور المیہ کا متوازن امتزاج ہے۔ اس کے کردار معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندہ ہیں۔ بلراج نمائندہ طبقاتی کردار ہے۔ پریم چند کے رومانی ذہن نے اس کردار کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس میں وہ اوصاف ہیں جو پریم چند نئے دور کے کسان میں دیکھنا چاہتے تھے۔

ناول ''غبن'' میں شکیل الرحمان نے متوسط طبقے کی ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے اس میں نمائشی کھوکھلی

زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔اس کے پلاٹ کی تشکیل مغربی ناولوں کی تکنیک کے مطابق ہوئی ہے لیکن تکنیک کے لحاظ سے وہ اسے کمزور ناول کہتے ہیں۔ پلاٹ کے غیر ضروری پھیلاؤ سے طویل غیر فطری مکالموں کے باعث رومانیت خارجی حقیقتوں میں دب کر رہ گئی ہے۔مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے کے مسائل کو جبر استحصال کی قوتوں کے خلاف متحد کرنے کی اچھی کوشش ہے،اچھوتوں کی بدحالی اہم موضوعات ہیں۔اس سلسلے میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''متوسط طبقے کی کھوکھلی زندگی ملتی ہے۔۔۔کشمکش اور الجھنوں کی تصویر کشی عمدہ ہے۔اصلاحی نقطۂ نظر یہاں بھی ہے جس سے رومانیت مجروح ہوجاتی ہے۔پلاٹ کی تشکیل میں مغربی ناولوں کی تکنیک پیشِ نظر رہی ہے۔''۲۵

ناول ''چوگانِ ہستی'' کو شکیل الرحمان ''گئودان'' سے عمدہ ناول خیال کرتے ہیں اس میں تجربوں کے پیش کرنے کا انداز جداگانہ وفنکارانہ ہے۔احساسات و جذبات کی اہمیت بالاتر ہے۔صوفیہ اور سورداس رومانی پیکر اور مثالی کردار ہیں۔صوفیہ اور وِنے کی رومانیت ان دونوں کرداروں کے ساتھ ایک پورا معاشرہ ملتا ہے۔جو اپنی وسعت اور تضادات کے ساتھ مختلف طبقوں کے مسائل کو فنی سطح پر نمایاں کرتا ہے۔

ناول ''ہم خرماں وہم ثواب'' میں آریہ سماجی خیالات،مندروں کے تماشوں،قدامت اور جدت پسندی کے ٹکراؤ کے مقابلہ پر پریما کی خاموش محبت اور دان ناتھ کی رقابت کی فنکارانہ عکاسی کی گئی ہے۔اس کے پلاٹ کی بنیادی خصوصیت جذبوں کا تصادم ہے''ہم خرما ہم ثواب'' کے بارے میں اپنے خیالات صرف تین سطروں میں پیش کیے ہیں۔وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہم خرماں وہم ثواب''میں آریا سماجی خیالات اور مندروں کے تماشے غور طلب ہیں۔قدامت پسندی اور جدت پسندی کی کشمکش میں پریم چند کے جذبات کے بعض رنگوں کی پہچان

ہوتی ہے، پریما کی خاموش محبت اور دان ناتھ کی رقابت میں یہ
رنگ موجود ہیں'' ۲۶

''گئودان' میں ہوری ایک علامتی کردار بن کر ابھرتا ہے۔ یہ ناول شکیل الرحمان کی رائے میں اردو فکشن میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ وہ خارجی اور داخلی تصادم کو اس ناول کا بنیادی حسن مانتے ہیں۔ ''گئودان'' کے ذریعہ اردو فکشن میں جو'' کتھارسیس ہوئی ہے اس کی حیثیت مسلم ہے!'' مرکزی کردار کے جذبات کی ایک چھوٹی سی آرزو کے کئی رنگ اس ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہوری قدیم روایات کے ساتھ اس دور کی سماجی، معاشی، اقتصادی و بدحالی گاؤں کی معصوم زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔

ناول ''بیوہ'' پر شکیل الرحمان اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے دو جملے تعریف کے لکھتے ہیں تو اگلے ہی جملے میں تنقید کبھی ناول پر اور کبھی ان ناقدین پر جو اس سے قبل اس ناول پر اپنا تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

''کسی ناول کی اہمیت محض اس بات سے نہیں بڑھ جاتی کہ اس میں عہد اور وقت کی حقیقت مختلف صورتوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ ''بیوہ'' میں قدیم اور جدید قدروں کے تصادم کے پس منظر میں کرداروں کے جذبات کے تصادم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ پلاٹ کی بنیادی خصوصیت جذبوں کا تصادم ہے ، مذہب، رسم و رواج، معیشت اور معاشرہ سب پس منظر میں ہیں اور پس منظر ہی کو سب کچھ سمجھ لینا ادبی تنقید کا کام نہیں ہیں۔ امرت رائے، پریم چند کا آیڈیل کردار ہے جو ٹائپ بن گیا ہے، اس کا ذہن مطالعے کا مستحق ہے، اس ذہن میں المناک واقعات ہیں (بیوی اور بچے کی موت) قدروں کا تصادم ہے۔ گہری سنجیدگی ہے۔ یہ کردار ٹائپ ہونے کے

باوجود اکثر اپنے جذبات سے پہچانا جاتا ہے، جذبات اس پر غالب ہے، پریما کی نفسیاتی کشمکش بھی توجہ طلب بنتی ہے، عورت کے روپ میں کئی خصوصیات کے ساتھ ابھرتی ہے۔ بیوہ ہے لیکن دیوی نہیں رہتی، المیہ کردار بن جاتی ہے۔ شوہر کی موت کے بعد اندرونی ویرانی کا احساس دلاتی ہے، کمار پرشاد کی باتیں سن کر اس کی بے قراری توجہ چاہتی ہے۔[۲۷]

شکیل الرحمان نے پریم چند کے ناولوں کے محاسن و معائب بیان کرتے ہوئے ان نقادوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جنھوں نے صرف پس منظر پہ اپنی نظر مرکوز رکھا اور حقیقت نگاری کے میکانکی تصور میں کھو کر رہ گئے ہیں۔ کرداروں کی جبلی اور نفسیاتی سچائی کو نظر انداز کر دیا ہے انھوں نے تجزیوں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پریم چند ناول نگار تو ہیں مگر بڑے ناول نگار نہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے پریم چند کے ناولوں کو بڑے ناول ماننے سے انکار کیا ہے مگر جا بجا تنقید کے دوش بدوش بہت فراخدلی کے ساتھ تعریف بھی کی ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ ایک بڑے ناول کی پہچان کیا ہے۔ اور وہ کون سی صفات ہیں جن کی وجہ سے کوئی ناول بڑا ناول کہلاتا ہے اور نہ ہی کوئی دلیل پیش کی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ''افسانے کا فن'' ہے اس موضوع کے تحت شکیل الرحمان نے پریم چند کے کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کسی بھی افسانے میں عموماً دو کردار یعنی ہیرو اور ہیروئن بنیادی کردار ہوتے ہیں جو اول تا آخر افسانے پر حاوی رہتے ہیں لیکن ذرا تصور کو بروئے کار لاکر کسی افسانہ یا خاص طور پر رومانی افسانوں میں ثانوی کردار کی اہمیت ہیرو اور ہیروئن سے کم نہیں ہوتی یعنی افسانے میں ہیرو اور ہیروئن کے بعد ثانوی کردار کے توسل سے ہی افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ شکیل الرحمان نے اسی ثانوی یعنی تیسرے کردار کے موجودگی کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے مطابق فکشن کا اصل ہیرو در حقیقت یہی تیسرا کردار ہے۔ اس تیسری

کردار کے بغیر داخلی اور خارجی اقدار کی نقاب کشائی نہیں ہوتی۔شکیل الرحمان نے پریم چند کے افسانوں میں پائے جانے والے اسی تیسرے کردار کی اداکاری اور رول کے متعلق بحث کی ہے۔کبھی کبھی یہ تیسرا کردار ذیلی کردار کی شکل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے تو کہیں کچھ لمحے کے لیے یہ تیسرا کردار ہی افسانے کا اہم کردار بن جاتا ہے۔مطلب یہ کہ تیسرا کردار کی شخصیت دوہری ہو جاتی ہے۔مثلاً شکیل الرحمان نے ''گھاس والی'' کے دو اہم کردار مہابیر (شوہر) اور ملیا (بیوی) کی ازدواجی زندگی میں ایک تیسرا کردار چین سنگھ کو سامنے لایا ہے۔اس چین سنگھ کے آنے پر پرامن ازدواجی روزمرہ کی زندگی میں ہل چل اور حرکت و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔شکیل ارحمان نے اسی حرکت و بے چینی کو پیش کیا ہے۔کرداروں کے نفسیات اور کیفیات کا خلاصہ کرتے ہوئے یہ بتانا چاہا ہے کہ تیسرا کردار اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے باوجود اس کی اپنی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی اگر چہ وہ ملیا کو اپنی بیوی نہیں بنا سکا مگر ملیا کی انسیت بڑھتی رہتی ہے۔بالآخر ملیا جب دوسرے لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے تو چین سنگھ کو بے قراری و اضطراری کا احساس ہوتا ہے۔

کتاب کا آخری باب شخصیت ہے جس میں پریم چند کی عظیم شخصیت کا سرسری جائزہ نہیں ہے، بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں جو عناصر کارفرماں ہیں، ان کا بہت ہی تفصیلی اور نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔پریم چند اپنی شخصیت کے متعلق کہتے ہیں کی میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے مگر شکیل ارحمان تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریم چند کا یہ دعویٰ غلط ہے چونکہ بچپن میں ماں سے محرومی، غربت اور سوتیلی ماں کی آمد، پہلی ناپسندیدہ شادی، گھر کا المیہ، تنگ دستی، بیوی کی موجودگی میں کسی سے ناکام محبت، امتحان میں ناکامی، نوکری سے استعفیٰ یہ تمام باتیں تھیں جن کا تاویل اور تشریح کے ذریعہ شکیل ارحمان نے ثابت کیا ہے کہ ان کی زندگی ہموار تو کبھی تھی ہی نہیں۔چنانچہ تنہائی کا احساس، تشنگی، گریز، ہیرو پسندی وغیرہ کے عنوانات کے زیر اثر اپنے خیالات کی تائید کردی ہے بلکہ ساری زندگی کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے

عام طور پر پریم چند کو دیہات اور دیہات سے جڑے لوگوں کی زندگی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔شکیل الرحمان نے اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ ان کی زندگی ملازمت کے دوران گورکھپور، کان

پور، بنارس، الہ آباد اور واردھا وغیرہ میں گزری۔ مہوبہ ضلع ہمیر پور ڈپٹی انسپکٹر مدارس بھی رہے۔اس وقت پریم چند کو دیہات کی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔اس طرح کی وضاحتوں اور نتائج کے ذریعہ شکیل ارحمان نے پریم چند شناسی کی ایک نئی اور الگ رخ کو سامنے لایا ہے۔ان کے افکار اور نتائج یقیناً نئے اور اہم ہیں۔وہ صرف اور صرف تاثراتی نقاد نہیں بلکہ ایک محقق کی طرح انھوں نے دلائل اور براہین سے اپنے نتائج وفکر کو استحکام بخشا۔

پروفیسر صغیر افراہیم

پریم چند ہمارے ادب کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔انھوں نے اردو افسانہ کو ایک نئی راہ دکھائی اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ان کی تخلیقات کو دیکھ کر ہمارے ناقدین نے ان کے متعلق طرح طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اور اپنے آپ کو ماہر پریم چند کی فہرست میں شامل کرلیا۔ان میں قمر رئیس، جعفر رضا، علی احمد فاطمی، مدن گوپال، امرت رائے، محمد حسن اور مانک ٹالا کے نام ہیں۔لیکن آج کے اس جدید دور میں ماہر پریم چند کے حوالے سے پروفیسر صغیر افراہیم کا نام قابل ذکر ہے۔انھوں نے پریم چند کی گمشدہ تخلیقات کو سامنے لاکر پریم چند کی اہمیت کو اور زیادہ اجاگر کیا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم اردو فکشن کے چند اہم نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں انھوں نے شاعری پر بھی مضامین لکھے ہیں، لیکن ان کا خاص میدان اردو فکشن ہے۔ان کو فکشن تنقید اور اس کے فنی نکات کی تفہیم سے لگاؤ اور دلچسپی ہے۔فکشن کی تنقید پر انھوں نے تقریباً نصف درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔پروفیسر صغیر افراہیم فکشن کے منظر نامے سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔جس سے ان کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔فکشن تنقید سے متعلق ان کی کتابیں اس طرح ہیں۔

۱۔ داستان، ناول، افسانے کا تنقیدی تجزیہ۔ ۲۔نثری داستانوں کا سفر

۳۔ افسانوی ادب کی نئی قراءت ۴۔اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل

۵۔ اردو فکشن تنقید و تجزیہ، اس کے علاوہ انھوں نے پریم چند شناسی میں ایک نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے۔''پریم چند ایک نقیب''''پریم چند تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' دو کتابیں تحریر کی ہیں۔اس کے علاوہ

بہت سے مضامین پریم چند پر رقم کیے ہیں۔ پریم چند ایک نقیب کے عنوانات اس طرح ہیں۔

۱۔ پریم چند پر مختلف تحریکوں کے اثرات ،۲۔ ہوری ایک علامتی کردار ،۳۔ شاہکار تخلیق کفن ،۴۔ افسانہ نگار پریم چند، ۵۔مختصر سوانحی خاکہ۔صغیر افراہیم نے پریم چند کو بالکل منفرد انداز سے جانچا پرکھا ہے۔ جس کی بنا پر ہم انھیں ایک اہم پریم چند شناس بے جھجک کہہ سکتے ہیں۔قاضی عبدالستار نے پریم چند شناسی کے تعلق سے ان کی جو ستائش کی تھی وہ لائقِ تحسین اور پیشن گوئی سے کم نہیں وہ کتاب کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صغیر افراہیم اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں سب سے کم عمر صاحب تصنیف ہیں۔''پریم چند۔ایک نقیب'' بالغ ہوتی ہوئی نگاہِ نقد کا پریم چند کے حضور میں محض ایک خراجِ عقیدت ہی نہیں بلکہ اردو فکشن کی تنقید کے کینوس کو وسیع اور محترم کرنے کی مبارک کوشش ہے جس کے لیے وہ ستائش کے مستحق ہیں۔'' ۲۸

صغیر افراہیم کی پریم چند سے متعلق دوسری کتاب ''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' ہے اس کتاب کے فہرستِ مضامین اس طرح سے ہیں۔ پریم چند کی تخلیقات کا فکری پس منظر، پریم چند بحیثیت ناول نگار، پریم چند بحیثیت افسانہ نگار، واردات کا تجزیاتی مطالعہ،مکتوبات پریم چند کا معروضی مطالعہ، پریم چند بحیثیت ڈراما نگار، پریم چند کی غیر افسانوی تحریروں کا تحقیقی مطالعہ،اس کتاب میں انھوں نے پریم چند کی تمام تخلیقات کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور خارجی شہادتوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔اس مشہور کتاب میں مصنف نے پریم چند کے فکری وفنی جائزہ کے ساتھ ان کے سوانحی کوائف کو بھی احاطِ تحریر میں لایا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے پریم چند کے فکشن اور غیر افسانوی ادب،خطوط، ڈرامے وغیرہ سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے صغیر افراہیم کے عمیق مشاہدے اور گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے پریم چند کی افسانہ نگاری، ناول نگاری،خطوط نگاری، ڈراما نگاری پر تفصیل سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ پریم چند کے غیر افسانوی تحریروں کا تحقیقی مطالعہ کر کے انھوں نے پریم شناسی میں اپنا نام درج کرایا ہے۔اور کفن، مالکن اور بیوی پر قلم اٹھا کر انھوں نے پریم چند کے ان نفسیاتی افسانوں کو نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے۔صغیر افراہیم

افسانہ ''مالکن'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

''پریم چند نے اس افسانے میں ایک بیوہ کے ساتھ اس کے سسر کے مشفقانہ برتاؤ کو پیش کر کے عام روایت سے بالکل الگ راستہ اختیار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک غمزدہ بیوہ کو مالکن کے روپ میں گھر کی بڑی بن کر اپنے مرحوم شوہر کی یادوں خاندان کی بہتری کے لیے وقف کرنے کے عمل سے اس کی زندگی سدھر سکتی ہے اسی لیے وہ ایک آدرش بیوہ کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کو بجائے نفرت کے محبت کے ماحول نے جنم دیا۔'' ۲۹

پروفیسر صغیر افراہیم نے پریم چند کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پریم چند کی تخلیقات کا یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کیا اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ڈاکٹر سعید پروفیسر صغیر افراہیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عہد حاضر کے معروف نقاد پروفیسر صغیر افراہیم نے بھی منشی پریم چند کے فنون کو بالکل منفرد وژن سے جانچا پرکھا ہے جس کی بنا پر ہم انھیں پریم چند شناسی کا ایک نیا پریم چند شناس کہہ سکتے ہیں۔'' ۳۰

اسی سلسلے میں ڈاکٹر پردیپ جین لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صغیر افراہیم جو خود بھی افسانہ نگار ہیں اور ادبی محفلوں میں فکشن کی تنقید اور پریم چند شناس کی حیثیت سے کافی مقبول و مشہور ہیں۔ اُن کی پریم چند شناسی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف کی پہلی کتاب ''پریم چند... ایک نقیب'' (۱۹۸۷ء) کے اب تک کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔'' ۳۱

پروفیسر صغیر افراہیم نے پریم چند کی ذہنی وفنی تربیت میں مختلف تحریکات ور جحانات کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ جس نے دھنپت رائے کو یا نواب رائے کو پریم چند بنانے میں مدد کی ہے۔ ان تحریکوں میں ''راجہ رام موہن رائے'' کی کاوشوں کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے جس کا نتیجہ یہ وہوا کہ بنگال میں ''برہموسبھا'' کی بنیاد رکھی گئی بعد میں یہ ''برہموسماج'' کے نام سے ملک کے کونے کونے میں پھیل کر سماجی نظام کو نئی روشنی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پریم چند ''راجا رام موہن رائے'' برہموسماج اور گاندھی جی کی سوچ سے متاثر تھے۔ اس تحریک کا پریم چند پر علمی اور عملی دونوں طرح سے اثر ہوا۔ صغیر افراہیم اس طرف توجہ دلاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''راجہ رام موہن رائے کا یہ کارنامہ بلا شبہ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن ان کا تاریخی اہمیت کا حامل ایک کام اور بھی ہے۔ اس زمانے کے بعض ہندو مرد ایک سے زائد شادیاں کرتے۔ نتیجہ میں وہ اپنے مرنے کے بعد کئی عورتوں کو بیوہ چھوڑ جاتے۔ ہندو سماج میں بیواؤں کے لیے دوسری شادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔'' ۳۲

اس بری رسم کو راجہ رام موہن رائے اپنی تحریک کے ذریعہ نیست ونابود کرنے کی کوشش کی۔ اس کا اثر پریم چند کی زندگی اور تحریروں میں صاف نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ پریم چند نے ایک بیوہ سے شادی کی اور اپنے قلم کے ذریعہ ان کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ پریم چند تحریکات کا سہارا لے کر سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کا بیان کہانیوں میں جابجا کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے ''آہ بیکس''، ''بیٹی کا دھن''، ''نوک جھونک''، ''معصوم بچہ''، ''ابھاگن''، ''بدنصیب ماں'' وغیرہ اپنے افسانوں اور ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''روٹھی رانی''، ''جلوۂ ایثار''، ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن'' وغیرہ

ناولوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوؤں میں کثرت ازدواج اور

بیواؤں کے ان ہی مسائل کی جانب پڑھنے والوں کی توجہ دلائی۔''۳۳؎

اس کے بعد انھوں نے اپنی بات کو تقویت دینے کے لیے افسانہ ''بیوہ'' کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے پریم چند کی فنی وفکری نہج کو مندرجہ ذیل اقتباس سے سمجھا جا سکتا ہے:

''اگر کسی ناگہانی صدمہ سے یہ مکان گر پڑے تو ہم کل سے اسے پھر

سے بنانا شروع کر دیں گے مگر جب کسی عورت کی زندگی پر کوئی ناگہانی

آفت پڑ جاتی ہے تو اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس نام کو

روتی رہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے۔''۳۴؎

برہمو سماج کے علاوہ ایک دوسری تحریک ''آریہ سماج'' کے نام سے جانی جاتی ہے اس کے اثرات بھی پریم چند کی تحریروں میں صاف نمایاں ہیں۔ نیز غیر ملکی رجحانات نے بھی ہندوستانی ذہن کو متاثر کیا ہے۔ صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی قومی اور سماجی تعمیر میں بعض غیر ملکی اداروں اور افراد کی

کاوشیں بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے ملک کو مغرب کے نئے

رجحانات سے آگاہ کرایا اور ذی شعور حضرات کو مشعل راہ دکھائی۔۳۵؎

پریم چند کے یہاں تعلیمی رجحانات و تعلیمی سرگرمیاں نے جو دکھائی دیتی ہیں وہ انھیں تحریک کے زیر اثر نمودار ہوئی ہے۔ جنگ آزادی نے بھی وطن کی محبت کا ایک پیغام دیا جو ایک حیرت انگیز جوش ولولہ لوگوں میں جگایا ہے۔ جس میں چھوا چھوت، ذات پات اور مذہبی جبر کو پریم چند نے شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے ان کی مخالفت بھی کی ''پریم چند پر مختلف تحریکوں کے اثرات'' یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ مختلف تحریکات کے اثرات کا بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرا حصہ جنگ آزادی اور حب الوطنی کے درس کی نشاندہی پر مبنی ہے۔ صغیر افراہیم تجزیہ کرتے ہوئے اس موضوع پر اپنا اظہار خیال یوں پیش کرتے ہیں:

''پریم چند نے ان تمام تحریکوں کے مثبت پہلوؤں کے تاثر کو قبول کیا اور اپنے قلم کے زور سے ان کی کم وبیش آبیاری کرتے رہے۔''۳٦

اسی مضمون کے آخر میں صغیر افراہیم نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ پریم چند کی تحریروں میں سرفروشی کی تمنا اور شہادت کے جذبے کا جو تصور ہے وہ انھوں نے شاہ ولی اللہ اور تحریک مجاہدین سے قبول کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''پریم چند ایک نقیب'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس جانب قارئین کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ اس میں پریم چند کے عہد تک، میں نے برصغیر کی تقریباً ان تمام تحریکوں کا جائزہ لیا ہے جن کے اثرات انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیے یا ان کے ذہن پر مرتب ہوئے اور شاید میں نے پہلی بار پریم چند کے یہاں تحریک آزادیِ وطن کے جانبازوں میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک مجاہدین کے جاں نثاروں کا عکس دکھایا ہے۔ پریم چند کو تاریخی ناولوں کے غائر مطالعہ کا اعتراف ہے۔ یہ ناول عموماً مجاہدین کی سرفروشی پر مبنی ہوتے تھے۔ مجاہدین کی جانبازی سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے جس کی واضح جھلک ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی تھی۔ فارسی اور اردو سے تعلق تعلیم کے آخری مرحلوں تک رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ بھی ان سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے۔ بے شمار یادیں اس وقت تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی تحریکِ مجاہدین کے شرکاء کی جانبازی سے اثر قبول نہ کیا ہو۔''۳۷

''مختلف تحریکوں کے اثرات میں'' صغیر افراہیم نے لکھا ہے کہ جنگ پلاسی اور بکسر کی لڑائی کے بعد ٹیپو سلطان کی شہادت نے نہ صرف مسلم حکمرانوں کے اقتدار کا در پردہ فیصلہ کر دیا تھا۔ بلکہ مرہٹوں اور

راجپوتوں کے بگڑی ہوئی انحطاط پذیر صورت اور غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی قوت نے بہت سے ذہنوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔اس پس منظر میں متعدد تحریکیں وجود میں آ کر سر گرمِ عمل ہو چکی تھیں جن کا سلسلہ ہم شاہ ولی اللہ،شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی تنظیموں سے جوڑ سکتے ہیں۔

ان کا ایک دوسرا مضمون ''ہوری ایک علامتی کردار بھی ان کی نگاہ نقد کی باریک بینی کا آئینہ دار ہے صغیر افراہیم نے مضمون کی شروعات بڑے انہماک اور پختہ دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے:

''پریم چند گاؤں کی زندگی کی حقیقتوں،اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور سماجی جبر سے بخوبی واقف تھے۔''۳۸

اس کے علاوہ اس بات کی دلیل پریم چند کے اقتباس سے پیش کی ہے جس کو انھوں نے'' ہنس'' کے ایک شمارہ میں لکھا تھا وہ اقتباس یہ ہے:

پرجا کے پاس لگان دینے کو کچھ نہیں مگر سرکار لگان وصول کر کے چھوڑے گی۔چاہے کسان بک جائے زمین بے دخل ہو جائے،اس کے برتن بھاڑے،بیل بچھیا،اناج ،بھوسا سب کا سب بک جائے۔''۳۹

کئی دانشوروں کی رائے کو پیش نظر رکھ کر صغیر افراہیم نے ناول ''گئودان'' کا تجزیہ کیا۔یہ ناول ہندی اور اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول میں کسانوں اور مزدوروں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔مرکزی کردار''ہوری'' ہے جو پورے ناول میں حاوی رہتا ہے یہ علامت ہے کروڑوں کسانوں کی۔پریم چند نے اس کردار کے ذریعہ دراصل ملک کے کروڑوں کسانوں کی بے کسی و بے بسی کو اجاگر کیا کہ کس طرح یہ کسان ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔جب کہ وہ دن رات محنت کرتے ہیں لیکن انھیں محنت کے بدلے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔اسی داستان کو بیان کرنے کے لیے پریم چند نے''ہوری'' کو مرکزی کردار بنایا۔اس سلسلے میں پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''گئودان کا مرکزی کردار ہوری ان کروڑوں کسانوں میں سے ایک

ہے جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور زندگی کی مسرتوں سے دور، نیلے گگن کی چھاؤں تلے محنت ومشقت کے سہارے اپنا اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کا بوجھ اٹھانے کی انتھک کوشش کرتے ہیں۔ ماگھ پوس کی کپکپاتی رات اور جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں کمر توڑ محنت کرتے ہیں۔اس کے باوجود اُجرت اُتنی پاتے کہ پوری طرح پیٹ کی آگ بھی بجھانا ان کے لیے ممکن نہیں ہو پاتا''۔[۴۰]

ایک دوسری جگہ پروفیسر صغیر افراہیم ہوری کا منظر کشی کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''ہوری روایتی کسان ہے۔ روایت پرست، قدامت پرست، مذہبی، اپنی بات کا پکّا، محنتی اور ایماندار، ہر ظلم اور بے انصافی کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے والا اور لاکھوں کسانوں کی طرح رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا، روایتوں کو نباہنے والا اور مان مریادا کو بحال رکھنے کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ گنوا دیتا ہے''[۴۱]

صغیر افراہیم نے ہوری کے کردار میں صرف ایک کنبہ یا خاندان ہی نہیں بلکہ دیہی زندگی اور دیہی معاشرہ کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے وہ رقم طراز ہیں:

''.... گئودان میں ایک فرد کو لیکر کہانی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پورا معاشرہ اس ایک فرد کے اندر سمٹ آتا ہے اور وہ فرد پورے معاشرے کو منعکس کرتا ہے۔ ناول کا ابتدائی تاثر محدود اور اس کا محور ہوری کا کنبہ معلوم دیتا ہے۔ کہانی اس ایک خاندان کے گرد منڈلاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور رفتہ رفتہ احساس دلاتی ہے کہ پریم چند نے اس ایک خاندان کے سہارے پورے دیہی طبقہ کی زندگی بیان کر دی ہے۔''[۴۲]

آخر میں کہتے ہیں کہ ہوری کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی دھنیا اور اس کا بیٹا گوبر اس ناول کے اہم

کردار کی حیثیت رکھتے ہیں جو ناول کے کینوس پر مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ چھائے رہتے ہیں۔

''شاہکار تخلیق کفن'' پریم چند کی افسانوی عظمت پر دال ہے۔ یہ افسانہ پورے ہندوستانی ادب میں ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق افسانہ ''کفن'' دنیا کے چند بہترین افسانوں میں ایک ہے۔ صغیر افراہیم نے اس مضمون میں ان کا ایک اقتباس رقم کیا ہے:

> ''میں کفن کو بے تکلف دنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں.... یہ افسانہ اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ Black Humory کا شاہ کار نمونہ ہے اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے''۔۴۳

اسی طرح سے کئی ایک دانشوروں کے قول کو نقل کر کے اپنی بات کو مزید تقویت دے کر پریم چند کی دیہی معلومات اور انسانی دردمندی کو پیش کیا ہے چنانچہ اس کے بعد افسانے کی تکنیک اور خصوصیت کا مختلف دانشوروں کے خیالات کی روشنی میں ''کفن'' کی آفاقیت اور عروجیت کو بھی پیش کیا ہے افسانہ میں گھیسو اور مادھو اور بدھیا تین کردار ہیں۔ کہانی ان ہی کے اردگرد گھومتی ہے۔ بظاہر یہ کہانی روزمرہ پر مبنی ہے لیکن اس میں طنز کی ایسی چوٹ ہے کہ قاری تلملا اٹھتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں کیا واقعی ایسے معاشرے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ وہ شاہکار تخلیق کیوں ہے پھر اپنی بات کو تفصیلی گفتگو میں اس افسانے کے نئے نئے پہلو تلاش کیے ہیں جس کی وجہ سے صغیر افراہیم کی بالغ نظری کا مکمل ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

> ''کفن میں مرکزی کرداروں کے مکالمے، افسانہ نگار کے وضاحتی بیانات اور جا بجا بکھرے ہوئے نشیب و فراز افسانہ کے لہجہ کو طنز کا ایسا آہنگ دیتے ہیں کہ تمام تشکیلی عناصر اس میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور افسانہ ایک مکمل طنز کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔۴۴

''بدھیا'' اس افسانے کا تانیثی کردار ہے اس کے بارے میں صغیر افراہیم رائے قائم کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

''بدھیااس افسانے کا اہم ترین کردار ہے۔اس کی موت کے بعد بھی،اس کا تعلق بدستور فسانہ سے قائم رہتا ہے اور اس کے تعلق سے تمام تشکیلی عناصر سرگرم رہتے ہیں۔ بدھیا کی موت نے دونوں کردار کو متحرک کر دیا ہے۔''۴۵ے

اس کے بعد افسانہ کے کلائمکس اور مناظر کے تناؤ سے پیدا ہونے والی شدت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''افسانہ کا تناؤ اور کلائمکس اس وقت اپنے انتہائی نقطے پر پہنچتا ہے جب وہ کفن نہ خرید کر ساری رقم شراب و کباب پر اڑا دیتے ہیں اور بدمستی کی حالت میں سماجی قانونوں اور مذہبی و اخلاقی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں،اس کے کھوکھلے پن پر طنز کرتے ہیں،اس کی منافقت اور مصلحت پسندی کو بے نقاب کرتے ہیں۔''۴۶ے

افسانہ میں جہاں معاشرے کی برائیوں کو نشان زد کیا گیا ہے وہیں اس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی دکھایا گیا ہے۔حالانکہ افسانہ کے ابتدائی حصہ میں وہ کاہل،کام چور ضرور ہیں لیکن جب بدھیاں دردزہ سے تڑپ رہی ہوتی ہے تو مادھو کہتا ہے۔افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ بدھیا کی تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا''۴۷ے

پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون ''کفن'' کا آغاز کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

''پریم چند کا ہمارے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ان کے

افسانوں کا محور دیہات ہے۔ وہ شاید پہلے ہندوستانی ادیب ہیں:
جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ سے عوام کے مسائل سمجھنے کی
کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا اور اس لحاظ سے آخری بھی
کہ جن فضاؤں میں انھوں نے اپنے افسانوں کو جنم دیا پھر کسی دوسرے
ادیب نے اس جانب اتنی توجہ نہ دی''۴۸؎

گھیسو اور مادھو کتنے ہی نالائق اور مکار کیوں نہ ہو لیکن بدھیا کے مرتے وقت انھیں بھگوان ضرور یاد آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی اقدار پر انھیں پورا پورا یقین ہے۔ وہ مذہبی عقیدوں کو خوب مانتے ہیں۔ بدھیا کے مرتے وقت بھگوان سے دعا گو ہوتے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں کا مذہبی قدروں پر یقینِ کامل ہے۔ مادھو بھگوان کو مخاطب
کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''تم انتر جامی ہو'' اور گھیسو کا یہ کہنا ہے کہ
''ہماری آتما پرسَن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا۔'' اس بات کی
علامت ہے کہ نیکی اور دان پُن کا تصور ان کے یہاں موجود ہے''۴۹؎

پروفیسر صغیر افراہیم نے اس افسانے کا بخوبی مطالعہ کیا اور اس کو تمام زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے عام ناقد محروم رہتا ہے۔ افسانہ کی کہانی لاجواب ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اس میں معاشرے میں پھیلی غربت اور غربت کی وجہ سے پست اخلاق کو موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''''کفن'' پریم چند کی بڑی کامیاب فنّی تخلیق ہے۔ اس میں ان کا
مشاہدہ، فکر، تخئیل، زبان و بیان، فنی صلاحیتیں معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی
ہیں۔ فلمی تکنیک پر لکھے اس افسانے کا اندازِ بیان بالکل حقیقی محسوس ہوتا
ہے۔ سارے واقعات از اوّل تا آخر ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما

ہوتے ہیں۔ افسانے کے تمام ضروری اجزاء انتہائی سلیقے سے گُتھے
ہوئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور مسائل ابتدا ہی سے سامنے آتے ہیں
اوران کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ پڑھنے والے کی
دلچسپی اور تجسّس قائم رہتا ہے۔''۵۰

کتاب میں شامل ایک مضمون ''افسانہ نگار پریم چند'' کے عنوان سے ہے۔ پریم چند بحثیت افسانہ نگاران کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اس باب میں صغیرافراہیم پریم چند کواردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ پریم چند کی حب الوطنی ادب کی سنگلاخ زمیں انھیں کھینچ لائی اور تمام عمر اسی جذبے کے زیر اثر تخلیقی عمل سے گزرتے رہے۔ پریم چند اردو افسانہ کے بانی ہیں۔اور انھوں نے جدید افسانے کو ایک راہ دکھائی پریم چند سے قبل جو افسانے لکھے گئے ان میں رومانیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ بلکہ پریم چند کی اولین کہانیوں میں بھی اسی کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی اولین کہانیوں میں راج پوت، سورماؤں کی تعریف اور داستانوی انداز ملتا ہے۔صغیرافراہیم نے تحریک آزادی کے تناظر میں، پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ ''سوزوطن'' کا جائزہ لیا ہے۔ یہ اردو کا پہلا مجموعہ ہے بھلے ہی زمانی اعتبار سے پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار نہ ہوں۔

پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' ہے جو 1908ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعہ کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شامل افسانے حب الوطن پر مبنی ہونگے۔اس مجموعہ میں شامل افسانوں کے وطن سے متعلق محبت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔جیسا کہ پروفیسر صغیرافراہیم لکھتے ہیں:

''ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' کے نام سے ہی ان کی دلی
کیفیت اور ذہنی کرب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس مجموعہ کا پہلا
افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' بھی اسی تاثر پر مبنی ہے۔اس افسانہ
میں انھوں نے آزادیٔ وطن کی قدر و قیمت بتا کر ہندوستانی عوام کو اس
جانب راغب کیا ہے۔''۵۱

پریم چند کے زمانے میں ملک کے حالات بہت خراب تھے۔ظلم وتشدد بہت بڑھ چکا تھا۔ غیر ملکی

حکومتیں پوری طرح ہندوستان میں اپنا اثر و رسوخ کو قائم کر رکھا تھا۔ کسانوں اور لاچار لوگوں کو پریشان کیا جا رہا تھا۔ مجبور و مظلوم لوگوں کو ستایا جا رہا تھا۔ ایسے پر خوف ماحول میں جب پریم چند نے دیکھا تو وہ گھبرا گئے وہ اس سے نجات کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کی نمائندگی ان کا افسانہ ''کفن'' کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی کہانیاں لکھی۔ جن میں ان تمام برائیوں کی مخالفت کی گئی ہے۔

''واردات'' پریم چند کا آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ 1937ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس میں 13 افسانے شامل ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اس مجموعہ میں شامل تمام افسانوں کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ مجموعہ کا پہلا افسانہ ''شکوہ و شکایت'' ہے جو ماہنامہ جامعہ، جنوری، 1937 میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں جہیز اور کنیا دان کے متعلق مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا افسانہ ''معصوم بچہ'' ہے جو ہندی میں اپریل 1933ء میں ''ہنس'' میں شائع ہوا۔ مرکزی کردار ''گنگو'' ہے۔ جو برہمن ہے اپنے آپ کو دوسری ذات کے لوگوں سے افضل سمجھتا ہے۔ اس افسانے میں ذات پات کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر افسانے کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں پروفیسر صغیر افراہیم اس مجموعہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کا یہ مجموعہ ان کے افکار و خیالات، عصری صورتِ حال پر ان کی نگاہ عمیق اور فن افسانہ نگاری پر ان کی زبردست دسترس کا ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس کی سیر، ہمیں جدید اردو فکشن کے اولین افسانہ نگار کی جملہ صلاحیتوں سے واقف کراتی ہے۔ آج تک ہماری تنقید جن خطوط پر فن پارے کے تعلق سے سوچتی اور اظہار کرتی آئی ہے ان سبھی کے مطابق پریم چند کا فن اور بطور خاص ''واردات'' میں پیش کردہ فن پارے ایک مثبت تاثر چھوڑتے ہیں

جو دیر پا ہے اور ہر دور کے (تبدیل ہوتے ہوئے) معیاراتِ تنقید پر
پریم چند کے افسانے پورے اترتے ہیں۔''۵۲؎

صغیرافراہیم اپنے مضمون ''پریم چند بحثیت ناول نگار'' جو ان کی کتاب ''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' میں شامل ہے۔اس میں انھوں نے پریم چند کے ناولوں کا تجزیہ کے دوران یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کونسا ناول ہندی میں اور کب اردو میں اور ہندی میں شائع ہوا۔ ناولوں کا پس منظر اور موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افسانوں کے علاوہ پریم چند نے 12 ناول بھی تخلیق کیے۔ تیرہواں ناول ''منگل سوتر'' نامکمل ہے۔ان کا پہلا ناول ''اسرار معابد'' ہے جو بنارس ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' میں 18 اکتوبر 1903ء کو قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور 1905ء کو اختتام پر پہنچا۔

''اسرارِ معابد'' میں مذہبی ٹھیکے داروں کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔عبادت گاہوں میں عقیدت مندوں کے اعتقادات سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کے خلاف سخت آواز اٹھائی ہے۔

صغیرافراہیم مانتے ہیں کہ ''گوشہ عافیت'' پریم چند کا اہم ناول ہے جس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی اقتصادی وسماجی بدحالی کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح ناول ''نرملا'' ''بیوہ'' ''گئودان'' کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

''گئودان'' کے بعد سب سے اہم ناول ''میدانِ عمل'' ہے۔ جو 1938ء میں شائع ہوا۔ یہ دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ ہندی میں ''کرم بھومی'' کے نام سے یہ ناول جنگِ آزادی کی جدوجہد کو لے کر ایک کہانی کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ صغیرافراہیم نے پریم چند کے تمام ناولوں پر روشنی ڈالی ہے۔اوران میں نئے نئے پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔صغیرافراہیم لکھتے ہیں:

''پریم چند نے اپنے ناولوں میں جن مسائل کو شدت سے اُجاگر کیا ہے
اُن میں جذبۂ ایثار وقربانی، قوم کی کردار سازی، استحصالی نظام سے
ہونے والی تباہی و بربادی اور معاشرتی زبوں حالی ہے۔ جہیز کی قبیح رسم
پر انھوں نے مختلف زاویوں سے یلغار کی ہے۔''۵۳؎

پریم چند نے اپنے ناولوں میں جن جن طبقوں کے مسائل کو ملحوظ رکھا ہے اسی کے متعلق زبان بھی استعمال کی ہے عوامی مسائل، عام فہم زبان، بول چال کی یہ زبان سادہ، سلیس اور لچکدار ہے جس میں بلا کی کشش ہے۔ پریم چند نے اپنے آپ کو تصنع و تکلف اور آرائش و زیبائش والے الفاظ سے بچا کر رکھا ہے۔

صغیر افراہیم پریم چند کے ڈراموں کا جائزہ اپنی مشہور کتاب ''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' میں بہت احسن طریقہ سے لیا ہے اس کے لیے ایک خاص باب ''پریم چند بحیثیت ڈراما نگار'' کے نام سے منسوب کیا ہے اس میں انھوں نے ڈراما کے اجزائے ترکیبی سے بحث کی ہے اور ارسطو کی بوطیقا کا سہارا لیکر عالمی سطح پر ڈرامے کے چھ اجزا تسلیم کیے ہیں جیسے قصہ، پلاٹ، کردار، مکامہ، زبان، خیال، آرائش، اسٹیج اور موسیقی وغیرہ، قصہ یعنی پلاٹ سرے فہرست اس لیے رہا ہے کہ اس واقعات میں روئیدگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ پریم چند نے کئی اہم ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ جن میں ''سنگرام''، ''کربلا'' قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان ناول اور افسانہ ہے۔ پریم چند کے زمانے میں حکیم احمد شجاع، پروفیسر مجیب، امتیاز علی تاج اور جگت موہن لال رواں وغیرہ بھی ڈرامے لکھ رہے تھے۔ پریم چند جس دور میں ڈرامے لکھ رہے تھے اس وقت وہ کہانیوں میں مصروف تھے۔ وہ ان کہانیوں کے ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ڈراما کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے کیونکہ ان کا ذہن کہانیوں میں الجھا رہا جس سے وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کر سکیں اس لیے ان کے ڈراموں میں وہ بات نظر نہیں آئی، جو ڈرامے کے لیے خاص ہے۔ پریم چند کی نظر کہانیوں کی نوک پلک سنوارنے میں رہی اس لیے وہ ڈراموں میں زیادہ کامیاب نہ ہو پائے اس کے متعلق پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''پریم چند نثر کی دیگر اصناف کی طرح ڈرامے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے، شائد اس وجہ سے بھی کہ ان کی تمام تر توجہ کہانی کی بُنت اور برتاؤ پر مرکوز ہو جاتی تھی اور اُسی فضا میں وہ کرداروں کو تحلیل کیا کرتے تھے جو ناول اور افسانہ کے لیے تو خوب سے خوب تر ثابت ہوئے مگر ڈرامے کو تقویت نہیں پہنچا سکے۔'' ۵۴

پروفیسر صغیر افراہیم نے پریم چند کے خطوط پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اس سے پریم چند کے ذہن تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ پریم چند نے 690 خطوط لکھے ہیں۔جن میں 465اردو میں ہیں220ہندی میں اور 5انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ 660خطوط شخصیت کے لیے مخصوص ہیں۔ایڈیٹر یا ادارے کے نام 23 خطوط ہیں اور بغیر نام کے خطوط 7 ہیں۔ 58لوگوں کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں۔جن میں 350 خطوط صرف دیا نرائن نگم کو لکھے گئے ہیں۔

اسی طرح مدن گوپال نے مکتوبات پریم چند کے تعلق سے''کلیات پریم چند'' کی جلد نمبر سترہ ۱۷ میں پریم چند کے چھ سو نوے ۶۹۰ خطوط یکجا کر دیے ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں پریم چند کے خطوط پہلی بار منظر عام پر آتے ہیں۔جن کے توسط سے مصنف کی مجموعی شخصیت پر نقادوں نے روشنی ڈالی۔ چھ سو پیتالس ۶۴۵ صفحے پر مشتمل مذکورہ مجموعہ کے مطابق پہلا خط ۳ جنوری ۱۹۰۵ء کا اور آخری خط ستمبر ۱۹۳۶ کا ہے۔اس سے زیادہ کوئی تفصیل مجموعہ سے نہیں مل پاتی ہے بقول صغیر افراہیم:

> ''اس سے زیادہ نہ تو مقدمہ میں ذکر ہے اور نہ ہی کوئی فہرست وغیرہ دی گئی۔ کتنے خط کس کے نام ہیں، کس زبان میں لکھے گئے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے، شیرازہ بندی کس طرح کی جاسکتی ہے، یہ سارے کام قاری کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔شکوہ وشکایت اور تنقیص سے قطع نظر میں نے اس جانب توجہ دی تو اردو میں ۴۶۵، ہندی میں ۲۲۰ اور انگریزی میں لکھے گئے پانچ خط منظر عام پر آتے ہیں۔شخصیات کے نام ۶۶۰، ایڈیٹر یا ادارے کے نام ۲۳ اور بغیر نام کے ۷ خط مذکورہ مجموعہ میں ہیں۔۵۸ لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط میں محض دیا نرائن نگم کے نام ۳۵۰ مکاتیب ہیں۔''۵۵

اسی طرح'' مکتوبات پریم چند کا معروضی مطالعہ''میں صغیر افراہیم نے سماجی ،سیاسی ،صحافتی،

ادبی،نفسانی اور رسمی جیسے عنوانات کے تحت مکتوبات کی شیرازہ بندی کی ہے کہ پریم چند نے 138 سماجی، 83 سیاسی، 110 صحافتی، 70، ادبی 49، نفسیاتی اور رسمی 140 خطوط لکھے ہیں۔ ان خطوط میں انسانی خواہشات،نفسیات، جذبات اوراحساسات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پریم چند جب کسی کواپنی تخلیق ارسال کرتے تواس کا جوبھی جواب آتا تواس کے متعلق بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یاان پرکوئی اعتراض کرتا ہےتواس کی وجہ بھی پوچھتے ہیں۔اس کا جائزہ صغیرافراہیم نے اپنی کتاب ''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' میں بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہےاس سلسلے میں کشن سنگھ کولکھے گئے ایک خط کا اقتباس صغیرافراہیم نے حوالے کےطور پرپیش کیا ہے:

> ''کرم بھومی تمھیں بہت بُری نہیں لگی۔اس سےخوشی ہوئی۔اس کی کہیں آلو چنا کردو۔''۵۶

پریم چند کےخطوط کے متعلق پروفیسر صغیرافراہیم لکھتے ہیں:

> ''پریم چند جلدنمبر 17 میں شامل تمام خطوط کسی دیومالائی کردار کی نہیں بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ پُر وقار شخصیت جس نے اپنا زورِقلم غلام دیس کوآزاد کرانے،تعلیم کی اہمیت کو اُجاگر کرنے،اردو، ہندی کوقریب لانے، بھائی چارےکوفروغ دینے، جاگیردارانہ نظام اوراُس کے اندر پنپنے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے، استحصال پسندوں کو بےنقاب کرنے، ذات پات کی تفریق کا انسداد کرنے، قدیم فرسودہ رسوم کو مٹانے اورعورتوں کو اُن کا سماجی مرتبہ دلانے پرصرف کیا ہے۔''۵۷

پریم چند کے غیرافسانوی تخلیقات کی طرف عام قاری کی توجہ کم ہی رہتی ہے۔دراصل اس کی صرف یہی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ انھوں نے افسانوی ادب میں اتنا سب کچھ لکھ دیا ہے کہ قاری انہیں میں الجھ کررہ جاتا ہےاوراس کی نگاہ غیرافسانوی تخلیقات کی طرف بہت کم ہی جاتی ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے پریم چند کی غیر افسانوی تخلیقات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون ''پریم چند کی غیر افسانوی تحریروں کا تحقیقی مطالعہ'' میں پریم چند کی غیر افسانوی تخلیقات کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ پریم چند کی پہلی غیر افسانوی تحریر ''الیور کروم ویل ہے'' جو 1903ء میں اخبار'' آوازِ خلق'' میں یکم مئی سے 24 مئی کے درمیان شائع ہوئی تھی۔ پریم چند کی آخری تحریر 1936 کا وہ خط ہے جوانھوں نے اپنے انتقال سے چند دنوں پہلے حسام الدین غوری کو لکھا تھا۔

صغیر افراہیم نے پریم چند کے سوانحی مضامین کا بھی جائزہ لیا ہے آپ کہتے کہ پریم چند نے سوانح مضامین 27 لکھے ہیں۔ جو صاف ستھرے انداز میں ہیں۔تنقیدی مضامین کی تعداد اردو میں 10اور ہندی میں 18 ہے۔ پریم چند نے یہ مضامین ''زلیخا قیس''، ''راجہ ٹوڈر مل''، ''راجہ مان سنگھ''، ''رانا پرتاپ''، ''مولوی وحیدالدین سلیم''، ''عبدالحلیم شرر'' کی شخصیات پر لکھے ہیں۔

پریم چند کی ایک حیثیت مُبصّر کی بھی رہی ہے۔ان کے اردو میں 17 تبصرے ہیں پہلا تبصرہ حکیم محمد علی برہم کے تاریخی ناول ''کرشن کنودا'' پر کیا ہے۔اسی طرح مولوی ذکاء اللہ، محمدی بیگم کی کتابوں پر بھی تبصرے کیے ہیں۔

پریم چند ایک مترجم بھی ہیں۔انھوں نے سب سے پہلے منشی دجوی پرشاد کا ناول ''روٹھی رانی'' کو اردو میں منتقل کیا، رتن ناتھ سرشار کے ناول فسانہ آزاد کا ترجمہ'' آزاد کتھا'' کے نام سے کیا ہے۔اسی طرح آپ کئی کتابوں کے مترجم بھی ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے تحقیقی مقالے میں پریم چند کی غیر افسانوی تخلیقات کا بھر پور جائزہ لیا ہے۔اوران کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کے متعلق علی احمد فاطمی کے بیانات صدفی صد صحیح ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کسی مغربی نقاد نے اچھی بات کہی ہے کہ عمدہ تخلیق فنکار کو بڑا بناتی ہے اور بُری تنقید خود نقاد کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ ان تحریروں سے خود صغیر کا قد بڑا ہو جاتا ہے۔ یوں بھی وہ ایک قد آور انسان ہیں، اب بطور نقاد اور

پریم چند شناس اُسی قد اور قدر کے ہو گئے ہیں۔'' ۵۸ؔ

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر صغیر افراہیم نے جس خوش اسلوبی اور غیر جانبدارانہ انداز سے پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ کیا ہے اس کو اس کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے دور میں پریم چند شناس کے حوالہ سے سب سے بڑا نام پروفیسر صغیر افراہیم کا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی:

علی احمد فاطمی اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم شخصیت ہے۔ وہ ناول اور افسانہ کی پرکھ میں فکری اور سماجی محرکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ روایتی انداز میں کسی فن پارہ کو نہیں پرکھتے بلکہ اس کی خامیوں اور کمیوں کو بھی قاری کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ نقد بے باکانہ ہے اور بے خوف و خطر اپنے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔

علی احمد فاطمی پریم چند کے ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے پریم چند شخصیت اور تخلیقات پر کئی مضامین لکھے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ 1980ء کے بعد پریم چند پر لکھنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ انھیں پریم چند سے سچی عقیدت ہے شاید اسی لیے پریم چند کو ہر زاویہ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پریم چند کو نئے تناظر میں سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ پریم چند پر ان کی تصنیف کا نام ہے'' پریم چند نئے تناظر میں'' مصنف کا خیال ہے کہ ہمارے ناقدین نے پریم چند کو اس طرح نہیں سمجھا جیسا دوسری زبانوں کے ناقدین نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے انھوں نے پریم چند کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی سماجی، تہذیبی، معاشی حالات کا اندازہ صرف پریم چند کی تخلیقات کے ذریعہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ان تخلیقات میں گہرا تاریخی شعور، فکری وفنی بصیرت اور سماج کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔

پریم چند ابتدا میں رومانی اور داستانی انداز میں لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں اس روایت سے انحراف کیا۔ پریم چند نے رشتوں کی معنویت، اخلاقی اقدار اور سماجی حقیقتوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اردو ادب کو ایسے کردار دیے جو ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ اور ان ہی سے آئیندہ کی راہ آسان ہوگئی۔

چنانچہ علی احمد فاطمی اپنے ایک مضمون ''پریم چند کیوں یاد آتے ہیں'' میں لکھتے ہیں:

''غور کیجئے اگر دھنیا نہ ہوتی تو رانو اور شمّن جیسے کردار بھی نہ ہوتے اور شاید پیغام آفاقی کی نیرا کو بھی جنم دینے میں دیر لگ جاتی۔ اسی طرح اگر گھیسو، مادھو، ہلکو، دکھی وغیرہ نہ ہوتے تو کالو بھنگی، منگو کوچوان، گڈریا، جگّا بھی نہ ہو پاتے اور غضنفر کا کالو بھی نہ ہو پاتا'' ۵۹

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند کے بعد فکشن لکھنے والوں میں پریم چند کا عکس ضرور ملتا ہے۔ اور وہ لوگ پریم چند کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے کرداروں کے ذریعہ اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں اونچ نیچ، ذات پات، ظلم وتشدد، استحصال وغیرہ اور آزادی کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ وہ ان تمام سماجی برائیوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ وہ آزادی کے قائل تھے اور انگریزوں کی مخالفت بھی کی اور پریم چند نے پہلی بار ان برائیوں کے خلاف قلم اٹھایا۔ پریم چند سے قبل جو بھی ادب ملتا ہے وہ معشوق کی زلفوں کا اسیر نظر آتا ہے۔ اس میں ایسے مضامین نہیں ملتے جن پر پریم چند نے قلم اٹھایا۔ چنانچہ علی احمد فاطمی نے اپنے ایک مضمون ''پریم چند روایت ساز یا روایت شکن'' میں لکھتے ہیں:

''پڑھ جایئے پریم چند سے قبل اردو کا سرمایۂ ادب۔ کیا کہیں ملتی ہے ہل بیل کی بات، دیہات اور قصبے کے حالات۔ بیکسی و بے بسی کے حادثات بھوک وغریبی کے واقعات۔ ذات و پات کی کڑوی بات۔ مولوی اور پنڈت کے کرامات اور ادب میں شامل باضابطہ افکار اور نظریات۔ کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔'' ۶۰

پریم چند سے قبل جو بھی ادب ملتا ہے اس میں معشوق کی زلفوں کا ذکر ہے تو کہیں شہزادیوں کے حسن کی تعریف نظر آتی ہے جہاں ایسے حسن وخوبصورتی کا برملا اظہار ہو وہاں پریم چند کے دور کے موضوعات ملنا مشکل ہیں۔

''پریم چند روایت ساز ہیں یا روایت شکن'' اس بارے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا مضمون قابلِ ذکر ہے۔انھوں نے اس مضمون میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہ آخر پریم چند نے پرانی روایت کو منہدم اور منقسم کیا ہے۔علی احمد فاطمی کا خیال ہے کہ جس زمانے میں پریم چند نے آنکھیں کھولی تو اردو اپنی ترقی پر تھی اور ہر علاقہ میں بولی جاتی تھی۔1857ء کا انقلاب بھلے ہی نرم ہو گیا تھا لیکن اس کی چھبن ابھی بھی دل میں باقی تھی۔اسی چھبن نے پریم چند کو اکسانے کا کام کیا۔پریم چند نے اپنے گاؤں لمہی میں جب آنکھیں کھولیں تو کچا گاؤں تھا اور متوسط طبقے کی چھاؤں اور حقیقی ماں کا انتقال،سوتیلی ماں نے پالا غربت اور مفلسی ہر طرف کسانوں اور مزدوروں کا استحصال ہو رہا تھا۔ایسے حالات نے پریم چند کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا اسی کے ساتھ ساتھ بنگال کا دو حصوں میں تقسیم ہونا،مظفر پور بم دھماکہ ہونا یہ تمام باتیں پریم چند کے ذہن میں رچ بس گئی تھیں۔دوسری طرف طلسم ہوش ربا اور سرشار اور شرر کے ناولوں کے مطالعے نے ان کے قلم میں جادو پھونک دیا۔اس طرح دونوں باتوں نے دھنپت رائے کو پریم چند بنا دیا۔اور ایسی فکشن کی بنیاد ڈالی جو حقیقت پر مبنی ہے۔جن میں مزدور، لاچار اور کسانوں کی پریشان حالی کا ذکر ہے۔جس کی وجہ سے ہوری، دھنیا، نرملا، امرت کانت جیسے کردار وجود میں آئے جس کی پیروی بعد کے فکشن نگاروں نے کی۔''کفن''، ''پوس کی رات''، ''نجات''، ''عیدگاہ'' جیسی کہانیاں لکھی دیں۔انھیں چند باتوں نے پریم چند کو رومانی اور داستانی ادب لکھنے کے بجائے یہ ادب لکھنے پر مجبور کر دیا۔

جدیدیت کے دور میں پریم چند پر کئی اعتراضات کئے گئے کہ انھوں نے اردو افسانے کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچائی ہے۔انھوں نے حقیقت نگاری سے کام لے کر اردو افسانے کی حقیقت کو مٹی میں ملا دیا۔اگر منٹو اور بیدی نہ ہوتے تو افسانے کی آبرو باقی نہیں رہتی۔اس اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے علی احمد فاطمی کچھ سوالات قائم کئے ہیں۔انھوں نے کہا ہے کہ جس افسانے کی بنیاد پریم چند نے رکھی تھی کیا آج وہ افسانے لکھے جا رہے ہیں۔کیا اس کی قدر و قیمت یا اس میں وہ تابنا کی اتنی باقی ہے جو کل تھی؟

آج افسانے خوب لکھے جا رہے ہیں۔کیا اس معیار کے افسانے لکھے جا رہے ہیں؟ جو پریم چند نے لکھے تھے۔اتنی ترقی کے باوجود اردو افسانہ میں وہ سماجی شعور، سیاسی بیداری اور اخلاقی اقدار کا ذکر اور حقیقت

نگاری ملتی ہی نہیں۔علی احمد فاطمی کا خیال ہے کہ آج جو اردو افسانہ اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ ہے جو پریم چند نے پہلی بار حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے معاشرے کے طبقاتی تقسیم کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے پہلی بار مزدور، کسان، لاچار، مفلس، بیوہ، جاگیردار، مہاجن وغیرہ کو اپنے ناولوں کا کردار بنایا ہے۔

پریم چند نے ایسی کہانیاں لکھیں جس سے اتحاد واتفاق پیدا ہو کسی بھی طرح کوئی نفاق اور تفریق پیدا نہ ہو ایسے ادب اپنے آپ کو بچا کر رکھا پریم چند کے معترضین کا کہنا ہے کہ پریم چند کائیستھ تھے۔ کسی نے انھیں سود خور کہا اور کسی نے تنگ نظر اور فرقہ پرست کہا، کسی نے اعتراض کیا کہ عورت احتجاج اور انقلاب کے سلسلے میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا کسی نے انھیں دلت مخالف بھی کہا لیکن ان تمام اعتراضات کے باوجود پریم چند ایک بڑے فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

دوسری طرف علی احمد فاطمی نے پریم چند کے حوالے سے ناقدین کی رائے کو پیش کیا ہے کہ اردو کے اہم ناقدین کا پریم چند کے متعلق کیا رویہ نظر آتا ہے۔ جیسے ایک جگہ مثال دیتے ہوئے مدن گوپال کا یہ اقتباس لکھتے ہیں کہ ''پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بہت حامی تھے''، پروفیسر محمد حسن پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''انسان دوستی پریم چند کے اندازِ فکر کا بنیادی عنصر ہے'' ان اقوال کی روشنی میں اور پریم چند کے سوانح حالات اور تخلیقات کو پڑھ کر علی احمد فاطمی نے اندازہ لگایا کہ یہ اعتراضات بے جا ہیں۔ جب کہ ان کی کہانیوں میں اتحاد واتفاق کی باتیں ملتی ہیں۔ پریم چند نے ہر اس عمل کی مخالفت کی جو ہندوستانی تہذیب یا ہندو مسلم اتحاد میں نفاق پیدا کرے اور ہر اس تحریک کی حمایت کی کہ جو باہمی محبت اور دوستی کا دم بھرتی ہے۔

پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ اور دونوں کے حامی بھی تھے۔ ان کے متعلق کوئی نفاق پیدا نہ ہو اس کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ وطن سے محبت، انسان دوستی کرنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ علی احمد فاطمی اپنے مضمون ''پریم چند اور فرقہ واریت'' میں لکھتے ہیں:

> ''پریم چند یکجہتی اور انسان دوستی کا تصور پیش کر رہے تھے جس میں ان کا
> انسانی جذبہ تو کام کر ہی رہا تھا، نیز گہرا سیاسی اور قومی نظریہ بھی کام کر رہا

تھا۔‘‘[۶۱]

پریم چند ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون مانے جاتے ہیں۔ جب ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس ہوئی تو اس کی صدارت پریم چند سے کروائی گئی کیوں کہ سب لوگ ان کی عظمت کے قائل تھے اور یہ جانتے تھے کہ اس وقت کی ایک بڑی شخصیت ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ترقی پسند لوگوں سے پہلے کے ترقی پسند ہیں۔ترقی پسند تحریک کے تحت جو ادب لکھا گیا وہ آسان سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا۔حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے مجبور اور لاچار لوگوں کو کہانی کا موضوع بنایا گیا۔ پریم چند ترقی پسند تحریک کے مشورے سے پہلے ہی ایسا ادب لکھ رہے تھے جس میں مجبور بے کس اور مفلس لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔گئودان میں حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ظلمت پسندی تو ہم پرستی کا بیان ہے۔اس میں جو اہم کردار ہیں وہ اپنی زبانی اس دور کی جیتی جاگتی کہانی سنا رہے ہیں۔اسی طرح ’’کفن‘‘ میں ایک عورت کی سسکیاں غریبی اور مفلسی کا ایک ہنگامہ اور اخلاقی اقدار کی پامالی نظر آتی ہے۔’’پوس کی رات‘‘ کا ہلکو،’’نجات‘‘ کا دکھی،’’عیدگاہ‘‘ کا حامد، یہ سب کردار اپنے دور کی حقیقی کہانیوں کو بیان کررہے ہیں۔ان باتوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند ترقی پسندوں سے پہلے ترقی پسند فکشن نگار ہیں۔ان سب کا جائزہ علی احمد فاطمی نے اپنی کتاب ’’پریم چند نئے تناظر‘‘ میں بحسن خوبی لیا ہے۔

اردو نظم ہو یا نثر دونوں میں عورت کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔عورت کو ہزار زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔عورت کے حسن اور اس کی خوبصورتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اردو کہانیوں میں بھی عورت موضوع کثرت سے استعمال ہوا ہے۔لیکن کیا ان کہانیوں میں عورت کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسا پریم چند کے یہاں ملتا ہے۔اور پہلے عورت کوٹھے پر نظر آتی ہے یا کشمیر کی وادیوں میں کمر ہلاتی دکھائی جاتی ہے علی احمد کہتے ہیں کہ پریم چند نے پہلی بار عورتوں کو اصل روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کے نسوانی کردار کھیتوں میں محنت ومشقت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے گھر بار چلاتے ہوئے ظلم وتشدد کے خلاف آواز اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں میں بدصورت عورتیں معمولی عورتیں، بوڑھی عورتیں، بیوہ

عورتیں، سوتیلی عورت کا تصور یہ سب نظر آتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کی کہانیوں کے عنوان بھی کچھ اس طرح ملتے ہیں۔ ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''راج پوت کی بیٹی''، ''بیٹی کا دھن''، ''ابھاگن''، ''مالکن''، ''سوتیلی ماں''، ''بوڑھی کاکی'' وغیرہ ان کہانیوں کے کردار دھنیا، ملیا، بدھیا، منی، کالی، دادی، خالہ اور روپا وغیرہ ایسے ہیں جو اپنے حق کے لیے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ علی احمد فاطمی ان کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''پریم چند کے نسوانی کرداروں کی ایک جھلک'' میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'پریم چند کی عورتیں، بیویاں، بیٹیاں، ماں، بہن صرف گھر کی چہار دیواری میں ہی نہیں۔ کھیت، باغ، چوپال، یہاں تک کی پورے دیہی سماج میں مرد کی محنت ورفاقت میں برابر کی شریک ہیں اس لئے کہ پریم چند ان کو کوئی الگ قوم، ذات یا جنس سمجھ کر اوڑھی ہوئی ہمدردی نہیں دکھاتے بلکہ اسی گھر سماج، معاشرہ اور زندگی، اس کے تصادمات اور تضادات کا ناگزیر حصہ، صرف شوہر کی زندگی کا نہیں بلکہ پوری دُنیا کا ایک خوبصورت، مضبوط اور نا قابل فراموش حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کی کمزوری کو سماج کی کمزوری بنا کر پیش کرتے ہیں۔''[۶۲]

اس سلسلے میں علی احمد فاطمی کہتے ہیں کہ دراصل پریم چند کے نسوانی کردار مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ''گئودان'' میں دھنیا، ہوری کے ساتھ رہتی ہے۔ کھیت جاتی ہے اور ہوری کے تمام دکھ سکھ کو اپنے دکھ سکھ سمجھتی ہے۔ دھنیا غریب ہے کسان کی بیوی اور ایک ماں بھی ہے۔ بوڑھی ہو چکی ہے۔ لیکن محنت اور مشقت مسلسل کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنے شوہر کے سنسکاروں کے آگے مجبور ہے پھر بھی جب ہیرا گائے کو زہر دے کر مار دیتا ہے، ہوری کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اپنی محنت سے اس بات کو منوا لیتی ہے کہ زہر ہیرا نے دیا۔ دھنیا جیسے سینکڑوں کردار ہیں جو دھنیا کی طرح محنت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ دھنیا کے ساتھ ساتھ اور بھی

کردار انقلابی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ایک مضمون ''پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ'' لکھا جس میں پریم چند کے ناولوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مضمون میں پروفیسر قمر رئیس کی کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔جس میں پریم چند کے سوانح حالات مختلف تحریکات سے وابستگی، ذہنی تبدیلی تغیر وتبدل کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے بعد ان کے ناولوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔اسرارِ معابد اور ہم خرما و ہم ثواب، جلوہ ایثار، گوشہ عافیت، بازارِ حسن اور چوگانِ ہستی کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کیا ہے۔

پریم چند نے ایسے بھی افسانے لکھے ہیں جو کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا تھا تب وہ راج پوت، سورماؤں کے گن گاتے ہوئے نظر آتے تھے۔لیکن علی احمد فاطمی کا خیال ہے کہ بعد میں ان کے ذہن میں بالیدگی آئی اور ایسے تاریخی افسانے بھی لکھے جو کامیاب ہوئے۔ ان تاریخی افسانوں میں ان کی تحریکات سے وابستگی کا اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان تاریخی افسانوں میں ان کی زندگی میں ہونے والے حادثات کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

پریم چند کے تاریخی افسانوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان کا پہلا شائع شدہ افسانہ ''عشق دنیا اور حبِ وطن'' ہے۔ یہ ایک تاریخی افسانہ ہے اس افسانے کو بعد میں سوزِ وطن کے افسانوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کا پس منظر اٹلی کی تاریخ سے ابھرتا ہے علی احمد فاطمی نے اس کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔اٹلی کے مشہور ومعروف حبِ وطن، میزینی کی زندگی کے چند اوراق کو شامل کیا گیا ہے۔میزینی کا وطن اٹلی دشمنوں کے قبضے میں ہے علی احمد فاطمی کا خیال ہے کہ اس افسانے میں مقصد آگے آگے چلتا ہے۔اور افسانہ پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ پھر بھی افسانہ قدرے دلچسپ ہے اور 1870ء کے اٹلی کے ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ایک اور تاریخی افسانہ ''سارندھا'' بھی قابلِ ذکر ہے۔ بندیل کھنڈ کے مشہور ومعروف خاتون سارندھا کا ذکر ہے جس کی عظمت ثروت بے باکی اور بے خوفی کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں راج پوتوں کے کرداروں کی چمک اور جرأت کی ایسی جھلک دکھائی دیتی ہے جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔

راجہ ہردول اور آلھا اچھے تاریخی افسانے ہیں۔ راجہ ہردول بہادر اور باکردار ہے۔اس کا بھائی راجہ جوجھا سنگھ اپنی بیوی اور حکومت کو اس نگرانی میں چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں چلا جاتا ہے۔اس کا بھائی شک کرتا۔اور راجہ ہردول اس شک کو دور کرتا ہے۔آلھا اور اودل کے قصے بھی ہر گھر میں سنائے جاتے ہیں۔ انھوں نے پرتھوی راج کے مقابلے میں جنگ کر کے اپنی بہادری اور شجاعت کی مثال پیش کی ہے۔ان افسانوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند نے بہت ہی عمدگی اور بالیدگی کے ساتھ تاریخی افسانے لکھے ہیں۔علی احمد فاطمی اپنے ایک مضمون ''پریم چند کے تاریخی افسانے'' میں لکھتے ہیں۔

> ''لمحے بھر کے تاریخی فکشن کے فرائض سے چشم پوشی کر کے ان فرائض کا تجزیہ کیا جائے جو اس عہد کے سیاسی وسماجی ماحول میں پریم چند جیسے حساس،قوم پرور انسانوں کے دل ودماغ میں گونج رہے تھے تو شاید یہ افسانے اپنے مقصد کے اعتبار سے قطعی ناکام نہ تھے،اور ان تمام باتوں سے قطع نظر پریم چند کے متعلق کسی موضوع پر بات کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ پریم چند اردو کہانی کے بانی تھے اور اردو فکشن کے وہ تمام تقاضے جو بعد میں جاگے اس وقت تقریباً سو رہے تھے۔''۶۳

ان کے تاریخی افسانوں کو اس عہد کے سماجی وسیاسی ماحول کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

سوز وطن کی تمام کہانیاں صرف ایک ہی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے وہ مقصد ہے وطن سے محبت۔ یہ کہانیاں پریم چند کی اولین کہانیاں ہیں لیکن کامیاب ہیں۔علی احمد فاطمی نے سوزِ وطن کے ان کہانیوں کا جائزہ لیا ہے اور اپنے ایک مضمون ''سوزِ وطن چند باتیں'' میں اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کا یہ مجموعہ دو اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اول تو یہ کہ یہ کہانیاں پریم چند کی ابتدائی کہانیاں ہی نہیں بلکہ اردو کی ابتدائی کہانیاں

ہیں لیکن غور سے پڑھا جائے تو اس سے زیادہ اس کی اہمیت اس کے دیباچہ سے بڑھتی ہے جس کا ایک ایک جملہ نہ صرف 'سوز وطن' کی کہانیوں سے متعلق ہے بلکہ اس وقت کے پورے ادب کو متاثر کرتا ہے۔''٦٤؎

افسانہ ''کفن'' کا تجزیہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی کہتے ہیں کہ یہ پریم چند کا شاہکار افسانہ ہے۔ یہ انھوں نے آخری ایام میں لکھا تھا۔ اس میں زندگی بھر کی محنت، علم، تجربہ اور شعور شامل تھا۔ اور واقعی یہ کامیاب افسانہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کو دنیا کے چند بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے۔

افسانہ میں مادھو، گھیسو اور مادھو کی بیوی بدھیا ہے جو کمرے میں دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے یہ دونوں دوسروں کے کھیت سے آلو چرا کر کھا رہے ہیں جب بدھیا مر جاتی ہے تو کفن کے لیے جو چندا زمیندار سے اکٹھا کرتے ہیں وہ چٹ کر جاتے ہیں۔ قاری تلملا اٹھتا ہے کہ ماجرا کیا ہے۔ اس کا ضمیر بالکل مر چکا ہے۔ اس افسانے میں یہاں مرد کرداروں کی بے حسی کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہیں پر عورت کے ذریعہ گھر بار چلاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جب یہ لوگ کام نہیں کرتے تو بدھیا جا کر ادھر اُدھر کام کرتی ہے اور ان کا پیٹ پالتی ہے۔ علی احمد فاطمی اس کہانی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ''کفن ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

'''کفن' کی تمام تر عظمتوں کو ذات اور حالات کی روشنی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانی میں فکر اور فن دونوں کا اس قدر معنی خیز، فکر انگیز انجذاب و امتزاج ہوا ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کی نظر میں یہ ایک شاہکار و یادگار کہانی بن جاتی ہے۔''٦٥؎

افسانہ ''کفن'' کے تمام تر عظمتوں کا اعتراف کرنا ہوگا۔ اس میں پریم چند کے تجربہ اور شعور کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی اہمیت کا اعتراف اردو ہی کے ہی نہیں بلکہ ہندی کے ناقدین نے بھی کیا ہے۔

آخر میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ علی احمد فاطمی نے پریم چند کو نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ماہر پریم چند ہیں اور پریم چند کی شخصیت اور تخلیقات کو بہت گہرائی سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال

ہے کہ کہیں کہیں کہانیوں کا جائزہ لیتے وقت جذبات اور عقیدت سے بھی کام لیا ہے۔ بہر حال یہ سچ ہے کہ انھوں نے پریم چند کے تمام خدمات کا جائزہ بحسن وخوبی کے ساتھ لیا ہے۔ جن حضرات نے پریم چند پر اعتراضات کیے ہیں ان کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے۔ انھوں نے ''پریم چند نئے تناظر'' میں لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اور پریم چند کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

عظیم الشان صدیقی:

عظیم الشان صدیقی پریم چند کے ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے حوالے سے پہچانے جانے والے ایک اہم ناقد ہیں۔ انھوں نے کئی تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ خصوصی طور پر پریم چند کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے کئی اہم افسانوں پر تنقیدی قلم اٹھایا ہے۔ پریم چند پر ان کا اہم مضمون ''پریم چند کے دیہی افسانے'' ''زادراہ کے افسانے'' ''کفن ایک تجزیہ'' ان کی کتاب ''اردو افسانہ فکری وفنی مباحث'' میں شامل ہے۔

پریم چند نے اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر ہو کر کہانیاں لکھیں۔ اپنے معاشرے میں خصوصی طور پر دیہاتی معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو نشانہ بنایا۔ ان کی کہانیوں میں گاؤں کی لہلہاتی کھیتی، جھرنیں، کام کرتے ہوئے کسان، محنت کرتے ہوئے مزدور، ظلم وتشدد کا شکار ہوئے مجبور لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ماحول دیہاتی ہے۔ عظیم الشان صدیقی نے ان سب کا تجزیاتی مطالعہ اپنے مضامین میں لیا ہے اور پریم چند کے خیالات کو تجزیاتی نقطۂ نظر سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اور آگے مزید تجزیہ کا پیراہن دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' 1908ء اس میں شامل ایک افسانہ ''یہی میرا وطن ہے'' سب سے اہم ہے۔ یہ افسانہ اگرچہ ان کے رومانوی دور کی یادگار ہے کیونکہ پریم چند نے پہلے پہل جو افسانے لکھے ان کا انداز رومانی تھا اور یہ حب الوطنی پر مبنی تھے۔ یہ افسانہ بھی حب الوطنی پر مبنی ہے اس میں وطن سے محبت کرنے کو ایک نئے زاویئے سے دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس افسانے میں جہاں ایک طرف رومان کی جھونکے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف گاؤں کے لہلہاتے کھیت بھی نظر آتے ہیں۔ اس میں گاؤں کا حسنِ منظر پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

اپنے مضمون ''پریم چند کے دیہی افسانے'' میں لکھتے ہیں:

''اس میں ایک چہرہ تو اس روایتی گاؤں کا ہے جو فطرت کی فیاضیوں، پیڑ پودوں، پھول پتوں کی کثرت، ندی نالوں کی روانی لہلہاتے کھیتوں کی ہریالی، قدرت کے دلکش مناظر اور پرسکون ماحول سے آراستہ ہے اور جس کی اپنی ایک آزاد سماجی، اخلاقی اور روحانی زندگی بھی ہے جہاں چوپال، دھرم شالا، پاٹ شالا، بچوں کی کلکاریوں، نوجوان امنگوں، بوڑھے تجربوں، عورتوں کے گیتوں، سادھوسنتوں کے کمنڈل، بھجنوں اور گنگا اشنان کو خاص اہمیت حاصل ہے''[٦٦]

اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مضمون ''پریم چند کے دیہی افسانے'' میں جاگیرداری نظام کا بھی مطالعہ کیا ہے عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ جاگیرداری نظام میں منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ مثبت پہلو بھی تھے اگرچہ جاگیرداری نظام میں کسانوں کو ستایا جارہا تھا کسانوں کی زمینوں پر قبضہ کیا جارہا تھا اور لگان کو ہر حال میں بھرنا ہوتا تھا۔ان تمام ظلموں کے ساتھ جاگیردار حضرات ان کسانوں کا خیال بھی رکھے تھے۔ زمین کے لیے پانی کا انتظام کرتے تھے کبھی کبھی فصل کے تباہ ہونے پر لگان بھی معاف کردیا کرتے تھے۔لیکن ان تمام سہولتوں اور آسانیوں کے باوجود کہیں نہ کہیں کسانوں کو ستایا بھی جارہا تھا۔انھیں پریشان کیا جارہا تھا۔ پریم چند کے کردار کبھی کبھی خودداری سے بھی کام لیتے لیکن اس خودداری کے بدلے میں انھیں ایک بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔عزتِ نفس کا خیال کسے نہیں ہوتا ہے۔کسانوں کو بھی اپنی عزت کا خیال تھا۔وہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔لیکن اپنی عزت نفس کو تارتار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ان کے اندر اخلاقی قدریں بھی تھیں۔اور وہ اس کے پاس دار بھی تھے۔ پریم چند نے اخلاقی قدروں کو بخوبی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے کردار اگرچہ ظلم وزیادتی کے شکار ہوئے ہیں لیکن وہ اخلاقی قدروں کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ''پریم چند کے دیہی افسانے'' میں رقمطراز ہیں:

''پریم چند نے اس اخلاقی اور روحانی قوت کو فن کارانہ ہنرمندی کے طور

پر استعمال کیا ہے جہاں پر پروٹا گونسٹ ظلم کو اس حد تک برداشت کرتا ہے کہ ظالم یا اینٹا گونسٹ خود ہی پشیمان ہو کر ظلم سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں روحانی تبدیلی اور قلب ماہیت کی کرن بھی اس تاریکی سے نمودار ہوتی ہے جس کے لیے کبھی مظلوم کا صبر و استقلال اور کبھی ظلم کے ضمیر میں چھپا ہوا کانٹا خواب کی شکل اختیار کر کے راہ راست پر لانے کا سبب بن جاتا ہے۔''۶۷

اس سلسلے میں عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ پریم چند نے زمین کے بنجر پن کے لیے کوئی منطقی جواز پیش نہیں کیا لیکن منطق سے عاری سماج میں توہمات خود اپنی منطق تلاش کرتے ہیں۔ بھوت پریت کا اگرچہ اس دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے لیکن یہ توہمات انسانی سماج میں احساسِ جرم کے وہ غیر مرئی پیکر ہیں جن کے ذریعہ مظلومیت اپنا خراج وصول کرتی ہے۔

پریم چند کے دیہی افسانوں میں نئے نظام کے پس منظر میں سماجی حقیقت نگاری کی ایسی روشن مثال ملتی ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

عظیم الشان صدیقی ''زادراہ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ''زادِراہ'' پریم چند کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں پریم چند کے زندگی بھر کے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ آخری افسانوی مجموعہ ہے تو اس میں موضوعات، زبان و بیان اور اسلوب نگارش کا ایک ستھرا ہوا روپ ملتا ہے۔

''زادِراہ'' میں شامل افسانہ ''وفا کی دیوی'' پریم چند کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس کو پریم چند کا نمائندہ افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ اس میں نسوانی کرداروں کی چابک دستی قابلِ تعریف ہے۔ مرد کرداروں کے مقابلہ میں نسوانی کردار زیادہ جاندار اور دلچسپ نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی صرف جذباتی کشمکش کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان کے کرداروں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ پریم چند کے نسوانی کردار زیادہ متحرک اور مددگار ہوتے ہیں۔ ان میں قوت ہوتی ہے۔ جو مرد

کرداروں میں نظر نہیں آتی جیسا کے ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

''پریم چند کے نسوانی کرداروں کی ایک بڑی قوت جذبہ خدمت وایثار بھی ہے اور یہ ایسا لامحدود چشمہ ہے جس سے سب ہی دوست و دشمن فیضیاب ہوسکتے ہیں دوستوں کے لیے اگر اس کی حیثیت فرض اور خلوص کی سی ہے لیکن مخالفین کے لیے اس میں فتح کی بشارت موجود ہے'' ۶۸

مظلوم بیوہ کے موضوع پر پریم چند نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ اور پریم چند یہ چاہتے کہ کوئی عورت بیوہ ہوجائے تو اس کی شادی دوسرے مرد سے کرادینی چاہئے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اسے قبول نہیں کرتا ہے۔ پریم چند کے یہ افسانے سماج میں عورت کی اہمیت اور ان کی افادیت اس کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فنی بصیرت اور اور موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان میں تہہ داری ہے۔ زبان و بیان کا ایک روپ نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نفسیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

''پریم چند کے افسانے اپنے فن اور تہہ داری سے جہاں سماجی رشتوں کو تقویت پہنچاتے ہیں اور انسانی نفسیات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں وہاں ان کے تشکیلی عناصر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ جن کے واضح نقوش نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی ارتقا پذیر لچکدار نفسیات کی دھوپ چھاؤں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ۶۹

''کفن'' کا تجزیہ کرتے ہوئے عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ یہ پریم چند کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ یہ دسمبر 1935ء رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں موضوع بھی اہم ہے اور مواد بھی۔ افسانہ کفن میں پریم چند کی فنی بصیرت اور ان کے نکھرے ہوئے اسلوب نگارش کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں تین اہم کردار گھیسو، مادھو اور بدھیا ہیں۔ بدھیا دردزہ سے تڑپ رہی ہے گھیسو اور مادھو باہر بیٹھے بھونے ہوئے آلو کھا رہے ہیں۔ یہ اس کو دیکھتے ہی نہیں البتہ صبح ہوتے ہی وہ مرجاتی ہے یہ دونوں کفن کے لیے چندا اکٹھا

کرتے لیکن وہ بھی شراب نوشی میں اڑا جاتے ہیں۔اس افسانے کا پلاٹ سیدھا سادا ہے۔کہانی مشکل بھی نہیں ہے لیکن واقعہ ایسا ہے جو حیرت میں مبتلا کرتا ہے قاری تلملا اٹھتا ہے۔اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی ایسا معاشرہ وجود میں تھا۔بہر حال ایک دردناک کہانی ہے غربت اور مفلسی پر مبنی یہ کہانی کوئی خاص اور پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ''کفن ایک تجزیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ افسانہ بظاہر سیدھا سادا سا نظر آتا ہے اس میں کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہے جو حیرت میں ڈال سکے لیکن اس سادگی اور اختصار کے باوجود پریم چند نے فنکارانہ بصیرت سے کام لے کر عام سماجی حقیقت کو اس طرح افسانے میں پیش کردیا ہے کہ قاری بار بار چونک جاتا ہے اور تجسّس سوال بن کر ذہن کو کریدنے لگتا ہے کہ یہ کیسی دنیا اور کیسا سماج ہے جس میں انسانی زندگی اس طرح دبی کچلی ہوئی نظر آتی ہے کہ انسان انسان نہیں رہتا ہے اور وہ حیوانوں کی سی زندگی گزارنے کے لیے کیوں مجبور کردیا گیا ہے۔''۵ے

عظیم الشان صدیقی نے سماج کی سفاکی اور بے غیرتی کی طرف توجہ دلائی ہے جو گھیسو اور مادھو کے ذریعہ بدھیا پر توجہ نہ دینے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ایک عورت جس کو کہانی میں رحم دل، جفاکش اور محنتی عورت کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔اس کے آتے ہی گھیسو مادھواور زیادہ نالائق ہوجاتے ہیں لیکن یہ مجبور اور لاچار عورت ہی ان کے پیٹ کی آگ ختم کرنے کے لیے محنت مزدوری کرتی ہے اور آخروقت پر دونوں میں سے کوئی بھی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا۔جاگیردارانہ نظام میں بہت ساری کمزوریاں بھی تھیں۔لیکن ہر نظام کی طرح اس میں بھی کچھ نمایاں پہلو تھے۔اس معاشرے میں دولت جمع نہیں کی جاتی تھی بلکہ خرچ کی جاتی تھی۔بدھیا ایک علامتی کردار ہے اس افسانے میں پریم چند نے محنت کش طبقوں میں پرورش پانے والے سیاسی شعور کے فقدان کو موضوع بحث بنایا ہے۔

پریم چند ''کفن'' کے ذریعہ ایک ایسے شعور کو عام کرنا چاہتے تھے کہ اپنے زوال کے باوجود استحصال

پسندی خود کو تبدیل کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی ہے یہ افسانہ معاشرتی نظام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

آخر میں عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ پریم چند کے افسانوں میں عام طور پر دیہاتی زبان دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عام بول چال اور روز مرہ کی زبان کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار چونکہ دیہاتی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ وہ دیہی معاشرے کی زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے افسانے اور کہانیاں ہیں جن میں زبان مشکل ہے جن کا اسلوب چند افسانوں کے مقابلے میں مشکل اور مختلف نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کے افسانوں کی زبان اور ان کا اسلوب اتنا سادہ بھی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے وہ اکثر فارسی الفاظ، تشبیہات، استعارات اور تراکیب بھی استعمال کرتے ہیں اور سادگی کے باوجود اس میں ادبی حسن اور لطافت کی چاشنی بھی موجود رہتی ہے اور فکر میں گہرائی اور تہہ داری بھی ہوتی ہے۔''[۱۷]

حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے پریم چند کے افسانوں کا ایک نئے زاویہ سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ روایتی تنقید سے ہٹ کر انت نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کے افسانوں میں نئے نئے روشن پہلوؤں کو عام قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شمار اردو کے چند نمائندہ ناقدین میں ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ان کا ایک مضمون ''افسانہ نگار پریم چند (تکنیک میں IRONY کا استعمال)'' انہیں کی کتاب ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' میں شامل ہے۔ یہ مضمون پریم چند کی تخلیقات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

پریم چند نے ابتدا میں جو کہانیاں لکھیں ان میں فن اور تکنیک کی بہت خامیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں لکھی گئی کہانیوں میں یہ خامیاں بالکل نظر نہیں آتی۔ بلکہ ان کی فن کارانہ صلاحیت

نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ابتدا میں پریم چند کی کہانیوں میں داستانوی رنگ نظر آتا ہے۔لیکن بعد میں اسے ترک کر کے ایک نئی راہ اختیار کی اور حقیقت نگاری کا سہارا لیا ہے۔

''کفن'' پریم چند کی آخری اور سب سے کامیاب کہانی ہے۔ اس میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو لوگ اس کہانی کو تمثیلی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھول پر ہیں۔ اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

> ''کفن کے فنی کمال اور اس کی معنویت کا نقش ابھارنے کے لیے اسے تمثیلی طور پر نہیں بلکہ IRONY کی سطح پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ IRONY میں لفظوں کے وہ معنی نہیں ہوتے جو بادی النظر میں دکھائی دیتے ہیں، بلکہ ان میں صورت حال میں مضمر ایسے پریا آنکھوں سے اوجھل حقیقت کے کسی دردناک پہلو پر طنزیہ وار مقصود ہوتا ہے۔''[۲۷]

وہ کہتے ہیں کہ اس میں گھیسو، مادھو اور بدھیا کہانی کے کردار ہیں۔ پوری کہانی ان تینوں کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ چماروں کا کنبہ سارے گاؤں میں بدنام تھا۔ گھیسو اور مادھو کام چور تھے اس لیے انہیں کوئی مزدوری نہیں دیتا تھا۔ جب تک فاقہ پر نوبت نہ آجاتی تب تک صحیح سے کام نہیں کرتے ہیں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا ہے۔ اور باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ IRONY کی یہ ہر کہانی کی صورتِ حال کرداروں کے رویوں، برتاؤ اور مکالموں اور بیانیہ ہر چیز میں ملتی ہے۔ وہ مزید اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ جس سے اس کہانی کا واضح نقطہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے:

> ''کہانی کا مرکزی نقطہ بُدھیا کی موت ہے۔ اس بے بس و نادار عورت کی موت کا المیہ ایک تاریک سایہ بن کر پوری کہانی پر چھایا رہتا ہے، لیکن سوائے کراہنے کی آواز کے جو رہ رہ کر درد کی ٹیس بن کر ابھرتی

ہے، بُڈھیا کے کسی عمل کی کوئی تفصیل پریم چند نے پیش نہیں کی، اور موت کا روح کو جکڑ لینے والا منظر بیان کیا بھی تو بالواسطہ طور پر اور صرف تین سطروں میں''۳؎

''سوا سیر گیہوں'' بھی پریم چند کی ستم ظریفی سے بھری ہوئی کہانی ہے۔ جس میں ایک سیدھا سادا کسان ہے۔ جسے اپنے کام سے کام ہے لیکن جب وہ قرض دار ہو جاتا ہے تو سوا سیر گیہوں کا قرض نہیں چکا پاتا دن بھر محنت کرتا لیکن اس قرض سے بری الذمہ نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح کہانی ''جرمانہ'' بھی ہے۔ اس کہانی کے متعلق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اس کا بنیادی عنصر بھی طنز ہے جو کرداروں کی معصومیت سے پیدا ہوتا ہے اور استحصال اور غلامی کے منھ پر طمانچہ مارتا ہے۔ اللہ رکھّی کو کبھی پوری تنخواہ نہیں ملتی۔ یہ آج سے نصف صدی پہلے بھی ہوتا تھا، اور آج بھی ہوتا ہے۔''۴؎

''دودھ کی قیمت'' کا بنیادی فنی عنصر بھی IRONY ہے جو ان سب کہانیوں میں قدرِ مشترک ہے اور جس نے ''کفن'' کو لافانی کر دیا۔ گاؤں کے زمیندار بابو مہیش ناتھ کے گھر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ساری دیکھ بھال گودڑ اور گودڑ کی بہو بھونگی کرتی ہے۔ جو دراصل اچھوت ہیں۔ بھونگی کا دودھ مہیش ناتھ کا بچہ بھی پیتا ہے اور بھونگی اپنا تین مہینے کا بچہ باہر کے دودھ پر پالتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ اس لیے اس میں ستم ظریفی کی حد پار کر دی ہے اور بھونگی استحصال کا شکار بھی ہو رہی ہے۔ وہ اپنے بچہ کو دودھ نہ پلا کر بابو مہیش کے بچہ کو دودھ پلاتی ہے۔

''پوس کی رات'' پریم چند کی ایک کامیاب اور منفرد کہانی ہے اس میں پریم چند نے بڑے دردناک سے کہانی کو پیش کیا ہے۔ اور زمینداری کے لگائے ہوئے گھاؤ کو طنز کے نشتر سے کریدا ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ یہ کہانی بھی IRONY کی سطح پر سانس لیتی ہے۔ پلاٹ کی تعمیر اور مکالموں کو ایک کے بعد ایک بنا ہی اس طرح گیا ہے کہ ایسی صورتِ حال سامنے آئے جو بنیادی طور پر طنزیہ ہو۔ ان کے کردار اگرچہ

حیاتیاتی طور پر کمزور ہیں لیکن ان کے اندر کے انسان نے ابھی دم نہیں توڑا ہے۔ یا حالات کے جبر نے انھیں ابھی پاش پاش نہیں کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے افسانہ کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو، پیداوار ہو تو اس سے باقی ادا کرو، چلو چھٹی ہوئی۔ باقی چکانے کے لیے ہی تو ہمارا جنم ہوا ہے۔ میں روپیہ نہ دوں گی، نہ دوں گی۔''

''تو کیا گالیاں کھاؤں؟''

''گالی کیوں دے گا، کیا اس کا راج ہے''

آخر میں بھی وہ اسی ولولے سے کہتی ہے: ''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی''۵ے

پریم چند کی کہانیوں میں انسان اور جانور کے رشتے کو بخوبی دکھایا جاتا ہے جس کی مثال مذکور الذکر کہانی ہے۔

جب ایک بار کھیت میں کچھ جانور آ جاتے ہیں اور فصل کو چٹ کر جاتے ہیں اور ''جبرا'' پر حملہ بول دیتے ہیں۔ ہلکو گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہے وہ اٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا جبرا بھوکتا رہتا ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس دیکھئے:

''کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا بالآخر اسی راکھ کے پاس زمین پر وہ چادر اوڑھ کر سو گیا''٦ے

گوپی چند نارنگ اسی صورتِ حال کے مطابق لکھتے ہیں:

''یوں صورت حال کی IRONY پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے اور درد میں ڈوبے ہوئے طنز کے تاگوں سے پریم چند آخری منظر یوں بُنتے ہیں:

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی

اور مُنّی کھڑی کہہ رہی تھی ''تم کہاں آخر مر گئے، ادھر سارا کھیت چوپٹ
ہو گیا۔'' ۷۷؎

گوپی چند نارنگ نے مذکورہ افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کر کے ان میں (IRONY یعنی ستم ظریفی) تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضمون اپنی نوعیت کا ایک الگ مضمون ہے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان چند افسانوں کے ذکر سے اتنا ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ پریم چند انسانی نفسیات کا شعور رکھتے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک دردمند اور انسان دوست دل ہی نہیں بلکہ حقیقت کو پہچاننے والی نظر اور اسے بیان کرنے والا قلم بھی تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی کو آج اردو دنیا میں کون نہیں جانتا۔ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ انہیں کتابوں میں ایک کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' ہے جو قابل تعریف ہے اس کتاب میں ایک مضمون ''پریم چند کی تکنیک کا ایک پہلو'' بھی شامل ہے۔ اس میں پریم چند کے بعض افسانوں کی روشنی میں پریم چند کی تکنیک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم مضمون ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے اس بات کی بحث اٹھائی ہے کہ افسانہ میں حقیقت نگاری سے کیا مراد ہے اگر افسانہ میں کوئی ادیب یا افسانہ نگار یہ کہے کہ فلاں شخص برا ہے کیونکہ میں اس کو برا سمجھتا ہوں تو ایسے میں فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت نگاری نہیں ہے کیونکہ اس طرح ہم اپنے خیالات کو قاری پر تھوپ رہے ہیں۔ حقیقت نگاری کا مطلب ہے کہ جو اشیاء جیسی ہو ان کو ہو بہو ویسا ہی پیش کر دیا جائے افسانہ کا ضرب اتنا زبردست ہوتا ہے کہ ہمیں خبر بھی نہیں دیتی ہے کہ افسانہ نگار کیا کہہ رہا ہے اور ہم آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگار نے کہا کہ ڈاکٹر چڈھا شام کو مریضوں کو نہیں دیکھتے بلکہ
> گولف کھیلنے جاتے ہیں، اور ہم نے یقین کر لیا۔ افسانہ نگار نے کہا کہ
> ڈاکٹر چڈھا کے ایک جوان، خوبصورت اور ہونہار بیٹا ہے جس کا نام

کیلاش ہے، اور ہم نے یقین کرلیا۔ افسانہ نگار نے کہا کہ کیلاش اور
ایک نوجوان حسینہ مالتی میں عشق ہے، اور ہم نے یقین کرلیا۔ افسانہ نگار
نے کہا کہ کیلاش کو سانپ پالنے کا شوق ہے، اور ہم نے یقین کرلیا۔ کوئی
سند، کوئی دلیل، کوئی گواہ ضروری نہیں۔'' ۸؎

اس مضمون میں اس بات کی بحث اٹھائی گئی ہے کہ اسلوب کیا ہے۔ فاروقی صاحب اس کے تعلق سے کئی طرح کے سوالات کھڑے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کیا اسلوب کی حیثیت موضوع سے ہٹ کر بھی متعین ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں تو موضوع کی اہمیت ہے یا اسلوب کی۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اسلوب کی اساس کس چیز پر ہے۔ موضوع پر یا زبان پر، یا مصنف پر؟۔ یا اس کے عہد پر؟ اسلوب اگر شخصیت کا اظہار ہے تو پھر اسلوب کا مطالعہ چھوڑ کر شخصیت کا مطالعہ مفید ہوگا۔ لیکن شخصیت کے مطالعہ سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ پریم چند کہیں کہیں فارسی آمیز کہیں کہیں سادہ کہیں کہیں بہت زیادہ عبارت آرائی پرمبنی اور کہیں کہیں تشبیہ و استعارے سے بے حد مملو زبان کو لکھتے ہیں یا شخصیت کا مطالعہ تو ہمیں صرف یہ بتاتا ہے کہ پریم چند ایک دلچسپ، دلکش مشہور شخصیت کے مالک تھے۔ آخر میں پریم چند کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

''پریم چند یا کسی بھی افسانہ نگار کا اسلوب کیسا ہے، اس کا تعین اس وقت
ممکن ہے جب یہ طے ہوجائے کہ اسلوب کے عینی تقاضے کیا ہیں؟
اسلوب کے عینی تقاضوں کی تعریف یہ کہہ کر ممکن نہیں ہے کہ اسلوب
شخص کا اظہار ہوتا ہے۔ ہوتا ہوگا۔ لیکن اگر یہ شخص کا اظہار ہے تو جتنے
شخص اتنے اسلوب۔ ان میں اچھے یا برے یا کامیاب، ناکام کی تشخیص
کیونکر ہو؟'' ۹؎

افسانوی اسلوب دراصل بیان اور پیش کش کے درمیان کشمکش کا اظہار ہے اور یہ کشمکش زبان کی سطح پر طے ہوتی ہے یا ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اسلوب کی اصل اساس زبان پر ہے نہ مصنف پر نہ موضوع پر۔ اس کے بعد مختلف انگریزی ناقدین و مفکرین سے استفادہ کرتے ہوئے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جو بات چیت کی جائے یعنی کردار آپس میں جو بات چیت کرتے ہیں جس کو مکالمہ کہتے ہیں کردار سے جو اصل زندگی میں بولتے ہیں ویسے ہی ادا کروایا جائے۔ پریم چند نے ایک حد تک اس پر عمل کیا ہے۔لیکن اردو زبان جس طرح لکھی یا بولی جاتی ہے اس میں یہ ممکن نہیں کہ اودھی، بھوج پوری، برج یا انگریزی جیسی زبانوں کی آوازیں ظاہر ہوسکیں۔اور نہ صرف یہ کہ آوازیں بلکہ ان بولیوں کی قواعد بھی کھڑی بولی یعنی اردو سے بہت مختلف ہے۔اس لیے درحقیقت ان زبانوں میں مکالمہ لکھنا گویا کئی زبانوں میں افسانہ لکھنا ہے۔اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''کوئی کردار بھوجپوری بولے گا، کوئی کھڑی بولی، کوئی اودھی، کوئی بمبئی کی اردو بولے گا، کوئی حیدرآباد یا بنگلور کی وغیرہ۔ پھر الفاظ کا تلفظ اردو حروف میں لکھنے میں سیکڑوں طرح کی قباحتیں ہیں جن کا تعلق آوازوں کی ادائیگی میں مشکل سے لے کر مفہوم تک رسائی اور بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ لفظوں کو نامانوس انداز میں لکھنے کے باعث پیدا ہونے والی بدصورتی سے ہے۔''۸۰

مکالمے کی زبان اور کردار کے ذہن میں مطابقت پیدا ہونی چاہیے ورنہ عام قاری کو یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ وہ اصل مکالمہ نہیں ہے بلکہ اردو کا ترجمہ ہے اسی لیے وہ پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس لیے پریم چند یا کسی بھی اردو افسانہ نگار کے اسلوب کی شان اس کے مکالموں میں اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ مکالمے میں ترجمے کا بھی احساس ہو۔اس حقیقت کو پرکھنے کے لیے 'شطرنج کے کھلاڑی'' کا مطالعہ سود مند ہوگا، اس افسانے کے مکالموں میں جو محاورے استعمال کیے ہیں وہ کسی اور افسانے میں نہ ملیں گے، کیوں کہ اس افسانے میں تمام کردار اپنی اصل زبان میں گفتگو کرتے ہیں''۸۱

پریم چند اپنے موضوع پر اپنا نقطہ نظر حاوی کر کے اپنا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اس کے نقطہ نظر کی

طرف واضح یا نیم روشن یا مبہم اشارہ کر سکے۔ پریم چند کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ ان کا طرزِ عمل قدرِ واضح نہیں ہو پاتا ہے۔ بلکہ اکثر تو بہت غور کے بعد ہی محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے نقطۂ نظر کو مسترد یا معطل کر کے اپنے نقطۂ نگاہ کو عائد کرنے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر افسانہ ''راہِ نجات'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سپاہی کو اپنی لال پگڑی پر، عورت کو اپنے گہنوں پر اور وید کو اپنے سامنے بیٹھے مریضوں پر جو ناز ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگر اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا ہے تو اس پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔''۸۲

آخر میں فاروقی صاحب نے ایک افسانہ ''فلسفی کی محبت'' پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔اس میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ پریم چند نے اپنی باتوں کو قارئین پر تھوپنے کی کوشش کی ہے۔اس کا کردار لالہ گوپی ناتھ کے خلاف ایک رویہ اپنا لیا ہے اور غیر شعوری طور پر وہ آپ کو بھی اسی رویے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں آخر میں وہ پریم چند پر گہرا طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ضرور ہے کہ یہ افسانہ پریم چند کا اعلیٰ ترین افسانہ ہے۔لیکن اسے منٹو یا بیدی لکھتے تو اور بھی زیادہ بہتر ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کا آخری افسانہ ''کفن'' ایسا ہے جو دنیا کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔اس میں اس طرح کی کوئی کمی بیشی نظر نہیں آتی جو دیگر افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔کل ملا کر فاروقی نے پریم چند کے اسلوب کے تعلق سے جو مباحث اٹھائے ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔

سید محمد عصیم:

سید محمد عصیم کا شمار ان ناقدین میں ہوتا ہے جنہوں نے پریم چند کی صد سالہ (1980ء) کی یوم پیدائش کے موقع پر پریم چند کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی تخلیقات کی صحیح معنویت اور اس کا معروضی مطالعہ کیا ہے۔عصیم نے ایک کتاب ''پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ'' لکھ کر پریم چند کی تخلیقات کا صحیح مطالعہ کیا ہے۔اس کتاب میں آٹھ مضامین شامل ہیں جو الگ الگ موضوعات پر ہیں۔جن میں پریم چند کو سمجھنے میں الگ الگ طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں (۱) پریم چند دیہات میں (۲) پریم

چند ہریجنوں کے مسائل (۳) پریم چند کے یہاں تشدّد اور عدم تشدّد کی کشمکش (۴) کیا پریم چند فرقہ پرست تھے؟ (۵) پریم چند کے نمائندہ دیہی کردار (۶) گئودان کے کردار اپنے عمل کے آئینے میں (۷) زادراہ کا فنی مطالعہ (۸) زادراہ کے افسانوں کا تجزیہ وغیرہ۔

سید محمد عصیم نے ان مضامیں میں پریم چند کی معنویت کو اپنے زمانے کے تقاضوں اور پریم چند کے سماجی محرکات کے پس منظر میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے گاؤں میں بسنے والے دبے کچلے کسانوں اور ہریجنوں کے مسائل اور ان کی مقدر سے پریم چند کا جو دردمندانہ لگاؤ ہے اس کتاب کے چار مضامین اسی کے لیے مختص ہیں۔ پریم چند کی دوراندیشی نے آج سے سو سال پہلے اس حقیقت کو اپنے دانائی اور فہم وفراست سے جان لیا تھا کہ آزاد ہندوستان کی جمہوریت میں یہی پسماندہ اور مظلوم طبقہ تمام فن کاروں کا موضوع اسی طرف مبذول ہوگا۔ ملک کی معاشی واقتصادی ضمانت کی ذمہ داری اور تعمیروترقی کا بوجھ ان کے شانوں پر ہوگا۔ زرعی نظام کے انسانی رشتے اور اس کی بقا اور صحت مند تمدنی قدریں پریم چند کو اس لیے پیاری تھیں کہ ان کا خمیر جدوجہد محنت کش انسانوں کی اجتماعی اور تخلیقی مشقت سے اٹھا تھا۔ یہ اقدار اور نظام روحانی سکون ،امن وعافیت، بھائی چارگی اور انسانیت کی بنیادوں پر قائم تھا۔ پریم چند اسی پر توکل رکھتے تھے ایک وقت ایسا آیا کہ پریم چند پر گاندھی جی کی تعلیمات کا گہرا اثر پڑا اور ان سے متاثر ہوئے۔ سید محمد عصیم نے اپنے مضامین میں پریم چند کے ذہنی رویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس صورت حال پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ پریم چند کے سماجی افکار کی اہمیت اور واضح ہو جائے آخر کے دو مضامین میں انھوں نے پریم چند کے دیہی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ سید عصیم نے اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کے کردار جہد وجہد اور حرکت وعمل کے ذریعہ سے ہی اپنے وجود کی تکمیل کرتے ہیں۔

کتاب کا پہلا باب ''پریم چند دیہات میں'' ہے اس میں سید محمد عصیم پریم چند کی دیہاتی زندگی اور ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ پریم چند کی ولادت ایک گاؤں کے قریب کائستھ گھرانے میں ہوئی تھی۔ والد ڈاک خانہ میں معمولی سی ملازمت کرتے تھے۔ خود پریم چند کی خانگی زندگی میں ایک انتشار تھا بچپن بڑے ہی مشکل دور میں گزرا، پڑھائی کو بھی بڑے دقتوں اور مصیبتوں سے مکمل کی۔ پریم چند کو عام طور پر

دیہاتی کہانیوں کا منبع کہا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں دیہی معاشرے کو پیش کیا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے خود کھیت میں جا کر کام کیا۔لڑکوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے اور گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ان کے آس پاس کا ماحول بھی غریب تھا جو معاشرہ انہوں نے دیکھا وہ غربت وافلاس کا معاشرہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کا بیان اپنی کہانیوں میں کیا ہے۔سید محمد عصیم نے اپنے مضمون ''پریم چند دیہات میں'' میں لکھا ہے:

> ''پریم چند کی زندگی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں گزرا تھا اس لیے انہوں نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے برہنہ تن کسان، مفلسوں اور کسانوں کے جھونپڑوں کی خستہ حالی، تعلیم کی کمی کے سبب ضعیف الاعتقادی، برہمنوں کے مظالم، اچھوت لڑکیوں کی عصمت ریزیاں، بے جوڑ شادی کے تباہ کن نتائج، بیواؤں کے مسائل، دیہی سماج میں عورت کا مقام، زمیندار، کارندے وحکمراں طبقے کی لوٹ مار وغیرہ کی کامیاب مصوری کی ہے۔''۸۳

آگے اسی مضمون میں انھوں نے پریم چند کے ادبی تخلیقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پریم چند کی تخلیقات کا زمانہ 1900ء سے لے کر 1936ء تک محیط ہے یہ زمانہ بڑا ہی خلفشار کا زمانہ ہے انتشار اور ابتری کی پریشانیوں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔اس سے متاثر ہو کر انہوں نے کہانیاں لکھیں۔اوران کی کہانیوں میں ہندوستان کی بدلتی ہوئی سماجی اور سیاسی زندگی کے نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں پریم چند نے اپنی ان تخلیقات کے سفر میں سماجی اصلاح کو بھی بنیادی اہمیت دی تھی۔لیکن بعد میں ان کے یہاں حقیقت نگاری آ گئی جس وجہ سے ان کی کہانیوں میں سیاسی رنگ غالب ہو گیا۔

''پردۂ مجاز'' میں چکر دھام متوسط طبقہ کا نوجوان ہے۔ وہ ستیہ گرہ ہی کی طرح سچائی اور انصاف کی حفاظت و بقا کے لیے بڑی سے بڑی طاقت ور کا مقابلہ کرنے سے گریز نہیں کرتا۔اس کا رویہ باغیانہ ہے۔ ''بازارِ حسن'' میں سمن سماج کی مخالفت کرتی ہے۔''میدانِ عمل'' میں امر کانت اپنے والد لالہ سری کانت کے

استحصال اور غریبوں کی لوٹ گھسوٹ کی نظریوں سے نفرت کرتا ہے۔اسی طرح ''گئودان'' میں گوبر بھی ایک باغیانہ رویہ لیا ہوا ہے۔اسی لیے سید محمد عصیم نے اپنے ایک مضمون ''پریم چند کے یہاں تشدد اور عدم تشدد کی کشمکش''میں لکھتے ہیں:

''ویسے تو پریم چند کے افسانوی ادب میں باغیانہ جذبات کی جھلکیاں شروع سے ہی کارفرما ہیں یہ کردار سماج، مذہب، سیاست، حکومت، زمیندار، برہمن، ضرر رساں رسم ورواج اور حاکم وغیرہ کے خلاف بے خوف وخطر بغاوت کرتے رہے ہیں''۸۴؎

سید محمد عصیم کہتے ہیں کہ پریم چند صرف ایک ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ تحریکِ آزادی کے سرگرم مجاہد اور ایک انسان دوست مفکر بھی تھے۔ان کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس شدت کے ساتھ یہ چاہتے تھے کہ ہمارا ملک کسی بھی طرح آزاد ہوجائے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کرنے کا مستحکم ارادہ کیا۔ان تمام باتوں کے علاوہ پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیا ہے۔ پریم چند کے معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد کا کوئی پختہ ثبوت نہیں دیا ہے۔اگر ہم پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کی طرف داری کرتی ہیں۔ وہ فرقہ واریت کے خلاف تھے اور اس کی کھل کر مخالفت بھی کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں کہیں ایسا کوئی کردار نہیں ملتا جو فرقہ پرستی کو عام کرے۔ پریم چند آریہ تحریک سے متاثر تھے۔ وہیں دوسری طرف شدھی تحریک کے شدید مخالف بھی تھے۔اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون ''کیا پریم چند فرقہ پرست تھے؟''میں سید محمد عصیم لکھتے ہیں:

''تہذیب کے متعلق پریم چند کی روشن خیالی واضح ہوجاتی ہے۔ پریم چند اپنی زندگی میں ایسی تمام تحریکات کی شدید مخالفت کرتے رہے جو فرقہ پرستی کو ہوا دینے میں معاون ہوسکتی تھیں۔۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں نے مُلک میں وسیع پیمانہ پر شدھی کی تحریک کا آغاز کیا پریم چند

نے اس کے خلاف فوری طور پر مضمون لکھا۔''۸۵؎

سید محمد عصیم اپنے مضمون ''پریم چند کے نمائندہ دیہی کردار'' میں پریم چند کے کرداروں کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ناول ہو یا افسانہ پریم چند نے اپنے آس پاس جن چیزوں کو محسوس کیا ان میں وہی کردار بھی پیش کیے جو حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ پریم چند کے نسوانی کرداروں میں ''منی'' بہت قابلِ تعریف ہے منی ''میدانِ عمل'' کا سب سے بلند انسانی فطرت سے قریب اور مکمل کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعہ پریم چند نے ہندوستانی عورت کی زندگی کے کئی اہم پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ نسوانی کرداروں میں ایک اہم کردار ''گئودان'' کی دھنیا ہے۔ یہ گئودان کے مرکزی کردار ہوری کی باوفا بیوی ہے۔ اس کردار کے ذریعہ پریم چند نے اس دور کے گاؤں کی زندگی اور سماجی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ''چوگانِ ہستی'' پریم چند کا ضخیم ناول ہے۔ سورداس اس کا ہر دل عزیز کردار ہے۔ اس کے ذریعہ پریم چند نے قدیم تہذیبی روایت اور اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح گئودان کا ہوری بھی قدیم روایت کا پاسدار ہے وہ کروڑوں کسانوں کا نمائندہ ہے۔ لیکن اپنے ورثہ میں ملی زمین کی حفاظت حتیٰ الامکان کرتا ہے۔ لاکھ مصیبتیں آئیں لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ان سب کرداروں کا جائزہ عصیم نے اپنے مضمون میں بحسن خوبی لیا ہے

آگے مزید پریم چند کے دیہی کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے سید محمد عصیم نے بجا طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کے کردار جدوجہد اور عمل کے وسیلے سے ہی اپنے وجود کی تکمیل کرتے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ پریم چند نے جہاں نسوانی کردار اور قدیم وقیع کے پاسدار کرداروں کو پیش کیا ہے وہیں ان کے کردار باغی رویہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے ہی باغی کرداروں میں ''بلراج'' ہے۔ بلراج کا کردار بڑی ہی حقیقت شعارانہ فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے باغیانہ جذبات اپنے دور کے کسانوں کی عام وفا کو پیش کرتے ہیں۔ گئودان کا کردار گوبر جو ہوری کا بیٹا ہے ایک باغی رویہ رکھتا ہے۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کر دیتا ہے اور سیٹھ ساہوکار اور زمینداروں کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اسی طرح پریم چند کے یہاں ہر طرح کی نمائندگی کرنے والے کردار موجود ہیں اسی لیے سید محمد عصیم نے اپنے مضمون ''پریم چند کے نمائندہ دیہی کردار'' میں لکھا ہے:

''پریم چند کے کردار داستانوں کی طرح کمالات وصفات کا مجموعہ نہیں ہیں، ان کے کردار نذیر احمد کی طرح محدود طبقہ ومخصوص ذہن کے مثالیہ بھی نہیں، شرر کی طرح تاریخ نما نیم تاریخی بھی نہیں اور سرشار کا صرف خوجی بھی نہیں۔ان کے کرداروں کی تمام تر شخصیت میں آغاز تا اختتام ڈرامائی ارتقاء موجود رہتا ہے اور کرداروں کے اسی ڈرامائی ارتقاء سے انہوں نے بسا اوقات جمالیاتی کیفیتیں بھی پیدا کی ہیں۔''[۸۶]

آخر میں انھوں نے ''زادہ راہ کا فنی مطالعہ'' پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ افسانوی مجموعہ ''زادِ راہ پریم چند کا ایک کامیاب مجموعہ ہے۔اگر کسی افسانہ کا تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے ہماری نگاہ جس چیز پر جاتی ہے وہ ہے موضوع، دوسری اہم چیز اسلوب ہے۔ پریم چند کا اسلوب زندگی آمیز ہے، حقیقت سے اس نے روشنی اخذ کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے معنی خیز اور زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں۔دوسری اہم چیز پلاٹ ہے۔ پریم چند کے ذہن میں یہی تصور تھا کہ افسانوی پلاٹ میں واقعات کا تسلسل عین منطق کے مطابق ہونا چاہیے پریم چند کے اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کا پلاٹ ٹھیک ہے۔ پریم چند کے شہری کرداروں میں اکثر خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔لیکن ان کے دیہی کردار معاشرے کی نمائندگی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔لیکن ''زادہ راہ'' میں شامل افسانوں میں جو شہری کردار ہیں وہ کامیاب ہیں۔ پریم چند نے ''زادہ راہ'' کے افسانوں میں مکالمے سے پلاٹ کے ارتقا میں بھی مدد لی ہے اور کرداروں کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مکالمے اچھے استعمال کیے ہیں اور مختصر ہیں۔آخر میں سید محمد عصیم نے کچھ خامیاں بھی تلاش کی ہیں اس طرح انہوں نے پورے افسانوی مجموعہ کا بہت خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔

آخر میں میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ سید محمد عصیم نے پریم چند کے فن اور فکر کو سامنے لا کر قاری کے سامنے نئے پہلوؤں کو لانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

پروفیسر عبدالسلام:

پروفیسر عبدالسلام کا شمار اردو کے ان چند ناقدین میں ہوتا ہے جنہوں نے فکشن کے فن کار ''پریم چند'' پر اپنا تنقیدی قلم اٹھایا ہے۔ اگر چہ آپ نے مستقل طور پر پریم چند پر تنقید نہیں کی ہے لیکن زیرِ نظر کتاب ''پریم چند سماجی اور سیاسی ناول'' پریم چند کے حوالے سے ایک اہم کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

پریم چند نے صرف ناول ہی نہیں لکھے بلکہ کئی افسانے بھی تحریر کیے ہیں اور کئی افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ان کے ناولوں میں جس قدر ذہنی ارتقا ملتا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے ناول نگار کے یہاں موجود ہو۔ جو بھی لکھا ہے وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے لکھا۔ جو بھی کہانیاں لکھیں وہ معاشرے میں پھیلی برائی کو ختم کرنے کے لیے لکھیں ہیں۔ اسی طرح آپ کے ناول مقصدی اور تبلیغی ہیں۔ انہوں نے ہندو و مسلم میں کسی بھی طرح کوئی تفریق نہیں کی اس سلسلے میں پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کے اولین ناول ''اسرار معابد'' ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ناول نگاری سے ہندو معاشرہ کی اصلاح کا کام انجام دینا چاہتے ہیں۔ یہ ناول حد درجہ مقصدی ہے۔'' ۸۷؎

پروفیسر عبدالسلام نے پریم چند کے ناولوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ وہ پریم چند میں نئے نئے پہلو تلاش کرتے ہیں۔ پریم چند کے ناول معاشرے میں اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ سماج میں پھیلے ہوئے اندھ کاروں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے متعدد ایسے موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ جو معاشرے میں اصلاح کا کام کر سکے۔ بیوہ کا مسئلہ ہو یا عورتوں میں زیورات کا مسئلہ، بیوی اور شوہر کی لڑائی کا مسئلہ ہو یا ماں اور بیٹے کی محبت کا مسئلہ تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام پریم چند کے ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اصلاحی نقطۂ نظر ''ہم خرما و ہم ثواب'' میں ''بیوہ'' کے مقابلہ میں زیادہ واضح ہے اس میں بیوہ کے مسئلہ کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ ''بیوہ'' میں صرف بیوہ کی حالت زار پیش کی گئی ہے۔ اور بیوہ عورتوں کو ودھوا آشرم میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ اس مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں ہے۔

معلوم نہیں پریم چند نے اس قصہ میں اس طرح ردوبدل کیوں کیا'' ۸۸؎

اس طرح دیگر ناولوں پر کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کو غور سے پڑھ کر ان میں ایک نئی آب وتاب لانے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ صرف معاشرے میں پھیلی برائی کو دور کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا ہے بلکہ معاشرے میں تبدیلی لانے کو بھی ایک اخلاقی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ بار بار ایسے ناول تخلیق کر رہے ہیں جن سے اخلاق اور اخلاص دونوں درست ہو جائیں۔ اسی طرح پریم چند نے سیاسی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں اس طرف بھی جا بجا اشارہ ہی نہیں بلکہ پوری پوری کہانی ملتی ہے۔ اسی لیے پروفیسر عبدالسلام ''بازارِ حسن'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> '''' بازارحسن'' میں انھوں نے ایک عام معاشرتی مسئلہ کو لیا ہے۔ اس میں ملکی سیاست کی جھلک تو برائے نام نظر آتی ہے مگر سیاسی افراد اپنے سیاسی کردار کی جھلک ضرور دکھا جاتے ہیں۔'' ۸۹؎

ناول ''گوشۂ عافیت'' پریم چند کا ایک شاہکار ناول ہے اس ناول کو قمر رئیس نے ٹالسٹائی کے (Resurrection) سے متاثر قرار دیا ہے۔ جس طرح گوشۂ عافیت میں مایا شنکر اپنی جاگیر سے دست بردار ہو کر کسانوں کو مالکانہ حقوق دے دیتا ہے۔ اسی طرح (Resurrection) کا ہیرو بھی اپنی جاگیر کسانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ''گوشہ عافیت'' میں کہیں کہیں خامی بھی نظر آتی ہے اور یہ غیر دلچسپی کا سبب بھی بنتا ہے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالسلام نے لکھا ہے:

> ''اس ناول کے غیر دلچسپ ہونے کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی کمزور ہے۔ سورداس کو کچھ غیر مزروعہ زمین ورثہ میں ملی تھی۔ یہ گاؤں والوں کے لیے چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ شہر کا ایک دولت مند عیسائی جان سیوک اس زمین پر سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتا ہے۔ سورداس ایک تو اپنی موروثی زمین بیچنے کو تیار نہیں ہوتا پھر وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ یہاں کارخانہ قائم ہو جانے سے گاؤں والوں کا

اخلاق بگڑ جائے گا''۹۰

اس ناول پر پروفیسر عبدالسلام نے شدید تنقید کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس ناول کا پلاٹ بہت ڈھیلا ڈھالا ہے۔ پریم چند نے قصہ کو طول دے دیا ہے۔ مگر وہ اسے سنبھال نہ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے کی سیاسی جدوجہد کا نقشہ اس ناول سے بہتر کہیں نظر نہیں آتا مگر ان خیالات کے اظہار کے لیے پریم چند نے مواقع تلاش کیے ہیں وہ اس تحریک کی عظمت کو نمایاں نہیں کر پاتے۔ لیکن پھر بھی یہ ناول اپنے مقصد پر کھرا اترتا ہے۔

ناول ''غبن'' کا مرکزی کردار متوسط طبقے کا ایک نوجوان ہے۔ جس کا نام رامانا تھ ہے۔ اس کے والد دیانا تھ ایک شریف لیکن غریب انسان تھے۔ اس میں ایک اچھی کہانی کو کئی چھوٹے چھوٹے واقعوں سے پر کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ واقعات غیر ضروری ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام اس کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں بعض واقعات کو بے جا طول دے دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹنا گر نے زہرہ کے کردار کو غیر ضروری کہا ہے، تو پروفیسر قمر رئیس نے رتن اور وکیل صاحب کے کردار کو اضافی اور غیر ضروری قرار دیا ہے۔

''میدانِ عمل کو پریم چند کے اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ 1930ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور 1933ء میں مکمل ہوا۔ یہی ناول ہندی میں 1933ء ''کرم بھومی'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مگر اردو میں 1936ء میں شائع ہوا۔ اس میں انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ اور جدوجہد آزادی کے علم کو بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا میں پریم چند آدرش وادا اور گاندھیائی فلسفہ کے قائل تھے۔ لیکن یہ چیز ان کے آخری ایام میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تشدد پسند ہو جاتے ہیں۔ جس کی جھلک اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی لیے پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ''''میدانِ عمل'' میں آدرش واد کا زور کم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اصل بات جو آخری ناولوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند کو گاندھیائی فلسفہ میں عقیدہ نہیں رہا تھا، اب وہ پر امن سیتہ گرہ کے قائل نہیں رہے تھے۔ اب ان کے یہاں تشدد کی جھلک بھی نظر آنے لگی تھی۔''۹۱

پریم چند نے اپنے ناولوں میں جن کرداروں کو جگہ دی ہے ان میں دیہی معاشرے سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنے آس پاس جو محسوس کیا اور جو دیکھا اسی کو کہانی میں پیش کیا۔ اور وہی کردار اپنی کہانی کے لیے منتخب کر لیے کردار نگاری کو ناول میں جس قدر اہمیت حاصل ہے۔ پریم چند اس کا شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بڑے ہی سلیقے سے کرداروں کو استعمال کیا ہے۔ جس کام کے لیے جو کردار مناسب ہے اسی کو وہی کام سونپا ہے۔ ان کو اس میں تجربہ بھی حاصل ہے۔ ایک جگہ پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ''ان کے تجربے اور مشاہدے کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے اس میں بھی کوئی کلام نہیں۔ مگر بنیادی خرابی یہ ہے کہ انہوں نے فن کو اپنے مقاصد کے تابع کر لیا۔ انہوں نے ناول نگاری سے صرف اپنے اصلاحی خیالات کی ترجمانی کا کام لیا۔'' ۹۲

پروفیسر عبدالسلام کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں جہاں مرد کرداروں کو پیش کیا ہے وہیں نسوانی کرداروں کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے نسوانی کردار مردوں کی طرح متحرک نظر آتے ہیں اور مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر کام میں آگے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے نسوانی کردار ہر طرح کی تکلیف کو برداشت کر سکتے ہیں۔ پریم چند عورتوں کو بڑے ہی احترام سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہندوستنیاسی عورتوں کو ایک دیوی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان کا کمال یہی ہے کہ وہ نسوانی کرداروں میں جو خوبیاں چاہیں کوٹ کوٹ کے بھر دیں۔

آخر میں پروفیسر عبدالسلام تمام ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پریم چند ایک اچھے ناول نگار نہیں تھے۔ ان کی کہانیوں میں وہ بات نظر نہیں آتی جو ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اردو کے اہم ناول نگار مانے جاتے ہیں۔

اصغر علی انجینیر :

پریم چند اور ان کے فکشن کا اردو کے نقادوں نے مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا ہے۔ پریم چند کے

سماجی شعور، سیاسی آگہی، اخلاقی تصورات، دیہاتی زندگی کے مسائل پر ان کی نظر اور انسانی فطرت کے پیچ وخم پر ان کی گرفت کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے اسی طرح ایک اہم نام اصغر علی انجینیر کا ہے انھوں نے یوں تو بے شمار مضامین لکھے ہیں۔(۱) پریم چند کی سیاسی زندگی (۲) پریم چند حیات اور فن (۳) پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، لیکن ان کا یہ مضمون ''پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو'' خاصہ اہم ہے۔اس میں انہوں نے پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اور ان میں جمالیاتی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس مضمون کی اردو ادب میں خوب پذیرائی ہوئی ہے۔

اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ پریم چند ایک بڑے فن کار ہیں۔ان کے افسانوں میں جمالیاتی عنصر بھی نظر آتا ہے۔انہوں نے ناول اور افسانہ کو عروج پر پہنچادیا۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے خود اصغر علی انجینیر لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک پریم چند کی عظمت اسی بات میں پنہاں ہے کہ انھوں نے اردو افسانے اور ناول کو اپنے ابتدائی دور میں ہی اس قابل بنادیا کہ وہ اس صنف کے اہم فنّی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہوجائے''۹۳

اصغر علی انجینیر ''پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو'' میں یہ بحث چھیڑا ہے کہ جمالیاتی اعتبار سے پریم چند کا یہ فنی موڑ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے ابتدا میں داستانوی انداز میں کہانی لکھی۔لیکن بہت جلد اس سے انحراف کیا اور حقیقت نگاری کو اپنالیا۔ایک فن کار اپنے تمثیل کے ذریعہ خارجی حقیقت کو کیوں منعکس کرتا ہے۔بہتر افہام وتفہیم کے خاطر یا تفریح طبع کے خاطر۔لانگیر (langer) اور اس کے ہم خیال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آرٹ کا بنیادی مقصد بہتر افہام وتفہیم ہے اور اس طرح ان کے نزدیک فن تخلیقی کردار رکھتا ہے۔اس کے برخلاف بعض ماہر فن جمالیات، فن کو تفریح کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس کے علمی وعقلی رول کی نفی کرتے ہیں اس طرح پریم چند بھی لانگیر کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔کیونکہ پریم چند نے خود اپنے دور اپنے ماحول کو کہانیوں کے ذریعہ عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان کی سماجی حقیقتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنے دور کی سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے فن کو تفریح

طبع کا سامان قرار نہیں دیتے ہیں۔

پریم چند نے ونود شنکر کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں ادب اور جمالیات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اصغر علی انجینیر اپنے مضمون میں پریم چند کا ایک اقتباس رقم کیا ہے ملاحظہ ہو:

''میرے خیال سے ۔ اور ہم سب کے خیال سے۔ ادب کے تین مقاصد ہیں یعنی کہ جذبات کی تطہیر (Catharsis) تفریح اور کشف Revelation لیکن ایک طرح سے تفریح اور کشف Catharsis کے عمل میں ہی شامل ہیں کیونکہ ادیب جس طرح کی تفریح مہیّا کرتا ہے وہ قلابازوں اور نقالوں یا بھانڈوں کی تفریح سے مختلف ہوتی ہے۔ (ادب سے حاصل ہونے والی) تفریح میں جذبات کی تطہیر کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اگر تطہیر کا مقصد سامنے رکھا جائے تو کشف کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم داخلی ذہنی کیفیت دکھاتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہمیں کوئی فلسفہ پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم خوبصورت کو اور خوبصورت اور بدصورت کو اور بدصورت بنا سکیں۔''[۹۴]

اصغر علی انجینیر اس خط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس خط کے ذریعہ پریم چند کے جمالیاتی نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ سماجی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے کے باوجود پریم چند کا آرٹ پروپگنڈا نہیں۔ پریم چند کے کرداروں میں ہوری ہو یا مادھو، گھیسو، پریم چند کی تخلیقات کا یہی جمالیاتی پہلو ہے کہ انہوں نے ان کرداروں کے ذریعہ داخلی کیفیت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

اصغر علی انجینیر کا مضمون ''پریم چند کی سیاسی زندگی'' بھی کافی اہم ہے اس مضمون میں پریم چند کی سیاسی رواداری سے وابستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پریم چند سرکاری نوکر تھے۔ لیکن بعد میں عدم تعاون سے متاثر ہو کر گاندھیائی فلسفہ کے تحت 1921ء میں نوکری سے مستعفی ہوگئے۔ پریم چند کے زمانے میں کانگریس وجود میں آئی بعد میں کانگریس میں دو حصے ہوگئے۔ ایک حصے میں وہ لوگ تھے جو لڑائی جھگڑے کے

ساتھ آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جسے گرم دل کہا گیا۔ دوسرے حصے میں وہ لوگ تھے جو لڑائی سے نہیں بلکہ اپنی عقل اور سوجھ بوجھ سے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ جسے نرم دل کہا گیا۔ پریم چند کا جھکاؤ کس طرف زیادہ تھا اس سلسلہ میں خود اصغر علی انجینیر کا کہنا ہے:

''پریم چند کا جھکاؤ نرم دل کے مقابلے گرم دل کی طرف تھا اور وہ تلک کا بڑا احترام کرتے تھے۔نگم صاحب، جوان کے بڑے عزیز دوست تھے، خود اس کی گواہی دی ہے۔''95

اس اقتباس کی روشنی میں اصغر علی کہتے ہیں کہ وطن کی آزادی پریم چند کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اور ان کا اولین مقصد بھی۔ انہوں نے اپنا قلم اس کے لیے وقف کر دیا پریم چند نے بیسویں صدی میں ایک قابلِ فن کار کی حیثیت سے پورے ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی زندگی خاموشی سے گزار سکتے تھے۔لیکن نہیں۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانے کی آواز کو بلند کیا۔

آزادی کی تحریک میں دل و جان سے کون شریک نہیں۔ اس کے متعلق پریم چند کا ذہن بالکل صاف نظر آتا ہے۔ ان کی ہمدردی تحریکِ آزادی سے خوب تھی۔ اس کی سب سے بہترین مثال ان کا ناول ''میدانِ عمل'' ہے۔ جو اگست 1932ء میں شائع ہوا۔ آزادی کا جذبہ پورے شباب پر اس ناول میں نظر آتا ہے۔ بالآخر یہی کہنا بجا ہوگا کہ پریم چند نے ملک کو آزاد کرانے میں ہر ممکن کوشش کی۔ اور آزادی کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک بھی رہے۔ اصغر علی انجینیر کا ایک مضمون ''پریم چند حیات اور فن'' بھی کافی دلچسپ ہے۔ اس میں انہوں نے پریم چند کے حیات کے ساتھ ساتھ ان کے فن کا بھی جائزہ لیا ہے۔ پریم چند کو بچپن میں گلی ڈنڈا کھیلنے کا شوق تھا۔ اور رام لیلا کے کھیل میں بھی بے انتہا مزا لیتے تھے۔ اس سلسلے میں خود پریم چند کا اقتباس دیکھئے:

''ادھر ایک عرصے سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا تھا۔ بندروں کے بھدے چہرے لگائے، آدھی ٹانگوں کا پاجامہ اور کالے رنگ کا اونچا کرتا پہنے آدمیوں کو دوڑتے، ہو ہو کرتے دیکھ کر اب ہنسی آتی ہے۔ لیکن ایک

زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں مزہ آتا تھا۔ مزہ تو بڑا ہلکا لفظ ہے اسے جوش کہنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے میرے گھر سے بہت نزدیک ہی رام لیلا کا میدان تھا اور اس گھر میں لیلا پاتروں کا روپ ورنگ بھرا جاتا تھا وہ تو میرے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے پاتروں کی سجاوٹ ہونے لگتی تھی۔۔۔رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا، رام رج پینا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا۔'' ۹۶

اصغر علی انجینیر لکھتے ہیں کہ اس طرح پریم چند کا بچپن بیتتا گیا اور ان کے ذہن مین بچپن کے سارے واقعات دل و دماغ میں بیٹھتے گئے۔ آگے چل کر یہی واقعات ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں کے لیے کچا مواد ثابت ہوئے۔ 1897ء میں انھیں میٹرک کا امتحان دینا تھا لیکن کسی وجہ سے دے نہ سکے، اگلے سال بیٹھے تو دوسرے درجے میں پاس ہوئے پھر آگے کی پڑھائی کا بندوبست کا مسئلہ آیا لیکن، دقتوں کے ساتھ پڑھائی مکمل کی۔ اس دقت بھرے سفر کا نقش پریم چند کے ذہن مین گھر کر چکا تھا۔ تمام پریشانیاں آئیں لیکن پریم چند نے ہار نہ مانی۔ اعلیٰ تعلیم کو حاصل کرنے کی دھن میں وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ اس طرح پریم چند کی زندگی کاٹوں بھری زندگی تھی جن کا عکس ہمیں ان کی تخلیقات میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس لیے انھیں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں سے لگاؤ و محبت ہے۔ اسی لیے مجبور اور لاچار لوگوں کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کی کہانیاں اس آب وتاب کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا کینوس اپنے ماضی سے مماثلت رکھتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اصغر علی انجینیر نے اپنے تینوں مضامین میں پریم چند کے متعلق چھپے ہوئے گوشوں کو منظرِ عام پر لانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر شمیم نکہت:

ڈاکٹر شمیم نکہت اردو کی ایک اہم خاتون تنقید نگار ہیں۔ ان کا ایک مضمون ''پریم چند کی تخلیقات میں عورت کا مقام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر شمیم نکہت نے پریم چند کے نسوانی کردار

کے حوالے سے عورت کے مقام کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے۔

پریم چند نے تین سو سے زیادہ کہانیاں اور نامکمل ناول ''منگل سوتر'' کو ملا کر پندرہ ناول لکھے ہیں۔ پریم چند حقیقت پسند ادیب تھے۔ اس لیے زندگی کے ہر لمحے میں انہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں عام سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی مسائل ان کی کہانیوں میں مختلف کرداروں کے ذریعہ پیش ہوئے ہیں۔ انہوں نے مختلف کرداروں کے ذریعہ عورت کے مسائل کو بھی بخوبی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے غربت و افلاس تنگ دستی و بھوک، بیماری و بیکاری عورتوں کے کسمپرسی کی حالات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

پریم چند نے معاشرے میں پھیلے ہوئے عورتوں کے مسائل کو غور سے دیکھا اور انھیں اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ عورتوں پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور ان کے لیے انصاف مانگنے کی کوشش کی۔ اسی لیے ڈاکٹر شمیم نکہت نے لکھا ہے:

> ''ان کے ذہن میں عورت کی شکل میں بار بار ابھر کر انصاف کا مطالبہ کرنے لگا۔ انھوں نے عورتوں کی سماجی حالت درست کرنے اور ان سے متعلق فرسودہ نظریات کو تبدیل کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ عورت کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ سماج کا اہم حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اِن برائیوں کے خلاف اپنے قلم کو پوری تندہی سے استعمال کیا اور ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو لے کر افسانے اور ناولیں لکھیں۔ ان کی تحریروں میں ابتدا سے ہی عورت کی جانب ان کا صحت مند رویہ صاف نظر آتا ہے۔''[97]

اس سلسلے میں شمیم نکہت کہتی ہیں کہ پریم چند اپنی کہانیوں کے نام بھی عورتوں کے نام پر رکھے ہیں۔ مثلاً ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''ماتما''، ''بیٹی کا دھن''، ''نگاہِ ناز''، ''مریم''، ''روٹھی رانی'' وغیرہ وغیرہ انہوں نے عورت کو زندگی کا اہم حصہ سمجھا اور اسی لیے ان کے مسائل کو پیش کرنا ضروری سمجھا۔ وہ عورتوں کو مردوں کے

برابر حصہ دینے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت امیر خاندان کی بھی ملتی ہیں اور غریب خاندان کی بھی۔ انہوں نے امیر اور غریب دونوں طرح کی عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر شمیم نکہت رقم طراز ہیں:

> ''انھوں نے محسوس کیا تھا کہ صحت مند سماج اور ترقی یافتہ ملک تب ہی کہلایا جاسکتا ہے۔ جب وہاں نصف بہتر کو بہتر نہ بھی بنایا جائے تو کم سے کم برابری کا درجہ تو دیا ہی جائے۔ انھوں نے مختلف طبقات کی عورتوں کی تصویریں ان کے اصلی روپ میں تمام مسائل کے ساتھ نہایت ایمانداری سے پیش کی ہیں۔'' ۹۸

پریم چند نے عورت کو ہر جگہ خاندان کی ایک اہم کڑی مان کر اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ شمیم نکہت لکھتی ہیں کہ ان کی تحریروں کا وہی عہد تھا جس میں عورتوں کی ناقدری کی جاتی تھی اور محرومی عروج پر تھی۔ تعلیم عورتوں کے لیے غیر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بیواؤں کو دوسری شادی کرنے کا حق نہیں تھا۔ بیوی بھی اپنے شوہر کی غلط فہمی کا شکار ہوتی تھی اور شوہر سے مار کھاتی تھی۔ کبھی بیٹے ایسے حرام خور نکل آتے تھے جو بوڑھی ماں کو تنگ کرتے تھے اسی طرح کے تمام مسائل کی گتھیاں پریم چند کے یہاں مل جاتی ہیں۔ عورتوں کی شادی کے متعلق پریم چند کی کیا رائے ہے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

> ''پریم چند نے عورتوں کی کم عمری کی شادی اور مشترکہ خاندان کو بھی اس بدحالی کا سبب بتایا ہے۔ کم عمری کی شادی کے سبب نہ تو وہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے اور نہ ہی کسی ظلم کے خلاف اپنے خاندان میں آواز اٹھانے کی ہمت کرسکتی ہے۔ وہ کم عمر بہو بن کر سارے ظلم سہتی ہے اور بیوہ ہو کر بیٹے کی دست نگر بن جاتی ہے۔ یا سماج کی ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔' ۹۹

اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ پریم چند کی کہانیوں میں بیوہ عورت کے مسائل کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ ہندو سماج میں بیوہ کا جو حال تھا وہ غور طلب ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد عورت نہ صرف اقتصادی طور

پر مجبور ہو جاتی ہے بلکہ اس کی عزت و عصمت کا محفوظ رہنا بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر بھی عورت کا تعلیم یافتہ اور خود کفیل نہ ہونا ہی اسے مجبور کر دیتا ہے۔

پریم چند نے صرف ایک عورت کو ہی موضوع بحث نہیں بنایا یا صرف عورت کے ایک مسئلہ کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ عورت کے جو بھی مسائل ہیں ان کو موضوعِ بحث بنا کر معاشرے میں پھیلی ہوئی ان تمام برائیوں پر ایک ضرب لگائی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر شمیم نکہت صاحبہ لکھتی ہیں:

> ''اس طرح پریم چند نے صرف سماج کے گھاؤ ہی عورت کی شکل میں نہیں دکھائے ہیں بلکہ بڑی حد تک اس کا مداوا بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے کمزور اور کچلی ہوئی عورت کی ایک ایسی تصویر سماج کے سامنے پیش کی ہے۔ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر موقع اور تعلیم ملے تو عورت کسی حالت میں بھی مرد سے کم تر ثابت نہیں ہوگی۔''[۱۰۰]

اس کے علاوہ ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار'' ڈاکٹر شمیم نکہت کی ایک اہم کتاب ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں جس عمیق مطالعہ، غور و فکر تجزیہ و تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان عورتوں کی آزادی، سماجی مقام اور خواتین پر ہونے والے مظالم کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

دوسرے باب میں کردار نگاری کا عام مفہوم اور معیار پر ناول کے اجزائے ترکیبی کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں مشترکہ خاندان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے خود پریم چند کی زندگی میں جو جوار بھاٹا آیا اور اس سے جو نتائج اخذ کیے اس کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں طوائف کے مسائل اور نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب میں پریم چند کے مشہور ناول ''چوگانِ ہستی''، ''غبن'' اور ''میدانِ عمل'' کے حوالے سے عورت کے مقام کا تعین کیا ہے۔ چھٹا باب عورتوں کے تمام مسائل پر مبنی ہے۔ ساتھواں باب ان سب کا خلاصہ اور نتیجہ ہے۔

اس طرح کتاب میں پریم چند کے عورتوں کے تعلق سے مثبت نظریات و خیالات کو ڈاکٹر شمیم نکہت

نے بخوبی پیش کیا ہے۔انھوں نے عورت کوعورت کی زاویہ نظر سے جانچا اور پرکھا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شمیم نکہت کا یہ کارنامہ پریم چند کے حوالے سے ہمیشہ یادگار رہے گا اوران کا نام پریم چند کے ناقدین میں بہ اعتبار عورت اورنسوانی کردار کے حوالے سے بار بار لیا جائیگا۔

☆☆☆

حواشی

۱۔یوسف سرمست، پریم چند کی ناول نگار، الیاس ٹریڈرس حیدر آباد، دسمبر 1976ء،ص:6

۲۔ایضاً ص:30

۳۔ایضاً ص:30

۴۔ایضاً ص:34

۵۔ایضاً ص:34

۶۔ایضاً ص:47

۷۔شکیل الرحمان، فکشن کے فنکار پریم چند، مرتب: شیخ عقیل احمد، نئی دہلی، 2009ء ص:21

۸۔ایضاً ص:27

۹۔یوسف سرمست، پریم چند کی ناول نگاری، الیاس ٹریڈرس حیدر آباد، دسمبر 1976ء،ص:
186

۱۰۔ایضاً ص:187

۱۱۔ایضاً ص:187

۱۲۔ایضاً ص:188۔187

۱۳۔ایضاً ص:188

۱۴۔ایضاً ص:188

۱۵۔ایضاً ص:192

۱۶۔فکشن کے فنکار پریم چند اور شکیل الرحمان، مرتب: شیخ عقیل احمد، نئی دہلی، 2009ء، ص:15

۱۷۔ایضاً ص:16

۱۸۔ایضاً ص:17

۱۹۔ایضاً ص:18

۲۰۔ایضاً ص:21

۲۱۔ایضاً ص:27

۲۲۔ایضاً ص:23

۲۳۔ایضاً ص:25

۲۴۔ایضاً ص:26

۲۵۔ایضاً ص:27

۲۶۔ایضاً ص:17

۲۷۔ایضاً ص:18۔17

۲۸۔بحوالہ،انیس رفیع ،صغیرافراہیم کی ہم سفری اورنگاہ نقدو جستجو تحریک ادب ، بنارس،شمارہ نمبر 21،اکتوبرتادسمبر،ص:256

۲۹۔پروفیسرصغیرافراہیم ، پریم چندکی تخلیقات کامعروضی مطالعہ،نئ دہلی،2016ء،ص:145

۳۰۔ڈاکٹرسعید،پریم چندایک نقیب اورڈاکٹرصغیرافراہیم کی پریم چندشناسی ،زیراشاعت،ص:2

۳۱۔پروفیسرصغیرافراہیم ، پریم چندکی تخلیقات معروضی مطالعہ،نئ دہلی،2016ء،ص:265

۳۲۔صغیرافراہیم ، پریم چندایک نقیب ، نیاایڈیشن،علیگڑھ،1999ء،ص:15

۳۳۔ایضاً ص:15

۳۴۔ایضاً ص:16

۳۵۔ایضاً ص:24

۳۶۔ایضاً ص:49

۳۷۔ایضاً ص:8

۳۸۔ایضاً ص:52

۳۹۔ایضاً ص:52

۴۰۔ایضاً ص:55

۴۱۔ایضاً ص:60

۴۲۔ایضاً ص:71

۴۳۔ایضاً ص:76

۴۴۔ایضاً ص:78

۴۵۔ایضاً ص:83

۴۶۔ایضاً ص:86

۴۷۔ایضاً ص:87

۴۸۔ایضاً ص:74

۴۹۔پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ،نئی دہلی،2016ء،ص:137

۵۰۔ایضاً ص:138

۵۱۔صغیر افراہیم، پریم چند ایک نقیب، نیا ایڈیشن،علیگڑھ،1999ء،ص:94

۵۲۔ایضاً ص:153

۵۳۔پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ،نئی دہلی،2016ء،ص:56

۵۴۔ایضاً ص:192

۵۵۔ایضاً ص:161

۵۶۔بحوالہ، پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ،نئی دہلی،2016ء،ص:165

۵۷۔پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ،نئی دہلی،2016ء،ص:175

۵۸۔ایضاً ص:262

۵۹۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، پریم چند نئے تناظر میں، نئی دہلی، ص:13
۶۰۔ایضاً ص24
۶۱۔ایضاً ص:60
۶۲۔ایضاً ص:99
۶۳۔ایضاً ص:170
۶۴۔ایضاً ص:185
۶۵۔ایضاً ص:158
۶۶۔عظیم الشان صدیقی، اردو افسانہ فکری وفنی مباحث، نئی دہلی، 2010ء، ص:109
۶۷۔ایضاً ص:114
۶۸۔ایضاً ص:132
۶۹۔ایضاً ص:137
۷۰۔ایضاً ص:163
۷۱۔ایضاً ص:159
۷۲۔گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی، 1981ء، ص:166
۷۳۔ایضاً ص:167
۷۴۔ایضاً ص:172
۷۵۔ایضاً ص:178
۷۶۔ایضاً ص:180
۷۷۔ایضاً ص:180
۷۸۔شمس الرحمان فاروقی، افسانے کی حمایت میں، نئی دہلی، 2006ء، ص:88
۷۹۔ایضاً ص:91

۸۰۔ایضاً ص:93

۸۱۔ایضاً ص:93

۸۲۔ایضاً ص:96

۸۳۔سید محمد عصیم، پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ، دہلی،1984ء،ص:22

۸۴۔ایضاً ص:43

۸۵۔ایضاً ص:49

۸۶۔ایضاً ص:62

۸۷۔پروفیسر عبدالسلام، پریم چند سماجی اور سیاسی ناول،نئی دہلی،1985ء،ص:19

۸۸۔ایضاً ص:23

۸۹۔ایضاً ص:26

۹۰۔ایضاً ص:42

۹۱۔ایضاً ص:66

۹۲۔ایضاً ص:89

۹۳۔اصغر علی انجینیئر ، پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، رسالہ آجکل،اگست1980ء،ص:12

۹۴۔بحوالہ۔اصغر علی انجینیئر ، پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، رسالہ آجکل،اگست1980ء،ص13

۹۵۔اصغر علی انجینیئر ، پریم چند کی سیاسی زندگی، رسالہ ماہنامہ سہیل، گیا،1980ء،ص:12

۹۶۔بحوالہ اصغر علی انجینیئر ، پریم چند حیات اور فن، رسالہ ماہنامہ سہیل، گیا،قسط دوم،ص:7

۹۷۔پریم چند شناشی، مرتبہ، پروفیسر آفاق احمد، اردو اکادمی بھوپال،1994ء،ص:101

۹۸۔ایضاً ص:101

۹۹۔ایضاً ص:103

۱۰۰۔ایضاً ص:105

اختتامیہ

اختتامیہ

پریم چند اردو کے اہم کہانی کار ہیں۔انہوں نے کئی افسانے اور ناول تخلیق کیے ہیں۔ان کی کہانیوں نے پریم چند کو قلم کا سپاہی،مزدوروں اور کسانوں کا مسیحا بنا دیا۔انھوں ے دیہات میں زندگی گزاری اس لیے دیہات کو قریب سے دیکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کے ہیرو مزدور،کسان اور لاچار انسان نظر آتے ہیں۔ایک فن کار کہاں تک کامیاب ہے؟اس کا دارو مدار دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ایک تو یہ کہ اس کا انداز بیان کیسا ہے؟اور وہ کون کون سے طریقے استعمال کر رہا ہے؟ دوسرے یہ کہ قاری کو اس کے فن سے کہاں تک حظ حاصل ہو رہا ہے؟اور اپنی بات کو قاری تک پہچانے میں کہاں تک کامیاب ہے؟ با ذوق قاری جو کہ ایک تنقیدی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور فن کار کے فن کو پرکھتا ہے۔یوں تو پریم چند کے فن کو مختلف لوگوں نے مختلف نظریوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔لیکن میں نے اس مقالے میں ان ناقدین کو شامل کیا ہے جنھوں نے پریم چند پر باقاعدہ تنقید کی ہے۔

پریم چند کو ہم بڑے کہانی کار اور فن کار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔انہوں ں نے کئی اہم ناول اور افسانوی مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔پریم چند کے دور سے پہلے ہی فکشن تنقید کا آغاز ہو چکا تھا۔مولوی کریم الدین کی ''خط تقدیر'' کو محمود الہٰی نے اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔''خط تقدیر'' کے دیباچہ میں کریم الدین نے کہانی پن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔یہ خیالات اپنے عہد کے بڑے اہم تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔''خط تقدیر'' کے دیباچہ میں تو مصنف نے قصّہ و حکایت کے فن پر جو کچھ قلمبند کیا۔اس سے گھسے پٹے قصہ نگاری کی شدید مخالفت ہوتی ہے اور نئی کہانی کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔اسے ہم فکشن تنقید کی پہلی شعوری کوشش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

نذیر احمد اپنی ناولوں کے ذریعہ سماجی و معاشرتی اصلاح چاہتے تھے جس کے لیے وہ تعلیم نسواں کو

ضروری خیال کرتے تھے۔اس وقت تک ان کے اس فکر کی نمائندگی کرنے والی اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔اس لیے نذیر احمد نے عورتوں کی اصلاح کے لیے جدید نوعیت کے قصّے کا انتخاب کیا۔مولوی نذیر احمد نے اپنے ان خیالات کا ذکر اپنے ناولوں کے دیباچوں میں کیا ہے۔مثلاً ناول توبتہ النصوح کے دیباچے میں اپنے خیاالات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔انھوں نے ناول میں معاشرتی مسائل کو پیش کیا ہے اور داستان سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے ایک رسالہ ''دلگداز ۱۸۸۷ء'' میں جاری کیا۔اس رسالے میں انھوں نے ناول کے خدوخال اس کی ساخت وہئیت،موضوع اور اس کے مواد سے متعلق اپنے معاصرین میں باضابطہ اور سب سے زیادہ مضامین لکھے۔''دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء''،''ناول''،''ہمارا جدید ناول'' ان کے اہم مضامین ہیں۔اپنے پہلے مضمون میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ناول کے فن کا سب سے پہلے ہمارے یہاں جنم ہوا اس کے بعد میں یورپ پہنچا۔لیکن یورپ سے جب ہمارے یہاں آیا تو اس کی ہیت بدلی ہوئی تھی۔شرر ناول کے موضوع اور مواد سے زیادہ ہئیت اور اسلوب کا دامن وسیع بتاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ناول کی ہئیت میں تاریخ،تہذیب وتمدن اور زیادہ تر سماجی مسائل کو خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ پرونے کی اہم صلاحیت موجود ہے۔

مرزا ہادی رسوا ناول میں نئے نئے تجربات کے خواہاں تھے اور ناول کے موضوع میں اور تکنیک میں ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔لیکن ان کے معاصرین انگریزی ناولوں کی تقلید کر رہے تھے۔مرزا رسوا ناول میں داستانوی رنگ اور عریانیت کے خلاف تھے۔وہ چاہتے تھے ناول میں جو کچھ بیان کیا جائے وہ ہمارے آس پاس کے مسائل ہوں۔رسوا کے ناولوں میں کرداروں کی پیش کش بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔رسوا نے اپنے ناولوں میں چھوٹے سے چھوٹے کردار کو پوری توجہ اور سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ تخیل کی مدد سے کوئی کردار خلق کرتے ہیں اور اسی کے اردگرد ناول کا تانا بانا بنتے ہیں۔رسوا کے کردار آزاد نظر آتے ہیں۔وہ کرداروں کی پسند یا ناپسند کو اپنی پسند یا ناپسند نہیں بتاتے ہیں اور نہ ہی ان کی سوچ وفکر سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی ذاتی تعریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

منشی پریم چند نے اردو ناول کی تنقید کے تعلق سے کل چار مضامین قلم بند کیے۔ جو ''اردو زبان اور ناول''، ''شرر و سرشار''، ''ناول کا فن'' اور ''ناول کا موضوع'' جیسے عناوین کے تحت 1910ء سے 1931 کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔ انھوں نے ناول کو ہمیشہ زندگی اور معاشرے کی اصلاح کا ایک اہم اور بہترین ذریعہ سمجھا۔ وہ ایک عمدہ اور معیاری ناول کی تخلیق کے لیے ناول نگاروں کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ استاذ فن کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کریں۔ انسانی نفسیات سے اچھی واقفیت حاصل کریں اور اپنے سچے احساسات و جذبات کی عکاسی کے ساتھ خیالات میں تازہ کاری پیدا کریں۔ کرداروں کی بہتر مصوری کے لیے پریم چند کرداروں کے واضح اور وسیع مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔ کرداروں میں محض انسانی خصوصیات پیدا کر دینا کردار نگاری کا کمال نہیں۔ ان کے خیال میں مختصر افسانہ کا مقصد مکمل انسان کی مصوری نہیں بلکہ اس کی شخصیت کا ایک رخ دکھانا ہوتا ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے ہمارے افسانے سے جو نتیجہ حاصل ہو وہ مقبول عام ہو اور اس میں کچھ باریک نکتے بھی ہوں۔

نیاز فتح پوری نے مختصر افسانے سے متعلق تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے اس سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ افسانہ ایک قصہ ہوتا ہے جو مختصر ہو اور جس میں رومانی جذبات اور خیالات کی عکاسی کی جائے۔ افسانہ صرف خیال سے لطف اندوز ہونے کی چیز ہے۔ پلاٹ افسانے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لطیف اظہار بیان ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ ہی افسانے کو موثر اور پرکشش بنایا جاتا ہے۔

پریم چند کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان میں ادبِ لطیف اور نثری شاعری کی راہیں ہموار کیں۔ فکشن کے فن پر باضابطہ تنقیدی مضامین لکھنے کی ابتدا کی۔ زبان سلیس استعمال کرنے اور انسانی نفسیات کے موضوع کو انھوں نے متعارف کرایا۔ ان کا خیال ہے کہ شاہزادہ، نوابوں اور امیر زادوں کے بجائے غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو ناول کے کرداروں میں جگہ دینی چاہیے۔

اوپندر ناتھ اشک پریم چند کے ناقدین میں ایک اہم نام ہے ایک مضمون ''پریم چند اور دیہات'' لکھ کر اپنی عقیدت کا لوہا منوایا جو رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں 1936ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس میں پریم چند

کی دیہاتی زندگی پر روشنی ڈالی۔ پریم چند نے جو گاؤں کی تصویرکشی کی ہے اوران کے وقت میں جو زمانے کے حالات تھے غریبی، امیری، محنت کش طبقہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل عکاشی پیش کی ہے۔

فراق گورکھپوری نے ایک مضمون ''پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے'' لکھا جو رسالہ ماہنامہ ''زمانہ'' 1936 میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے پریم چند کی نجی زندگی اور حالات پر بہت تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جگر بریلوی اپنے مضمون ''منشی پریم چند کی ادبی خدمات'' میں یہ بحث اٹھائی ہے کہ سب سے پہلا افسانہ ''فسانہ آزاد'' ہے کیونکہ یہ کردار پلاٹ کے اعتبار سے بہت اہم اور قصے کے لحاظ سے بہتر افسانہ ہے۔ پھر جگر بریلوی نے کچھ ایسی اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن کے علمی و ادبی خدمات کو دنیا فراموش نہیں کرسکتی۔ مگر پریم چند دیہات میں پیدا ہوئے اور دیہات پر ہی اپنی نظر مرکوز رکھا۔ مالک رام نے بھی پریم چند کے دوناول میدان عمل اور گئودان کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے لیکن تجزیہ پر ہی اختصاص رکھا ہے۔ انھوں نے جس کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے اس کو اسی زمانے کے سیاسی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔۔ سلیم جعفر نے اپنے مضمون'' منشی پریم چند کی مصوری'' میں پریم چند کی کردار نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ ''سوتیلی ماں'' کے کرداروں پر بحث کی ہے۔ کرداروں کے تعلق سے کہتے ہیں کہ فسانہ بہ لحاظ خد و خال کامل ہے۔ اگر اس میں کوئی پانچواں کردار داخل کر دیا جاتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی اور لطف زائل ہو جاتا۔ ایچ ایل گاندھی نے ''پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر'' میں ان کے فن اوران کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی اوران کے فن کو سمجھ کر ان کے آرٹ پر گفتگو اور سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے کہانیوں کا پلاٹ ہمیشہ نہایت دلکش اور چست ہوتا ہے۔ ان کے ناول مجلسی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کا آئینہ ہیں۔ ان کی بنیاد میں اظہار حقیقت اور اصلاح کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ دراصل ان کے سب قصے ہماری روزمرہ زندگی کی عکسی تصویریں ہیں۔ اوران کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی داستان حیات کے کسی واقعہ کو پڑھ رہے ہیں۔ منشی جگیشور ناتھ نے اپنے مضامین ''منشی پریم چند کی ادبی خدمات'' اور ''منشی پریم چند مرحوم'' کے ذریعے پریم چند کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں، ڈراموں اور خطوط نویسی کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ جگشور ناتھ نے پریم چند کو ادبی حیثیت سے 4 مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱)

پریم چند بحیثیتِ ادیب اور افسانہ نگار (۲) پریم چند بحیثیتِ ناول نویس (۳) پریم چند بحیثیت ڈرامہ نگار (۴) پریم چند بحیثیتِ اخبار نویس۔ ساغر نظامی نے اپنے مضمون 'پریم چند کا ذہنی ارتقا'' میں منشی جی کی شخصیت اور فن کو ان کی تخلیقات اور حالاتِ زندگی کے تناظر میں معاشرتی زاویہ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ سید علی جواد زیدی ''پریم چند کی زندگی اور تصنیف پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک مضمون میں پریم چند کی پوری حیات ان کے احوال اسکول، بچپن، کھیل کود حتیٰ کہ شرارتوں کا ذکر بھی بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے لیکن تصنیفات پر انھوں نے نظر سرسری ڈالی ہے جو نہ کے برابر ہے۔ اور شخصیت سے متعلق تقریباً سبھی پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید طالب ''پریم چند کے ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کون سا کردار خاموش ہے یا فرضی ہے۔ یا جو بات کہنا چاہتے تھے اس کو ادا کرنے سے کس طرح محروم ہو گیے ہیں۔ جگت موہن لال رواں نے ''پریم پچیسی'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس میں انھوں نے پریم چند کی تحریروں میں شاعرانہ عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جذبات نگاری، سادگی، نزاکت، قوتِ بیان، اختصار عبارت، تشبیہ و استعارہ، قوتِ الفاظ، سلاست، توازن، جملوں میں الفاظ کی نشست اور بندش کی چستی، خیال آفرینی، مضمون آفرینی یہ سب وہ چیزیں ہیں جو شاعری کا اعلیٰ معیار ہیں لیکن لالِ رواں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں پریم چند کے افسانوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ تاثیر جو شاعری کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ ان قصص میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ قوانین قدرت اور انسانی جذبات کے مشاہدے میں اور اُس پر غور کرنے میں منشی صاحب کا نظیر دنیائے اردو میں شاید ہی دوسرا ہو۔

رہبر نے اپنے پورے مقالے ''پریم چند'' میں نہ صرف پریم چند کے حالات زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کے فن پر بحث کرتے ہویے ان کے اسکول، بچپن، درسگاہ، اسکول ماسٹر، پہلی تخلیق، کانپور میں، سوزِ وطن، نیا بیاہ، استعفیٰ، گھر میں، پریس، ایڈیٹر، سمریاترا، فلم، صدارت، عمل، آرٹ، اور شہرت پر بہترین روشنی ڈالی۔ اس کے ذریعے پریم چند کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ مانک ٹالا نے بھی پریم چند پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی پریم چند کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ تحقیقی تقاضے کے تحت پریم چند کے خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی غلطیوں اور

کوتاہیوں کو بھی بیبا کانہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔ پریم چند سے متعلق انہیں باتوں کو لیا ہے جو حقائق پر مبنی تھے اور ایسے تمام باتوں کو خارج کر دیا ہے جو غلط بیانی سے متعلق تھیں۔

پریم چند پر مدن گوپال کی کتابیں قلم کا مزدور اور کلیات پریم چند کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مدن گوپال تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی نظر بھی رکھتے تھے۔ اور اسی تحقیقی میدان میں ایک لمبا عرصہ صرف کیا۔ انہوں نے پریم چند کے خطوط، ناولیں، افسانے اور ڈرامے وغیرہ کی تدوین کی ہے تب جا کر پریم چند کی ادبی خدمات کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تاکہ آئندہ نسلیں پریم چند کی سچائیوں اور صداقتوں سے محروم نہ رہیں۔ اسلئے کہ بقول ان کے پریم چند ایک ایسے ادیب تھے جن کو اس دارِفانی سے کوچ کئے ہوئے ایک عرصۂ دراز ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی پریم چند کے نئے نئے گوشوں پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں جس کے ذریعے پریم چند کی شخصیت کا قد دن بہ دن بلند ہوتا رہتا ہے۔

جعفر رضا نے پریم چند پر لسانیات کے دروازے کھول کر پریم چند کی اہمیت میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اور یہ نہیں کہ بہت مختصر گفتگو کی ہو بلکہ لسانیات کا پورا ایک باب قائم کیا ہے۔ زبان کے حوالے سے جعفر رضا نے پریم چند پر بہترین روشنی ڈالی ہے اور زبان و بیان کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ جعفر رضا نے جس طرح پریم چند پر دور بینی اور وسعت نظری سے کام لیا ہے اس سے پریم چند کی پوری شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے اس کے ساتھ پریم چند کے شعور اور تحت الشعور، نفسیات، ذہنی ارتقا، زبان و بیان، جدت، سیاسی، سماجی اور معاشرتی سرگرمیاں، ابتدائی ماحول، دورِ شباب میں تصورِ عورت اور آخری وقت پر بہت ہی شائستہ گفتگو بھی کی ہے۔

پریم چند کے ناقدین میں محمد حسن بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون ''پریم چند کا ورثہ'' میں پریم چند کے محد سے لحد تک کے حالات و کوائف کو بڑے ہی جامع انداز میں پوری صداقت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے پریم چند کی تحریروں کا جو تجزیہ پیش کیا ہے ان میں روایتی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ اس وقت کے جو تنقیدی حالات اور اصول تھے اسی حدود میں رہ کر محمد حسن نے پریم چند کو پرکھا ہے اور اسی ضابطے کے تحت پریم چند کی اہمیت بھی نمایاں کی ہے۔ قمر رئیس نے اپنے تحقیقی مقالے میں پریم

چند کے ناولوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس پر بڑی ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے اور کسی بھی گوشے کو مبہم نہیں رکھا ہے۔

قمر رئیس نے پریم چند پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے جذبات کے بجائے ان کی علمی تحقیق و تجزیہ پر اپنے مقالے کی بنیاد رکھی ہے اور اس میں پریم چند کی زندگی کے محرکات تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات پریم چند کے اسلوب و ہیئت وغیرہ پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند پر تبصرہ کرتے ہوئے اس زمانے کے سبھی حالات کو پیش کیا ہے اور دیہاتی منظر کشی کر کے ایک نمایاں وصف بیان کرتے ہیں جس کے ذریعے قاری و سامعین پریم چند کی تحریروں میں کھو جاتا ہے اور ہر ہر قدم پر محظوظ ہوتا رہتا ہے۔

مسعود حسین خان نے بھی پریم چند کی تحریروں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے جس میں انہوں نے لسانیات پر کافی توجہ دی ہے جس پر ایک لمبی بحث چھڑ گئی تھی کہ ناول گودان ہندی میں لکھا گیا یا اردو میں، اسلئے کہ ہندی میں ''گودان'' کہتے ہیں اور اردو میں ''گئودان'' اس پر بہت سے ادیبوں کے ذریعے ایک طویل بحث چلی آخر کار اس منزل پر پہونچے کہ یہ ناول اردو نہیں ہے بلکہ ہندی (گودان) کا ترجمہ ہے۔ جو آج ہماری نظروں کے سامنے ''گئودان'' کی شکل میں موجود ہے۔ مسعود حسین خان ایک ماہرِ لسانیات تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک بہتر محقق اور ماہر نقاد بھی ہیں۔ انہوں نے پریم چند کی تخلیقات کے تعلق سے ایک بہتر اور قابلِ قدر نظریہ پیش کیا ہے، چاہے وہ لسانیات پر ہو یا وہ تحقیق و تخلیق کے تعلق پر مبنی ہو۔ پریم چند پر اپنا قیمتی وقت صرف کر کے نمایاں ادیبوں میں اپنا مقام بنایا ہے۔ اس لئے ان کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

سرمست نے پریم چند کی ناول نگاری پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے چند اور اہم پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ مگر سرمست کی یہ انفرادیت ہے کہ اپنے ذاتی نظریئے کو زبردستی پریم چند پر تھوپنے کے بجائے پریم چند کے حوالے سے ہی باتیں کی ہیں اور اپنے خاص نقطۂ نظر سے پریم چند کو جانچا اور پرکھا ہے۔ جو ہر ادیب کی فطری عادت ہوتی ہے بس انہیں چیزوں سے تعلق رکھا ہے اور صداقت اور میانہ روی سے کام لیا ہے۔ ساتھ

ساتھ تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا ہے۔

صغیر افراہیم نے پریم چند کی تحریروں کو نئے افکار و نظریات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور پریم چند مطالعات کو ایک نئی جہات بخشی ہے۔ پریم چند پر ان کے مضامین کا مجموعہ ''پریم چند ایک نقیب ''اور پریم چند تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' جو اردو ادب اور پریم چند کے تعلق سے بڑی اہمیت کے حامل کتابیں ہیں۔ ان میں انہوں نے پریم چند کا فکری پسِ منظر، پریم چند بحیثیت ناول نگار، پریم چند بحیثیت افسانہ نگار، پریم چند بحیثیت ڈرامہ نگار اور واردات کا تجزیاتی مطالعہ، مکتوباتِ پریم چند کا معروضی مطالعہ اور پریم چند کی غیر افسانوی تحریروں کا مکمل مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔

شکیل الرحمان نے پریم چند کے ناولوں کے محاسن و معائب بیان کرتے ہوئے ان نقادوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جنہوں نے صرف پس منظر پہ اپنی نظر کو مرکوز رکھا اور حقیقت نگاری، میکانکی تصور میں کھو کررہ گئے ہیں۔ کرداروں کی جبلی اور نفسیاتی سچائی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ انھوں نے تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پریم چند ناول نگار تو ہیں مگر بڑے ناول نگار نہیں۔

علی احمد فاطمی نے پریم چند کو نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ماہر پریم چند ہیں اور پریم چند کی شخصیت اور خدمات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہیں کہیں کہانیوں کا جائزہ لیتے وقت جذبات اور عقیدت سے بھی کام لیا ہے۔ بہر حال یہ سچ ہے کہ انھوں نے پریم چند کے تمام خدمات کا جائزہ بحسن و خوبی کے ساتھ لیا ہے۔ جن حضرات نے پریم چند پر اعتراضات کیے ہیں ان کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے۔ انھوں نے ''پریم چند نئے تناظر'' میں لکھ کر اپنی وسعت نظر کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے پریم چند کو ہر جہت سے دیکھنے اور سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک مضمون ''افسانہ نگار پریم چند (تکنیک میں IRONY کا استعمال)'' انہیں کی کتاب ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے (IRONY یعنی ستم

ظریفی) کا ذکر کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان چند افسانوں کے ذکر سے اتنا ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ پریم چند انسانی نفسیات کا شعور رکھتے تھے۔ان کے پاس صرف ایک دردمند اور انسان دوست دل ہی نہیں، حقیقت کو پہچاننے والی نظر اور اسے بیان کرنے والا قلم بھی تھا۔سچا فن کار جس طرح حقیقت کی بازیافت کرتا ہے۔تخیل کی سطح پر اس سے جس طرح چراغ روشن کرتا ہے۔اس کی مثال دوسرے فنون لطیفہ میں نہیں ملتی ہے۔پریم چند نے جس طرح حقیقت کی بازیافت ''کفن'' میں کی ہے اس سے ان کی فنی بالیدگی ظاہر ہوتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ''پریم چند کی تکنیک کا ایک پہلو'' میں یہ بحث اٹھائی ہے کہ افسانہ میں حقیقت نگاری سے کیا مراد ہے اگر افسانہ میں کوئی ادیب یا افسانہ نگار یہ کہے کہ فلاں شخص برا ہے کیونکہ میں اس کو برا سمجھتا ہوں تو ایسے میں فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت نگاری نہیں ہے۔کیونکہ اس طرح ہم اپنے خیالات کو قاری پر تھوپ رہے ہیں۔حقیقت نگاری کا مطلب ہے کہ جو اشیاء جیسی ہو ان کو ہو بہو ویسا ہی پیش کر دیا جائے۔افسانہ کا ضرب اتنا زبردست ہوتا ہے کہ ہمیں خبر بھی نہیں دیتی ہے کہ افسانہ نگار کیا کہہ رہا ہے اور ہم آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتے ہیں۔اس کے لئے کوئی سند، کوئی دلیل، کوئی گواہ ضروری نہیں۔

سید محمد عصیم نے ایک کتاب ''پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ'' لکھ کر پریم چند کی تخلیقات کا صحیح مطالعہ کیا ہے۔اس کتاب میں پریم چند کی معنویت کو اپنے زمانے کے تقاضوں اور پریم چند کے سماجی محرکات کے پس منظر میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔گاؤں میں بسنے والے دبے کچلے کسانوں اور ہریجنوں کے مسائل اور ان کی مقدر سے پریم چند کا جو دردمندانہ لگاؤ ہے اس کتاب کے چار مضامین اسی کے لیے مختص ہیں۔آخر کے دو مضامین میں انھوں نے پریم چند کے دیہی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔سید عصیم نے اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کے کردار جہد و جہد اور حرکت و عمل کے ذریعہ سے ہی اپنے وجود کی تکمیل کرتے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام نے ''پریم چند سماجی اور سیاسی ناول'' میں پریم چند کے ناولوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ تجزیہ کرتے ہوئے کئی ناولوں پر تنقید کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پریم چند ایک اچھے ناول نگار نہیں تھے۔ ان کی کہانیوں میں وہ بات نظر نہیں آتی جوان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اردو کے اہم ترین ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ اصغر علی انجینیر نے (۱) پریم چند کی سیاسی زندگی (۲) پریم چند حیات اور فن (۳) پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، جیسے مضامین میں یہ بحث چھیڑا ہے کہ جمالیاتی اعتبار سے پریم چند کا یہ فنی موڑ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ابتدا میں داستانوی انداز میں کہانی لکھی۔ لیکن بہت جلد اس سے انحراف کیا اور حقیقت نگاری کو اپنالیا۔ شمیم نکہت نے اپنے مضمون ''پریم چند کی تخلیقات میں عورت کا مقام' میں پریم چند کے نسوانی کردار کے حوالے سے عورت کے مقام و مرتبہ پر بحث کی ہے۔ ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار'' ڈاکٹر شمیم نکہت کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں پریم چند کے عورتوں کے تعلق سے مثبت نظریات و خیالات کو انہوں نے بخوبی پیش کیا ہے۔ انھوں نے نسوانی کردار کو نسوانی زاویہ نظر سے جانچا اور پرکھا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شمیم نکہت کا یہ کارنامہ پریم چند کے حوالے سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

پریم چند کے سوانحی کوائف کی معلومات شریمتی شیورانی دیوی نے اپنی کتاب ''پریم چند گھر میں'' کے ذریعہ اردو ادب تک پہنچائی۔ شیورانی نے مکالماتی تحریر اپنا کر پریم چند شخصیت کے کئی مخفی گوشوں کو آشکار کیا۔ شیورانی دیوی نے پریم چند کی شخصیت کے پہلوؤں کی بازیافت کی۔ اور بہت سے نازک، لطیف حساس پہلوؤں کو اس فنکاری سے پیش کیا ہے کہ ان کی ذات اور فن کے مختلف شیڈ سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیورانی دیوی کا ایک قابل قدر تحریری کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پریم چند کے آخری ایام کا ذکر اپنے مضمون ''پریم چند اور مسز پریم چند'' میں کیا ہے۔ اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان آخری لمحات کی حفاظت ان کی شریک حیات ہی کرسکتی تھیں جوانہوں نے مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔

اس میں کوئی کلام کی بات نہیں کہ پریم چند کو مذکورہ ناقدین نے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات کو کئی زاویے اور نقطہ ہائے نظر سے جانچا پرکھا ہے۔ مختلف مفاہیم کی تلاش وجستجو ان ناقدین کے مطمح نظر رہی۔ اور ان کے عہد سے اب تک ان کے فن کی نئی نئی معنوی جہتیں تلاش کی جارہی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری رہنے کا متقاضی ہے۔

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

نمبر	مصنف	تصنیف	ناشر	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	ارتضیٰ کریم، پروفیسر	اردو فکشن کی تنقید	کتابی دنیا	نئی دہلی	1996
۲	ارتضیٰ کریم، پروفیسر	مابعد جدید اور پریم چند	کتابی دنیا	نئی دہلی	2014
۳	اشفاق محمد خاں، ڈاکٹر	نذیر احمد کے ناول، تنقید مطالعہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2000
۴	امرت رائے	قلم کا سپاہی	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1992
۵	ابوبکر عباد	فکشن کی تلاش میں	ندارد	نئی دہلی	2014
۶	اصغر علی انجینیر	پریم چند، حیات اور فن	ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ	نئی دہلی	1981
۷	اعجاز علی ارشد	نذیر احمد کی ناول نگاری	ندارد	پٹنہ	1984
۸	آفاق احمد	پریم چند شناسی	اردو اکادمی	بھوپال	1994
۹	آدم شیخ، ڈاکٹر	مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری	نسیم بک ڈپو	لکھنو	1958
۱۰	آل احمد سرور	فکر روشن	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1995
۱۱	آل احمد سرور	اردو فکشن	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	1973
۱۲	پریم گوپال متّل	پریم چند شناس: مدن گوپال	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	دریا گنج، نئی دہلی	2008
۱۳	جعفر رضا، ڈاکٹر	پریم چند: کہانی کا رہنما	شبستاں	شاہ گنج، الہ آباد	1969
۱۴	جعفر رضا، ڈاکٹر	پریم چند فن اور تعمیر فن	گریفک آفسیٹ ورکس	شاہ گنج، الہ آباد	1977
۱۵	خورشید احمد، پروفیسر	اردو افسانے پر مغربی اثرات	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	2002

۱۶	خالد حیدر	پریم چند کے افسانے ،حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1999
۱۷	سلیم اختر ڈاکٹر	داستان اور ناول کا تنقیدی مطالعہ	ایم ،ایم پبلی کیشنز،	نئی دہلی	2012
۱۸	سید محمد عصیم	پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ	اتر پردیش اردو اکیڈمی	لکھنو	1984
۱۹	سیما صغیر ڈاکٹر	ترقی پسند اردو۔ ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ	مسلم ایجوکیشنل پریس بنی اسرائیلان	علی گڑھ	2010
۲۰	سیما صغیر ڈاکٹر	چند اہم ادیبوں کی نگارشات کا تنقیدی مطالعہ	مسلم ایجوکیشنل پریس بنی اسرائیلان	علی گڑھ	2012
۲۱	سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	ادارۂ فروغ اردو	لکھنو	1961
۲۲	شیورانی دیوی	پریم چند: گھر میں	انجمن ترقی اردو ہند	دہلی	2007
۲۳	شمس الرحمٰن فاروقی	افسانے کی حمایت میں	مکتبہ جامعہ	،نئی دہلی	2006
۲۴	شکیل الرحمٰن	فکشن کے فنکار پریم چند	نرالی دنیا پبلیکیشنز	دریا گنج ،نئی دہلی	2009
۲۵	شریف احمد ،ڈاکٹر	عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن	گوہر پبلی کیشنز	دہلی	1989
۲۶	صغیر افراہیم ،پروفیسر	اردو فکشن۔تنقید اور تجزیہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2003
۲۷	صغیر افراہیم ،پروفیسر	پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ	براؤن بک پبلی کیشنز	،نئی دہلی	2016
۲۸	صغیر افراہیم ،پروفیسر	پریم چند۔ایک نقیب	مسلم ایجوکیشنل پریس	علیگڑھ	1999
۲۹	صغیر افراہیم ،پروفیسر	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	ایم اے آفسٹ	،نئی دہلی	2009

۳۰	صغیر افراہیم، پروفیسر	افسانوی ادب کی نئی قرات	مسلم ایجوکیشنل پریس بنی اسرائیلان	علی گڑھ	2011
۳۱	طارق چھتاری، پروفیسر	جدید افسانہ اردو ہندی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	1992
۳۲	علی احمد فاطمی، پروفیسر	پریم چند نئے تناظر میں	تخلیق کار پبلشرز	دریا گنج، نئی دہلی	2006
۳۳	علی احمد فاطمی، پروفیسر	عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار	قومی کونسل	نئی دہلی	2007
۳۴	علی احمد فاطمی	انتخاب مضامین عبدالحلیم شرر	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنو	1990
۳۵	عظیم الشان صدیقی	اردو افسانہ فکری وفنی مباحث	ایجوکیشنل بک ہاؤس	نئی دہلی	2010
۳۶	عظیم الشان صدیقی	افسانوی ادب تحقیق وتجزیہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	دہلی	1983
۳۷	عبدالسلام پروفیسر	پریم چند سماجی اور سیاسی ناول	اعجاز پبلشنگ ہاؤس	ریا گنج نئی دہلی	1985
۳۸	عتیق احمد	مضامین پریم چند	انجمن ترقی اردو	کراچی پاکستان	1981
۳۹	عبدالقادر سروری	دنیائے افسانہ	مکتبہ ابراہمیہ	حیدرآباد دکن	1935
۴۰	قمر رئیس، پروفیسر	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار	ایجوکیشنل ہاؤس	نئی دہلی	2012
۴۱	قمر رئیس، پروفیسر	پریم چند فکر وفن	پبلیکیشنز ڈویزن پٹیالہ ہاؤس	نئی دہلی	1980
۴۲	قمر رئیس، ڈاکٹر	مضامین پریم چند	یونیورسٹی پبلشر، مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	1960
۴۳	قمر رئیس، پروفیسر	منشی پریم چند شخصیت اور کار نامے	مکتبہ عالیہ	رامپور	1962
۴۴	قمر رئیس، پروفیسر	تعبیر وتحلیل	ایجوکیشنل ہاؤس	دہلی	1996
۴۵	قمر رئیس، ڈاکٹر	پریم چند کے نمائندہ افسانے	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1986
۴۶	قمر رئیس، ڈاکٹر	تلاش وتوازن	ادارۂ خرام پبلیکیشنز	دہلی	1968

۴۷	قمر رئیس، ڈاکٹر	اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب	ادارۂ نیا سفر	دہلی	2004
۴۸	گوپی چند نارنگ پروفیسر	نیا اردو افسانہ تجزیہ ومباحث	اردو اکیڈمی	دہلی	1988
۴۹	گوپی چند نارنگ پروفیسر	اردو افسانہ روایت اور مسائل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	1981
۵۰	گوپی چند نارنگ	ساختیات پس ساختیات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2007
۵۱	میرامن	باغ و بہار	انجمن ترقی اردو ہند	نئی دہلی	1992
۵۲	ملاّ وجہی	سب رس	ایجوکیشنل ہاؤس	علی گڑھ	2011
۵۳	مرزا محمد ہادی رسوا	مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات	ادارۂ تصنیف	علی گڑھ	1961
۵۴	مرزا محمد ہادی رسوا	شریف زادہ	اشرفی بکڈپو	لکھنو	ندارد
۵۵	مرزا محمد ہادی رسوا	امراؤ جان ادا	مکتبہ جامعہ	نئی دہلی	1979
۵۶	مرزا ہادی رسوا	ذات شریف	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2011
۵۷	منشی پریم چند	واردات	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	1955
۵۸	مدن گوپال	کلیات پریم چند	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2003
۵۹	محمد ظفرالدین	پروفیسر قمر رئیس آثار واحوال	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	حیدرآباد	2010
۶۰	مانک ٹالا	پریم چند اور تصنیف پریم کچھ نئے تحقیقی گوشے	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	1985
۶۱	مانک ٹالا	پریم چند حیات نو	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	1993
۶۲	مانک ٹالا	پریم چند کچھ نئے مباحث	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	1988

۶۳	مانک ٹالا	آخری نغمہ	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	2010
۶۴	مانک ٹالا	پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	2001
۶۵	مدن گوپال	قلم کا مزدور	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	2011
۶۶	مدن گوپال	پریم چند کی آپ بیتی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	2015
۶۷	منشی پریم چند	میرے بہترین افسانے	کتاب منزل کشمیری بازار	لاہور	ندارد
۶۸	نذیر احمد	توبتہ النصوح	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	1976
۶۹	نذیر احمد	بنات النعش	آمین الدولہ بکڈ پو	لکھنو	1972
۷۰	نذیر احمد	مرآتہ العروس	تیج کمار پرائیویٹ لمٹیڈ	لکھنو	1975
۷۱	وہاب اشرفی	اردو فکشن اور تیسری آنکھ	ایجوکیشنل ہاؤس	دہلی	2005
۷۲	وہاب اشرفی، پروفیسر	آگہی کا منظر نامہ	ایجوکیشنل ہاؤس	دہلی	2012
۷۳	وہاب اشرفی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل ہاؤس	نئی دہلی	1990
۷۴	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل ہاؤس	علی گڑھ	2015
۷۵	ہنس راج رہبر	پریم چند	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	نئی دہلی	1980
۷۶	ہمایوں اشرف	فکشن کی بازیافت	ایجوکشنل بک ہاؤس	نئی دہلی	2013
۷۷	یوسف سرمست	پریم چند کی ناول نگاری	الیاس ٹریڈرس بکسیلرز	حیدرآباد	1976
۷۸	یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بیورو	نئی دہلی	1995

رسائل و جرائد

۱۔ ایوان اردو، ماہنامہ، دہلی، پریم چند نمبر، شمارہ ۱۰، جلد ۱۹، فروری 2006ء

۲۔ ایوان اردو، ماہنامہ، دہلی، مدیر مرغوب حیدر عابدی، شمارہ ۹، جلد ۱۸، جنوری 2005ء

۳۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، پریم چند نمبر، مدیر شہباز حسین، جلد ۳۹، شمارہ ۱، اگست 1980ء

۴۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، مدیر جوش ملیح آبادی، مارچ 1955ء

۵۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، مدیر جوش ملیح آبادی، اکتوبر، 1954ء

۶۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۴، جلد ۱، جون 1945ء

۷۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۵، جلد ۱، اگست 1943

۸۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۷، جلد ۴، یکم ستمبر، 1945ء

۹۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، مدیر عابد کرہانی، شمارہ ۱۲، جلد ۶۳، جولائی 2005ء

۱۰۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، ۱۵ دسمبر، 1946ء

۱۱۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، مدیر مظفر شاہ، شمارہ ۸، جلد ۱۸، مارچ، 1960ء

۱۲۔ آجکل ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۱۰، جلد ۴۸، مئی، 1990ء

۱۳۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۶، جلد ۶، یکم اگست، 1947ء

۱۴۔ آجکل، ماہنامہ، دہلی، شمارہ ۹، جلد ۸، جنوری، 1950ء

۱۵۔ پکڈنڈی، ماہنامہ، امرت سر، مدیر امریک آنند، سجاد حیدر یلدرم نمبر، جلد ۹، شمارہ ۵، نومبر، 1961ء

۱۶۔ تحریر نو، ماہنامہ، ممبئی، مدیر ظہیر انصاری، اکتوبر، 1914ء

۱۷۔ جامعہ، ماہنامہ، نئی دہلی، پریم چند نمبر، مدیر صغرا مہدی، جولائی، اگست، 1986ء
۱۸۔ دلگداز، ماہنامہ لکھنو، مدیر عبدالحلیم شرر، شمارہ ۷، جلد ۱۲، جولائی 1910ء
۱۹۔ ذہن جدید، سہ ماہی، مدیر جمشید جہاں، شمارہ ۸، جلد ۲، جون تا اگست، 1992ء
۲۰۔ ذہن جدید، سہ ماہی، مدیر جمشید جہاں، شمارہ ۳۷، جلد ۱۴، ستمبر تا نومبر، 2003ء
۲۱۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، پریم چند نمبر، مدیر و مرتبہ دیا نرائن نگم، دہلی جولائی، 2000ء
۲۲۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، مرتبہ دیا نرائن نگم، شمارہ ۴، جلد ۶۰ مئی، 1933ء
۲۳۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، مرتبہ دیا نارائن نگم، شمارہ ۴، جلد ۶۷، اکتوبر، 1936ء
۲۴۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، مرتبہ دیا نرائن نگم، مدیر رگھوپتی سہائے فراق، شمارہ ۲، جلد ۶۸، فروری 1937ء
۲۵۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، مرتبہ، دیا نارائن نگم، نومبر، 1914ء
۲۶۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، جولائی 1936ء
۲۷۔ زمانہ، ماہنامہ، کانپور، شمارہ ۲، جلد ۶، فروری، 1906ء
۲۸۔ سہیل، ماہنامہ، گیا، شمارہ ۶، جلد ۵۲، قسط ششم
۲۹۔ سہیل، ماہنامہ، گیا، شمارہ ۵، جلد ۵۲، جنوری، فروری، 1980ء
۳۰۔ سہیل، ماہنامہ، گیا، شمارہ ۱، جلد ۵۲، قسط نمبر ۱۔
۳۱۔ سہیل، ماہنامہ، گیا، مدیر مسعود منظر، شمارہ ۱۲، جلد ۵۲۔
۳۲۔ فروغ اردو، ماہنامہ لکھنو، منشی پریم چند نمبر، مرتب سعادت علی صدیقی، مدیر محمد حسین شمسی، اپریل، مئی، جون، جولائی، 1980ء
۳۳۔ فکر و نظر، سہ ماہی، مدیر شہریار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ خصوصی شمارہ، جون 1994ء
۳۴۔ کتاب، ماہنامہ، لکھنو، مدیر شمیم الدین، اکتوبر 1968ء

۳۵ کتاب، ماہنامہ، لکھنو، مدیر سید جمیل احمد، دسمبر، 1967

۳۶ کتاب نما، ماہنامہ، نئی دہلی، مرتبہ عبدالقوی دسنوی، مدیر ولی شاہجہاں پوری، جون، 1981ء

۳۷ نگار، ماہنامہ، پاکستان، نیاز نمبر، حصہ اول، 1963ء

۳۸ نگار، ماہنامہ، لکھنؤ، مدیر نیاز فتح پوری دسمبر 1942ء

۳۹ نگار، ماہنامہ، لکھنؤ، مارچ 1929ء

۴۰ نگار، ماہنامہ، مدیر نیاز فتحپوری، شمارہ ۵، جلد ۶۵ مئی، 1934ء

۴۱ نیادور، ماہنامہ، لکھنو، مدیر صباح الدین عمر، شمارہ ۱، جلد ۱۷، اپریل 1962ء

۴۲ نگار، سالنامہ، پاکستان، 1963ء